

چلتے چلتے

(منتخب کالموں کا مجموعہ)

(جلد: اوّل)

شہزادہ بسملؔ

جو کہی گئی نہ مجھ سے وہ زمانہ کہہ رہا ہے
کہ فسانہ بن گئی ہے میری بات چلتے چلتے



ہم بہت دور نکل آئے ہیں چلتے چلتے
اب ٹھہر جائیں کہیں شام کے ڈھلتے ڈھلتے

چلتے چلتے

(منتخب کالموں کا مجموعہ)

(جلد: اوّل)

شہزادہ بسملؔ

تبسم پبلی کیشنز

A-1-115 محلّہ ابراہیم بمنہ سرینگر

رابطہ : 9419475995

کتاب کا نام	چلتے چلتے
نوعیت	(منتخب کالموں کا مجموعہ)
مصنّف	شہزادہ بسملؔ (9419475995)
پہلا ایڈیشن	2019ء
کمپوزنگ	TFC سنٹر سرینگر 9419525103
سائز	23x36/16
صفحات	512
تعدادِ اشاعت	500
قیمت	450/روپے
طباعت	الحیات پرنٹو گرافرس 9419403126

Chaltay Chaltay
(A Collection of Selected Columns)
by: Shahzada Bismil

تبسم پبلی کیشنز

A-1-115 محلہ ابراہیم بمنہ سرینگر

رابطہ : **9419475995**

فہرست

اِنتساب

اپنے اُن آنسوؤں کے نام
جن کو بہاتے ہوئے مجھے کسی نے نہیں دیکھا



کچھ سوچ کر ہی غم سے نوازا گیا ہوں میں
میرے لیے یہ کتنی مسرت کی بات ہے
پیتا ہے کوئی اشک بہاتا ہے کوئی اشک
یہ اپنے اپنے ظرفِ محبت کی بات ہے

(نسیم شاہ جہاں آبادی)



بسم اللہ

شہزادہ بسملؔ کی کالم نگاری

ہمالہ کے دامن میں اُبلتے ہوئے چشموں ، آبشاروں ، لالہ زاروں ، سرسبز شاداب کھیتوں اور زعفران کے ہوش ربا اور پُر کشش کیسر زاروں ، قدرتی مناظر سے بھرپور خطۂ کشمیر، جس کی سرحدیں ہندوستان ، پاکستان ، روس ، چین اور افغانستان کے ساتھ ملتی ہیں ، عہدِ قدیم سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ سرزمین فطری اعتبار و استعداد سے نہایت ذرخیز ہے۔ اس سرزمین نے ایسے ادباء و شعراء، علماء و فُضلاء کو جنم دیا ہے جنہوں نے تعلیم ، سائنس ، سیاست ، سماجیات، اقتصادیات اور شعروادب جیسے شعبوں کی تاریخ میں ان گنت نقوش چھوڑے ہیں۔ اس فہرست میں جناب شہزادہ بسمل کا نام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔

ریاست کے معاصر ادبی منظرنامے پر شہزادہ بسمل بحیثیت کالم نویس مشہور و معروف ہیں۔ شہزادہ بسمل کا اصلی نام غلام قادر خان ہے۔ اُن کا تعلق سرینگر کے بربر شاہ علاقے سے تھا، مگر اُن کی موجودہ سکونت اب بمنہ سرینگر میں ہے۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور کئی عہدوں پر فائز رہ کر جوائنٹ سیکریٹری ایڈمنسٹریشن بورڈ آف اسکول ایجوکیشن کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ کلرکی قلم کے ساتھ ساتھ ادبی قلم بھی رواں دواں رہا۔ انہوں نے اپنی کالم نگاری کا آغاز سترہ سال کی عمر میں کیا، جب اُن کا پہلا کالم ”آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب وعجم کے حالات‘ عنوان کے تحت ’نیا سنسار“ کشمیر عید نمبر

مارچ ۱۹۶۱ء کے شمارے میں شایع ہوا۔ اُس کے بعد انہوں نے چند کالم ہفتہ وار ''مسلم'' کے لیے لکھے اور بعد ازاں اُن کے کالم مختلف جرائد اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ سن ۱۹۷۴ء میں ''مسلم'' کے لیے باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا، جو سلسلہ حادثاتی وقفوں کے ساتھ سن ۲۰۱۴ء تک جاری رہا، مگر اِس دوران پندرہ روزہ 'احتساب' کے لیے نو سال تک اور ساتھ میں ماہنامہ **الحیات** کے لیے بارہ سال تک اور کبھی کبھی 'آفتاب'، 'آفاق'، 'عقاب' اور دوسرے روزناموں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے اور اب سر دست اوّل جولائی ۲۰۰۹ء سے روزنامہ 'کشمیر عظمیٰ' کے لیے ہر بدھوار کو ''چلتے چلتے'' عنوان کے تحت کالم لکھتے ہیں۔

شہزادہ بسملؔ ریاست کے معتبر اور معروف کالم نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ادبی، سماجی اور سیاسی منظرنامے پر اپنے گہرے مشاہدے اور منفرد اسلوبِ بیان کے بل بوتے پر وہ زندگی آمیز تخلیقات پیش کرنے والوں میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست و ریخت، انسان سے انسانیت کا رشتہ، سیاسی، سماجی اور مذہبی کشمکش کو بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں۔ نیز اپنے کالموں کے عنوان عام زندگی سے چُنتے ہیں اور آئے دن کے واقعات کو تخلیقی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس وقت تک بسمل صاحب کی پانچ کتابیں شایع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں، اگرچہ اُن میں سے کوئی کتاب کالموں پر مشتمل نہیں ہے۔

شہزادہ بسمل نے سماج کا مطالعہ ایک نبض شناس کی نظر سے کیا ہے۔ انہوں نے اپنے کالموں کو نئی طرح دے کر ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے، جس کی روایت بہت کم رہی ہے۔ یہ متنوع موضوعات انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ چونکہ اُن کے پاس زندگی کے عملی تجربات اور مشاہدات کی کوئی کمی نہیں ہے، اس لیے اُن کی کالم نویسی میں بھی ایک خاص توانائی نظر آتی ہے۔ قاری کو محسوس ہوتا

ہے کہ وہ کوئی خاص بات نہیں بلکہ اُسی کے تجربے کی بات کر رہے ہیں۔ شہزادہ بسمل انسان کو اُس کی ساری خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ برتتے اور دیکھتے ہیں۔ اُن کے پاس نہ تو رنگین شیشوں کی عینک ہے اور نہ بلندی کا مصنوعی زینہ۔ آپ انسانوں میں گھل مل کر اُن کے دکھ درد کا ادراک کرتے ہیں اور اُس کو طنز و مزاح کی چاشنی میں ڈبو کر اخبار کے صفحے پر پھیلا دیتے ہیں۔

شہزادہ بسملؔ کے کالموں میں ایک خاص بات، جو قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہے، وہ اُن کی المیاتی (Tragedic) کیفیات ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ کیفیت سیاست کی دین ہو، جو موسم کی طرح کبھی گرم اور کبھی سرد ہوتی ہے، کبھی برف کبھی باراں۔ خوشگوار موسم کا گمان ہونے لگتا ہے تو بجلیاں گرتی ہیں۔ غرض کشمیر عرصہ دراز سے مختلف حالات و واقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ بقول شہزادہ بسمل: ''وہ آج بھی ظلم و بربریت کی وہ داستانِ خونچکان سُنانے کے لیے بے تاب ہیں، مگر لکھ نہیں پا رہے ہیں، کیونکہ ہمارے کئی کم سِن معصوم بچے اور بچیاں، ہمارے جگر کے ٹکڑے دست تطاول کی وجہ سے اپنی بصارت کھو چکے ہیں۔ جنگلی اور وحشی درندوں پر استعمال کیا جانے والا اسلحہ بے گناہ بچوں اور بچیوں پر استعمال کیا گیا۔ جب میرا اور مجموعی طور پر میرے وطن کا مستقبل ہی بے بصارت اور اندھا ہو گیا تو میں کیا لکھوں، کیسے لکھوں، لکھ ہی نہیں پا رہا ہوں'' ....(کالم میں کیا لکھوں)۔ بسمل صاحب میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بات میں سے بات پیدا کر کے قاری کو مسرت و انبساط فراہم کرنے کے علاوہ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

شہزادہ بسملؔ کے چند کالم ایسے ہیں، جن میں زندگی کی معنویت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری کے کلیجے پر چوٹ پڑتی ہے۔ وہ لگ بھگ دو ہزار کالم لکھ چکے ہیں، نیز آج بھی اُن کا یہ سفر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ 'نور کی بے قدری،

'لالہ صحرا'، 'گولر کا پھول'، 'سایونارا'، 'لٹیرا'، 'السلام علیکم'، 'یہی زندگی'، 'نندا دیپ'، 'پتھر بولتے ہیں'، 'بحری قذاق'، 'گلاب آنگن میں'، 'بُجھ گئے جلتے چراغ'، 'دور کی سوغات'، 'دودھ کا بٹوارہ' جیسے مشہور کالم زندگی کی روشن حقیقتوں اور تلخ تجربوں سے بھر پور ہیں۔

بسمل صاحب کے کالموں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے پہلے کالم نگار قاری کو لطیف اور لطیف تر رومانی ماحول اور فضا میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے پھر اُس کے بعد زندگی کی تلخ سچائیوں، انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو ذہن پر نقش کرتا ہے۔ فنی اعتبار سے شہزادہ بسمل کے کالم ایک منجھے ہوئے لکھاری کے قلم اور فنی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اُن کا ایک مخصوص ڈکشن ہے، جس پر انہیں ماہرانہ قدرت حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر جوہر قدوسی صاحب: 'خان صاحب قلم کے دھنی ہیں، وہ کثیر نویس ہیں اور زود نویس بھی۔ وہ بیک وقت کئی اصنافِ ادب کی زلفوں کے اسیر ہیں۔ انشائیہ نگاری کو انہوں نے ایک نئی طرح دی ہے۔ دسیوں انشائیے، درجنوں افسانے، بیسیوں فکاہیے اور متعدد مقالے لکھنے کے بعد وہ اب میدانِ تحقیق میں اُتر گئے ہیں'۔ (۲۰/اگست ۱۹۹۹ء)

شہزادہ بسملؔ صاحب جتنے اچھے کالم نگار ہیں، اُس سے کئی درجہ بلند انسان ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی کالم نگاری غور وفکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ اُن کے کالموں میں شدتِ احساس پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اپنے موضوعات اور اسالیب کی رنگارنگی سے دبستانِ جموں وکشمیر میں شہزادہ بسملؔ اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔

سُہیل سالم

رعناواری سرینگر

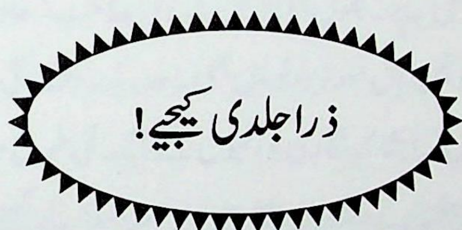
salimsuhail3@gmail.com

۳/اگست ۲۰۱۹ء

ذرا جلدی کیجیے!

میری کتاب میں وہ مضامین چھپ گئے
راحتؔ بیان جو نہ ہوئے تھے خطیب سے

(رؤف راحتؔ)


ذرا جلدی کیجیے!

ہم قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں ، بار بار کرتے ہیں ، ہمیشہ کرتے رہتے ہیں ۔گھر میں ، گھر سے باہر ، مسجد میں ، سفر میں ، حضر میں ، ماہِ صیام میں ، ایامِ حج وعمرہ میں ۔قرآنِ کریم کی آیاتِ بیّنات میں تلاوت کے دوران ہم کئی بار ، بار بار بلکہ متعدد بار دو ہم وزن جڑواں الفاظ پاتے ہیں یعنی ''صلواۃ وزکوٰۃ'' ہم ماشا اللہ دونوں کے معنی خوب سمجھتے ہیں مگر عملاً پہلے جز یعنی صلواۃ کو ہم با قاعدہ عملاتے ہیں ۔نمازِ پنجگانہ کے علاوہ ہم نوافل سے بھی سرفراز ہوتے ہیں بلکہ کئی حضرات صلواۃِ تسبیح اور تہجد سے بھی بہرہ ور ہوتے رہتے ہیں ۔اس طرح سے تو ہم پہلے جز کو خوب نبھاتے ہیں ، اُس کا اہتمام کرتے ہیں ، اوروں کو بھی شامل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں مگر افسوس ______ افسوس اس اصطلاحِ مبارک کا جو دوسرا جُز ہے وہ بھی اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا کہ پہلا مگر اُس طرف ہمارا دھیان کم ہی جاتا ہے ۔ جان بوجھ کر اُس طرف بے توجہی کا مظاہرہ کرتے ہیں ، ایسا بھی صحیح ہے ۔اتنا تو ہم جانتے ہی ہیں کہ پہلے جز کی قبولیت دوسرے جز کے ساتھ مشروط ہے ۔ یہ درست ہے کہ اس حکم کا اطلاق ''صاحبِ نصاب'' حضرات پر ہی ہے مگر انصاف کرکے بتایئے کہ صاحبِ نصاب کے زمرے میں کتنے آسکتے ہیں یا کتنے آتے ہیں ۔ وادی میں ایسا کون سا شخص ہے جس کو اپنا گھر نہیں ہے جب کہ جتنی جموں وکشمیر ریاست کی مجموعی آبادی ہے اتنے لوگ کولکتہ میں رات کو فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں ۔ یہاں نادار لوگوں کو سرکار کی طرف سے کماحقہ مدد ملتی ہے ۔

بیواؤں کو پیسہ ملتا ہے ، فریڈم فائیٹر فنڈ ملتا ہے ، بنکوں سے لون اور قرضے ملتے ہیں ، پلاٹ اور زمینیں ملتی ہیں ۔ فصلوں کے نقصان ہونے پر ایڈ ملتی ہے ۔ابھی ماضی قریب میں زعفران کے لیے خسارے پر معاوضہ ملا ۔ مرکزی حکومت کی کئی

اسکیموں کے تحت لاکھوں فیضیاب ہورہے ہیں۔ پھلوں سے ہر سال اربوں روپیہ وادی میں وارد ہوجاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک اور مہربانی حکومت کی جانب سے ہوئی ہے۔ جموں وکشمیر بینک کو کسان کریڈیٹ کارڈ سکیم متعارف کرنے کا حکم ہوا ہے۔ اب ہر ایک کسان کو زمین کے مطابق ایک سے تین لاکھ روپے کی معاونت بہت آسان شرطوں پر ملے گی۔ یہاں حقیقی معنوں میں غریب نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہاں بھکاریوں کی وراثت جب تقسیم ہوتی ہے تو روپے پیسے کی تقسیم گِن کر نہیں بلکہ بیلچوں سے کی جاتی ہے۔ چلیے مان لیتے ہیں کہ یہ سب کھڑاگ ہی ہے ایک مفروضہ ہے۔ یہاں سچ مچ ہی ساٹھ فیصد لوگ غریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ پھر ایک دوسرا رُخ بھی دیکھیے، اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ کیا آپ نے کشمیر کے تمام چھوٹے بڑے قصبوں میں شاپنگ مال اور کاروباری سینٹر دیکھے ہیں۔ بھرے پڑے مصروف ترین بازار دیکھے ہیں۔ سال میں دس بار باہر کے لوگ یہاں آکر مصنوعی جیولری کی نمائش لگاتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی اُن کی سیل دیکھی کبھی اقبال مارکیٹ، مہاراجہ بازار اور گونی کھن جیسے مصروف ترین بازار دیکھے ہیں۔ ٹوٹو گراؤنڈ سے بٹہ مالو تک خریداروں کا اژدہام دیکھا ہے۔ بیسوں شاپنگ مال دیکھے ہیں۔ آپ کو لباس کے وہ آئیٹم، کاسمٹکس کی منفرد پریوڈیکٹس اور ٹوائیلٹ گڈس کی وہ چیزیں ہندوستان کے میٹروپولیٹن شہروں میں نہیں ملیں گی جو وادی میں ملتی ہیں، کیونکہ لوگوں میں قوتِ خرید ہے۔ بقولِ ریٹائرڈ جسٹس بشیر احمد کرمانی وادی بھر میں سات کروڑ روپیہ یومیہ فضول خرچی میں اڑائے جاتے ہیں۔ پچیس ہزار بوتلیں شراب کی صرف شہرِ سرینگر میں فروخت ہوتی ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ روپیہ کا پیٹرول یومیہ گاڑیوں میں بھرا جاتا ہے، ایک کروڑ

روپیہ کے موبائیل فون بل ادا کیے جاتے ہیں، دو کروڑ روپے کی شراب اور کروڑ روپیہ کی چرس اور گانجا کی ڈیل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق (آفتاب ۱۵رمئی ۲۰۱۱ء) کشمیری روزانہ دو کروڑ روپیہ سگریٹ، چرس اور شراب پر خرچ کرتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر لٹاتے ہیں۔ پچیس ہزار خواتین اور پونے دو لاکھ مرد اس (ڈرگ) کے کاروبار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دراصل یہاں کے بہت کم لوگ غریب ہیں جب کہ زیادہ کاہل، سُست اور تن آساں ہیں۔ یورپین مورخوں نے کشمیریوں کو سوپائن (Supine) لکھا ہے یعنی تن آسان۔ سُست اور کسل مند۔ چونکہ بھیک مانگنا ایک آسان ذریعہ آمدن ہے اس لیے تین تین چار چار سالہ بچوں اور بچیوں کو پروفیشنل بھیک منگے اس ٹریڈ میں جھونکتے ہیں اور اوائل عمر سے ہی اُن کو دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا سکھایا جاتا ہے۔ مگر ہاتھ پیر مارنے اور قوتِ بازو سے حاصل کی ہوئی لذیز روٹی سے انہیں بے بہرہ کر دیا جاتا ہے۔

چلیے مان لیتے ہیں کہ سب نہیں کچھ حضرات ہی ''صاحبِ نصاب'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ مگر کیا وہ اس فرضِ عین پر لبیک کہتے ہیں۔ کیا اس بات سے کوئی انکار کرسکتا ہے کہ یہاں سب کے پاس حتیٰ کہ حقیر فقیر تک کے پاس بھی کچھ نہ کچھ سونے کے زیورات موجود ہیں۔ سونا جتنا مہنگا ہوگیا، لوگ لیتے رہے اور لیتے ہیں، خریدتے ہیں۔ اُردو زبان کا جب انحطاط شروع ہوا، ہزاروں جرائد و رسائل کی اشاعت بند ہوگئی۔ ورلڈ فیم جرائد جیسے ہما، شبستان، شمع، کھلونا، بانو وغیرہ وغیرہ قصۂ پارینہ بن گئے۔ مگر کیا صرافہ بازار کی ایک بھی دوکان بند ہوگئی، نہیں نا۔ وادیٔ کشمیر میں اس وقت بھی لوگوں کے گھروں میں، بینک لاکروں میں اور نجی کافروں (Coffers) میں کئی کوینٹل سونا زیورات اور گینوں کی شکل میں موجود

ہیں۔گینی (پونڈ) کا رواج صرف کشمیر میں ہی ہے باقی جگہ اس کو سٹاک نہیں کر لیتے ہیں۔اس سونے میں سے کچھ سونا بے شک نصاب میں نہیں آتا ہوگا مگر اکثر و بیشتر پر نصاب لگتا ہے۔اگر اُس میں سے بھی صرف آدھی پھ پر ہی زکوٰۃ ادا کی جائے تو یقین مانیے کہ بیسویں یتیم خانے اور راحت سینٹر کھولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔میرج بیورو اور میرج کونسلنگ سینٹر قائم نہیں کرنا پڑیں گے۔گاڑیاں دوڑا کر اور گرافون ریکارڈ یا سی ڈی بجا بجا کر گھر گھر جا کر پیسہ جمع نہیں کرنا پڑے گا۔اگر یہ ڈیو (Due) پیسہ اور قابل ادا اربوں روپیہ لاکروں اور بینکوں سے باہر آ جائے تو وادی سچ مچ جنتِ بے نظیر کا نقشہ پیش کرے گی اور کچھ عرصہ بعد آپ کو کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملے گا کیونکہ اسلام کا نظامِ زکوٰۃ ایسا ایک فلالیس (Flawless) اور شاندار نظام ہے جس پر دنیا کے عظیم مفکر، دانشور اور قائد انگشت بدنداں ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ معاشی اور معیشتی پائیداری اور مفلوک الحال سے چھٹکارا پانے میں زکوٰۃ سے بہتر نظام کوئی ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

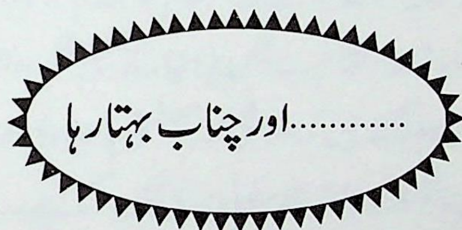
کیا آپ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ کی عدم ادائیگی میں آپ کی دیگر عبادات نماز، روزہ، حج وعمرہ، صدقات، اعانت، دلبری و دلجوئی، سفارش، خدمت خلق اور مساجد کی تعمیر وغیرہ کہیں آگے بڑھتی ہیں۔ ہرگز نہیں! وہ لٹکتی رہتی ہیں کیونکہ مانع زکوٰۃ کافر اور منکرِ زکوٰۃ مشرک کے زمرے میں آتا ہے۔ ارے --------- ارے------ رُکیے ----- چونکیے مت -------- شریعت اسلامی کے مطابق منکرِ زکوٰۃ واجب قتل ہے۔کیا سمجھے؟ ہوں! ہوں! ذرا جلدی کیجیے -----

درکارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

☆☆☆

............اور چناب بہتا رہا

کوئی منزل نہ مسافر نہ کہیں گردِ سفر
میری قسمت نے مجھے لا کے کدھر ڈال دیا
(ظفر اقبال ظفرؔ)


اور چناب بہتا رہا............

برصغیر کے بٹوارے یعنی سن ۱۹۴۷ء کے حوالے سے غیر مسلم یورپین مصنفین نے اپنی نگارشات میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ قبائلی مداخلت دراصل، ہندوؤں، سکھوں اور ڈوگروں کے مسلمانوں پر ظلم وتشدد کے خلاف ایک فطری رد عمل کا نتیجہ تھی اور حکومتِ پاکستان اگر اُس وقت قبائلوں کو روکنے کی کوشش کرتی تو قبائلی خود حکومتِ پاکستان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے۔ لاکھوں مسلمانوں کے قتل عام، سینکڑوں مسلمانوں کو زندہ جلانے اور بے شمار مسلمان عورتوں کی آبروریزی ہونے کے بعد اُن کے غُصے کو قابو میں رکھنا دُشوار تھا۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز نے قبائلوں کے حملے کے بارے میں جو بیان دیا ہے وہ ''نصرت'' لاہور ۱۹۶۰ء کے ''کشمیر نمبر'' میں اس طرح ہے:-

''سب جانتے ہیں کہ ہندوستان کو جون ۱۹۴۷ء میں لارڈ مونٹ بیٹن کی تجویز کے مطابق مذہبی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ اِس تجویز میں کشمیر کا مستقبل بالکل واضح تھا۔ اِس لیے پاکستان کے ساتھ الحاق کے سِوا اور کوئی چارہ نہ تھا لیکن فوراً کانگریس نیتاؤں نے نتائج سے آنکھیں بند کر کے مسلم اکثریت کی خواہش کے خلاف ہند یونین کے ساتھ ناطہ جوڑنے کے لیے اُکسانا شروع کیا۔ اُس سال مہاتما گاندھی اگست کے پہلے ہفتے میں کشمیر آئے اور مہاراجہ کے ساتھ بات پکی کر گئے۔ جیل میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ بھی بات چیت ہوئی۔ وہ بھی اُس شرانگیز اور کشمیری عوام کے لیے تباہ کن منصوبہ کو مان گئے۔ شیخ محمد عبداللہ کا فی لمبی معیاد کے لیے سزایافتہ قیدی ہونے کے باوجود اچانک سزائیں معاف کر کے رہا کر دیے گئے لیکن مسلم کانفرنس کے

رہنما جو محض نظر بند تھے دانستہ طور پر آہنی سلاخوں کے پیچھے رہ گئے۔
پاکستان کے ساتھ الحاق کی حمایت کرنے والوں کا قافیہ تنگ کیا گیا۔
اُن میں سے بیشتر کو جلائے وطن کیا گیا۔صرف نیشنل کانفرنس کے لیڈر
مزے لوٹنے لگے۔ اِسی دوران پونچھ کے نہتے لوگوں پر ڈوگرہ فوج
نے گولیاں برسائیں اور کئی گاؤں جلا دیے۔ یہ سارا واقعہ اگست، ستمبر
اور اکتوبر میں پیش آیا۔مہاراجہ کو ساری صورتِ حال سے خبردار کیا گیا،
مگر بے سود ثابت ہوا۔۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قبائلی مجبور ہو کر اپنے کشمیری
مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے آ گئے یہ بالکل خستہ اور شکستہ حالت
میں تھے۔اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔اُن کو کیسے حملہ آور کہا جا سکتا ہے۔
ہندوستانی فوج نے غارت گری اور عورتوں کی آبروریزی کچھ کم نہیں
کی۔اُس کی تصدیق سردار بدھ سنگھ نے بھی کی۔اُن کا کہنا ہے کہ
جب میں جموں کے فوجی کیمپوں میں چودھری عباس خان (صدر مسلم
کانفرنس) کی اغوا شدہ بیٹی کو ڈھونڈ رہا تھا تو جموں کے ایک کیمپ میں
مجھے شیخ محمد عبداللہ نے جانے سے منع کیا، لیکن میں اُن کے منع کے
باوجود بھی اُس کیمپ کے اندر گیا تو وہاں میں نے درجنوں جوان
لڑکیاں مادر زاد ننگی دیکھیں۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ میں فوراً
واپس آیا اور یہ بھی بھول گیا کہ میں اندر کیا دیکھنے گیا تھا۔"

ڈاکٹر کنزرو نے ہندوستان کی پارلیمنٹ میں اپنے ایک بیان میں بھارتی
فوجیوں کی طرف سے سول آبادی میں لوٹ مار اور زنا بالجبر کے واقعات سُنا کر
پارلیمنٹ کو دم بخود کر دیا۔مظفر آباد (موجودہ آزاد کشمیر) کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مہتہ
جنہیں قبائلی حملے میں جان سے مارا گیا تھا، اُن کی بیوی اپنی کتاب "کشمیر جل رہا

ہے''میں لکھتی ہیں: -

''میرے شوہر کو جب قبائلی حملہ آوروں نے گولی کا نشانہ بنایا تو ایک طرح سے ہمارا گھر اُجڑ گیا۔ ہم دیوانہ وار اِدھر اُدھر بھاگنے لگے اور جان بچانے کی کوشش میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں اپنی دو جوان بیٹیوں سے جُدا ہوگئی۔ کئی دنوں کے بعد گڈھی دوپٹہ میں جب قبائلی کیمپ میں میری جوان بیٹیاں مل گئیں تو میری جان میں جان آگئی اور یہ جان کر تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اتنے دنوں تک قبائلی کیمپ میں میری بیٹیاں عزت واحترام کے ساتھ محفوظ رہیں۔ ہمارے گھر کے اثاثہ کے ساتھ بھی کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی تھی۔''

۱۳ جولائی ۱۹۵۳ء کو مزار شہداء پر تقریر کے دوران شیخ صاحب نے فرمایا:

''قبائلوں کی لوٹ مار اور قتل وغارت کے جتنے بھی واقعات ہم اس سے قبل کہتے رہے ہیں اُن کی تحقیقات پر معلوم ہوا وہ غیر مصدقہ اور مبالغہ آمیز تھے۔''

کیوں نہیں ______ ایسا تو ہونا ہی تھا وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ ع

کی اُس نے میرے قتل کے بعد جفا سے توبہ

بہر حال اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ سن ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ ہری سنگھ قبائلوں کی آمد کی خبر سنتے ہی ۲۵ ر اکتوبر کو اپنے اہلِ خانہ، مصاحب، احباب اور اپنے خاص وزیروں اور امیروں کو لے کر سرینگر سے تمام زر و جواہر، خزانہ، سونے کے ظروف اور قیمتی اشیاء کے ساتھ بھاگ نکلا۔ یہ قیمتی اثاثہ کئی گاڑیوں میں لدوا کر اور خود اپنی رہنمائی میں وہ چپ چاپ اُودھم پور تک بڑھتا چلا گیا اور وہاں جا کر دم لیا۔ مہاراجہ کو مزاحمت کا ڈر اور جان کا خوف لاحق تھا۔ بھلا مزاحمت

کرنے کا کس میں یارا تھا۔ راج ڈوگروں کا اور حکومت کشمیری پنڈتوں کی تھی۔ رہا کشمیری مسلمان وہ صدیوں کا لٹا پٹا درماندہ تھا۔ جس کی مالی پوزیشن تھی نہ تعلیمی سند، نہ سماجی رتبہ تھا اور نہ ہی عزتِ نفس۔ بھلا وہ ہری سنگھ کو کیا روکتا کیا مزاحمت کرتا۔

مہاراجہ کا قافلہ جب اُودھم پور پہنچا تو مہارانی تارا دیوی نے ایک کھلی کار میں ایک مورتی کو گلے سے لگا کر بال کھولے اور واویلا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ہمیں لوٹا، ہمارا راج پاٹھ چھینا اور کشمیر سے بے دخل کر دیا۔ ہندو خاص کر وہ جو مسلمانوں سے خار کھائے بیٹھے تھے کیونکہ پاکستان دو قومی نظریے کے تحت وجود میں آ چکا تھا اور وہ متعصب دیوانے جن کو پنجاب، ہریانہ اور ہماچل سے خون بہانے کے لیے سرکار کی چھتر چھایا اور مرکزی حکومت کی آشیرواد سے منگوایا گیا تھا، مشتعل ہو کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہی دن میں لگ بھگ تیس ہزار مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ مسلمان کچھ شہید ہو گئے کچھ زندہ جلا دیے گئے اور کچھ کٹڑہ کے راستے مہور، ریاسی اور گلاب گڑھ کی طرف نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ حالانکہ ریاسی میں بھی بربریت کا بازار گرم تھا اور وہاں ایک خاندان کی عورتوں نے ہتھیار سنبھال کر اپنی عزت وعفت کی حفاظت کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ ہزاروں لڑکیوں کی ناموس غاصبوں کے ہتھے چڑھی اور اپنے آپ کو سوشل ورکر کہنے والے لوگوں نے مسلمان لڑکیوں کا سودا بیس بیس روپیہ میں کیا۔

اِس قیامت صغریٰ میں جو مسلمانوں پر ٹوٹ پڑی تھی ایک پانچ چھ سالہ بھولی بھالی دیہاتی لڑکی بھی بچتی بچاتی ایک مندر کی چوکھٹ تک پہنچ گئی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اُسی چوکھٹ سے شاید لوگ ہتھیاروں سے لیس ہو کر نکلے اور اُس کی قوم کی بربادی کا باعث بنے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اُس کی لیلا نرالی ہے۔ پجاری

نے جب معصوم فرشتہ صورت لڑکی کو دیکھا جس نے کچھ پوچھنے پر صرف خوفزدگی کا تأثر دیا اور آنسو بہائے تو نہ جانے پجاری میں کیسے انسانی ہمدردی جاگ پڑی اور اُسے لڑکی پر ترس آ گیا۔ وہ اُسے گھر لے گیا اور اُس کی پرورش کرنے لگا، اُسے گھر میں ہی رکھا مگر عمر سے کمسن وہ معصوم بچی جس نے اپنی آنکھوں شاید اپنے عزیزوں، اپنے گھر والوں کو کٹتے دیکھا ہوگا، اُس کے دماغ کی کیا حالت رہی ہوگی وہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے مگر خود وہ ایک نئے، مختلف اور اجنبی ماحول میں پا کر سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ گویا بقول ظفر اقبال ظفؔر

کوئی منزل نہ مسافر نہ کہیں گردِ سفر
میری قسمت نے مجھے لا کے کدھر ڈال دیا



(۲)

جناب شبنم قیوم اپنی معروف کتاب ''کشمیر کا سیاسی انقلاب'' حصہ دوم میں رقمطراز ہیں:

''ریاست میں قبائلی حملے کے ساتھ ہی افراتفری، انتشار اور طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا۔ مختلف قسم کی پریشان کن افواہیں گشت کر رہی تھیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے کشمیر سے بھاگنے کے بعد شیخ محمد عبداللہ ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے تو انہوں نے وادی کے اطراف سے غیر مسلم پناہ گزینوں کو محفوظ مقام پر پہنچانے کا انتظام کیا۔ چنانچہ اس کے لیے ضلع اننت ناگ سے چھتیس کوچ بانوں (ٹانگے والوں) کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ اُن کوچ بانوں نے غیر مسلموں کو اپنے مقام (جموں) پر صحیح سلامت پہنچا دیا لیکن خود وہ زندہ بچنے سے قاصر رہے (کیونکہ اُن کو واپسی پر بے لگام متعصب غنڈوں نے نگروٹہ کے مقام پر موت کے گھاٹ اُتار دیا، ٹانگوں کو جلا کر گھوڑوں پر قبضہ کیا) صرف ایک کوچ بان زخمی حالت میں بچ سکا اور اُسی سے باقی کوچ بانوں کے سفاکانہ قتل کی اطلاع اسلام آباد کے بعد سرینگر پہنچ گئی تو ایک گرم لہر سی دوڑ گئی۔ نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کی طرف سے ایک ہنگامی میٹنگ میں غیر مسلموں کو تحفظ دینے کا فیصلہ لیا گیا تا کہ کوچ بانوں کے سفاکانہ قتل سے پیدا شدہ صورت حال کا تدارک کیا جا سکے۔ بخشی غلام محمد کی قیادت میں نیشنل کانفرنس کے والینٹروں نے ہاتھ میں ڈنڈے

لے کر حساس علاقوں میں گشت لگانا شروع کیا۔
شیخ عبداللہ نے نہایت ہی عجلت میں جگہ جگہ تقریریں کر کے فرقہ دارانہ اتحاد برقرار رکھنے پر زور دیا۔ اس سلسلے میں امیرا کدل میں انہوں نے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے عوام سے تلقین کی کہ وہ ریاست میں ایک ایک غیر مسلم فرد کی مکمل حفاظت کریں۔ انہوں نے والینٹر فورس قائم کرنے کا سجاؤ دیا۔ چنانچہ نوجوانوں نے دھڑا دھڑ اُس فورس میں نام لکھوانا شروع کیا۔ اگلے چند روز میں اس والینٹر فورس نے امیرا کدل مس پلیڈیم سینما کے سامنے اپنا پہلا مظاہرہ کیا۔ اُسی روز یہ فورس ''پیس بر گیڈ'' کہلایا۔ اشترا کی نظریات رکھنے والے نوجوانوں نے امیرا کدل کو لال چوک کے نام سے منسوب کیا۔
لال چوک کو روس کے ریڈ سکوائرے نام پر لال چوک کا نام دیا گیا۔
پیس بر گیڈ کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اس میں پانچ ہزار کے قریب جوان درج ہو گئے ۔ بعد میں اسی فورس نے نیشنل ملیشیا اور پھر کشمیر ملیشیا کی صورت اختیار کر لی۔
یہاں پر یہ بات بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ پیس بر گیڈ ایک امن قائم کرنے والا فورس نہیں تھا بلکہ یہ ایک ہُلڑ بازوں کی جماعت تھی جو اکثر دھنگے کیا کرتے تھے۔ اس جماعت میں ایسے بھی عناصر شامل تھے جو کردار سے بہت ہلکے تھے ۔ اُس وقت اِس فورس کی ماہانہ تنخواہ تیس روپیہ ہوا کرتی تھی ۔ چونکہ پے رول پر ایک آنے (موجودہ چھ پیسے) کا ٹکٹ چپکانا پڑتا تھا اور ہر جوان کو اُنتیس روپیہ پندرہ آنہ (سولہ آنے کا ایک روپیہ ہوا کرتا تھا) ملتا تھا اس لیے روایتی کشمیری انداز میں اس

فورس کو ''گنترہ پنداہ'' بھی کہا جاتا تھا یعنی اُنتیس روپیہ پندرہ آنے تنخواہ پانے والی فوج۔

بہر حال آگے قیوم صاحب رشید تاثیر کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ حکومت نے مردوں کے دوش بدوش خواتین کو بھی فوجی ٹریننگ دینا لازمی سمجھا۔ چنانچہ ''ڈیفنس وومنز کور'' کے نام سے ایک جداگانہ تنظیم زینب بیگم (خواجہ غلام محمد صادق کی ہمشیرہ) کی سرکردگی میں قائم کی گئی جس میں اُن کے علاوہ مس محمودہ، ساجدہ ضمیر احمد، ہمدم جان، ترپتھ کور، مسز مٹھا سنگھ، سمترا الکھوارہ، کارگی، شیلا بھاٹیہ، اوشا ہنس، سعادت ہمدانی، سمترا کوہلی، بیگم کشفی، مسز بیدی، جانہ بیگم گونی کھن اور فریڈ دید نے نمایاں حصہ لیا۔ تقریباً پانچ سو کشمیری خواتین نے یہاں تھری ناٹ تھری بندوق چلانے کی مکمل ٹریننگ حاصل کر لی۔ مختہ بٹالین کے نام سے کشمیری خواتین رضا کاروں کو سٹریٹ فائیٹ ٹریننگ دی گئی''۔

بہر حال ہم اپنی بات کی طرف آتے ہیں۔ اُس لڑکی کو گھر کے معاملات یا چولہا چکی کے ساتھ کس حد تک عمل دخل تھا یا وہ کس حیثیت سے گھر میں رہتی تھی وہ تو اُس نے کبھی نہیں بتایا مگر پنڈت جی کے گھر والے بھی اُس پر مہربان تھے جب کہ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ وہ ایک مسلمان لڑکی ہے۔ حیران کُن بات یہ ہے کہ پنڈت جی یا اُس کے گھر والوں نے اس بات کی بھنک باہر پڑنے نہیں دی اور اُسے کسی بھی طرح پالتے رہے اور وہ پلتی رہی ______ پلتی رہی اور بڑی ہوتی رہی ______ چناب بہتا رہا اور اپنے ہرے پانی سے پڑوس کے ملک کو بھی سیراب کرتا رہا۔ وہاں کے مہاجر اُس پانی کو آنکھوں سے لگاتے رہے کیونکہ وہ بھی کبھی اُس کے کنارے مستی میں تانیں بکھیرا کرتے تھے

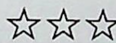
تو لے تو لے وگ رے
چناں دیاں پانیاں

ریاسی کی جانب سے آنے والی ہوائیں سُدھ مہا دیو اور لاٹی بنڈول کے باغوں سے بہی دانوں کی خوشبو چرا کر ہما چل پردیش اور پنجاب کے خونیں چہرے پر ملتی رہی جہاں کے سینکڑوں لوگوں نے ریاست کے اس صوبے میں آ کر انسانیت سوز وہ ننگا ناچ ناچا تھا جسے سُن کر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ایک انسان اپنی منفی سوچ اور دوسرے ایک بے گناہ و معصوم فرقے کے لیے ایسی شدید نفرت اور بغض و عناد اپنے دل میں پالے سُن کر حیرانگی ہی نہیں بلکہ ایک شدید ذہنی دھچکہ لگتا ہے۔

پنڈت جی اور اُس کے گھر والے اُس لڑکی کو رانی کہہ کر بُلاتے تھے۔ رانی بچی سے لڑکی اور لڑکی سے جواں جہاں دوشیزہ ہوگئی۔ وہ اُس عمر میں داخل ہوگئی جہاں ایک لڑکی کے ارمان جاگ پڑتے ہیں، ذہنی تبدیلی آ جاتی ہے اور ناچنے گانے کو جی کرتا ہے۔ پنڈت جی کو بھی اُس کی شادی کا فکر لاحق ہوا۔ کافی انتظار اور کھوج بین کے بعد بھی مناسب بر کی دستیابی نہ ہوسکی۔ اتفاقاً انہی دنوں ایک کشمیری نوجوان جو محکمہ بجلی میں ملازم تھا اور اُن دنوں اُس کی تعیناتی اُسی علاقے میں تھی اُس طرف آ نکلا اور پنڈت جی نے کچھ ضروری لوازمات پورے کیے اور رشتہ مناسب جان کر اسلامی رسم و رواج کے مطابق رانی کی شادی اُس شخص کے ساتھ کر دی۔ بعد میں دونوں میاں بیوی نے جموں شہر میں رہائش اختیار کی اور جب میری واقفیت اُس گھر کے لوگوں کے ساتھ ہوگئی، تب اُن کے دونوں بچے لگ بھگ جوان ہو چکے تھے۔ اصلیت اور اُس کانڈ کے بارے میں جس کی پاداش میں وہ تنکے کی طرح بہہ کر پنڈت جی کی گود میں آ گری تھی یا اُس کا اصلی نام جاننے

کی میں نے کئی بار کوشش کی ، کئی بار اُس کو کُریدا مگر نہ اُس نے پنڈت جی کے گھرانے سے متعلق زیادہ معلومات بہم پہنچائی اور نہ ہی اپنا اصلی نام بتایا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا نام بھول چکی ہو، کیونکہ ایک تو وہ اُس وقت بہت چھوٹی تھی اور دوسرے وہ حوصلہ شکن حادثات سے گذر چکی تھی ،تاہم وہ ہر بار یہی کہتی رہی کہ میرے ماں باپ نے میرا کیا نام رکھا تھا، وہ مجھے معلوم نہیں ہاں ! بابا (پنڈت جی) کا دیا ہوا نام ہی مجھے پسند ہے اور اُسی نام کے ساتھ میں اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتی ہوں ۔ ہوسکتا ہے کہ رانی سچ ہی کہتی ہو کیونکہ بچپن میں عموماً گھر والے ایک بچے کو کسی کنیت سے پکارتے ہیں ۔ میرا جموں کے ساتھ اب زیادہ آنا جانا اور کوئی خاص تعلق نہ رہنے کی وجہ سے مجھے رانی کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اگر وہ بقید حیات ہے تو اللہ رب العزت اُس کی عمر دراز کرے اور اگر وہ وفات پا چکی ہو تو اللہ اُسے مغفرت کرے ۔ بڑی خوبیوں کی مالکہ تھی ۔ بے خانما ، بُرباد، یتیم ، صغیر، ایک غیر فرقے اور غیر مذہب کے لوگوں میں پروان چڑھنے کے باوجود بھی اُس میں بڑا حوصلہ تھا۔ میں اُس سے بہت متاثر تھا اس لیے اُس کی بہت عزت کرتا تھا۔ جب تک اُس کے ساتھ میل ملاپ رہا میں اُسے آپا بلاتا تھا۔

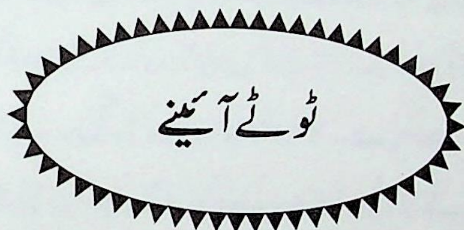
رہے نام اللہ کا



ٹوٹے آئینے

اپنے دامن کے لیے خار چُنے خود ہم نے
اب یہ چبھتے ہیں تو پھر اِن سے شکایت کیا

(حفیظ میرٹھی)


ٹوٹے آئینے

رات ______ دن سے جنم لیتی ہے اور دن رات کی کوکھ سے تولد ہوتا ہے۔ دنیا کا چکر چلتا ہے بلکہ تیز رفتاری کے ساتھ گھومتا ہے۔ شیام رنگ شامیں جاتی ہیں ______ ہنستی مسکراتی صبحیں آتی ہیں۔ گلستان رنگِ بہار دکھلاتے ہیں۔ ہواؤں کی عطر بیز چھب کچھ دیر کے لیے ماحول کو مہکاتی ہے۔ خزاں کا دیو دندناتا ہوا آکر اپنے گھیروے رنگ کی چادر پھیلا دیتا ہے اور ہرے بھرے ماحول پر مُردنی چھا جاتی ہے اور پھر اسی طرح زمستان کے مایوس دن اور بے کیف راتیں رہی سہی کسر پوری کر دیتی ہیں اور یوں وقت گذر جاتا ہے ______ بھاگتا ہے ______ اندھا دُھند ______ پیچھے مُڑتا نہیں ______ نہ پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا کرتا ہے ______ اِسی رات دن کے گرداب میں کہانیاں پیدا ہوتی ہیں ______ کہانیاں بنتی ہیں ______ کہانیاں بگڑتی ہیں ______ کہانیاں مرتی ہیں ______ پُرانی پُرانی ہو جاتی ہیں۔ طاق نسیاں کی نذر ہو کر ذہن سے اُتر جاتی ہیں اور نئی کہانیاں جنم لیتی ہیں ______ جوان ہو جاتی ہیں ______ دل و دماغ اور جذبات میں ایک ہیجان بپا کرتی ہیں۔ سوچ کا رُخ موڑ دیتی ہیں۔ کبھی کبھی ماضی سے توجہ ہٹا کر حال کے آئینہ خانوں میں جھانکنے کے لیے اُکساتی ہیں ______ ماضی اور مستقبل کے درمیانی وقفے کا نام حال ہے۔ ماضی بھولی بسری شکستہ سوچوں اور یادوں کا ایک حسین خواب ہے۔ مستقبل دبیز اور تاریک تہہ در تہہ پردوں میں لپٹی ایک انجانی اور اَن دیکھی منزل ہے جس کا تعین کرنا ناممکن ہے۔

لوگ آتے ہیں ______ لوگ جاتے ہیں ______ کہاں سے آتے ہیں ______ کہاں جاتے ہیں ______ کوئی کیا جانے ______ لوگ

پیدا ہوتے ہیں ____ لوگ مرتے ہیں۔ نہ زمین تنگ پڑتی ہے نہ قبرستانوں کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ بوڑھے جوان، بچے، کیا مرد کیا عورت سب مرتے ہیں۔ مرنے کے لیے عمر، وقت، جگہ یقیناً متعین ہے جو ازل کی تختی پر اجل کے حروف سے منقش ہے مگر اُس کے مندرجات انسانی علم، آنکھ، ذہن اور دل سے دُور پُر اسرار وادیوں کی خفیہ اور اَن دیکھی گھپاؤں کے تہہ خانوں میں تہہ در تہہ فائلوں کے انباروں میں مقید ہیں۔ جو انسانی سوچ سے پرے اور فہم سے بالاتر ہے۔ غور و فکر کرنے کا مسئلہ ہے آخر یہ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے ____ انسان پیدا کیوں ہوتا ہے ____ اگر پیدا ہوتا ہے تو مرتا کیوں ہے اور مر کر کہاں جاتا ہے

اور یہ بھی ایک کہانی ہے

میں بھی ایک کہانی ہوں

میں کبھی زندہ تھا ____ گھر کا بڑا ____ بزرگ ____ خاندان کا ممتاز ____ اور محلے کا بھی ذی عزت ____ میرے گھر میں داخل ہوتے ہیں ادب وسلیقہ مندی جوش مارتی تھی۔ عورتوں کے سر دوپٹوں سے ڈھک جاتے تھے۔ بچوں کی شرارتیں اور خرمستیاں تھم جاتی تھیں۔ کوئی چھوٹا بڑا کام میرے مشورے اور اِذن کے بغیر انجام نہیں پاتا تھا۔ سماجی معاملات اور گھر و مسجد کے مختلف کاموں میں میری رائے ضرور لی جاتی تھی۔ محلے کے جھگڑے، جائیداد کے تصفیے اور وراثت کے قضیے میری ہی سوجھ بوجھ اور دوراندیشی سے بحُسنِ خوبی نپٹ جاتے تھے۔ کوئی نوجوان رُوٹھتا تو اُسے منانے کے لیے مجھے بُلایا جاتا تھا۔ میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا تھا تو مجھے یاد کیا جاتا تھا۔ باپ بیٹے میں ان بن ہوتی تو میری مداخلت لازمی سمجھی جاتی۔ بچہ کسی بات کو لے کر ضد کرتا تو میرے نام کے دھاڑے سے اُسے قابو میں کیا جاتا تھا۔ میرے منہ کھولنے پر بچوں بڑوں پر مشتمل

دس افراد میرے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے مستعد ہو جاتے تھے۔

میں زندگی کی اُس منزل پر پہنچ چکا ہوں جہاں میرے سفید بالوں اور سفید داڑھی کا رب کائنات بھی لحاظ کرتا ہے۔ میں خطا کروں مجھے رسوا نہیں کرتا۔ میں گناہ کا مرتکب ہو جاؤں مجھے ذلیل نہیں کرتا۔ میری کمزوریوں کو عیاں نہ کر کے اُن پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ میں رحمان کی رحمانی عطیات سے سرشار اور رحیم کی مہربانیوں سے زیر بار احسان ہوں۔ ممنونیت کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں، ہو بھی کیسے سکتے ہیں، کیا اُس عالمین کے پروردگار کی ثنا کبھی پوری ہو سکتی ہے

اور یہ بھی ایک کہانی ہے

کہ آج میں مر گیا ہوں

مجھے میرا بیٹا، میرا خون ہی ذلیل کرتا ہے۔ بے عزت اور رسوا کرتا ہے اور میری تحقیر کرتا ہے۔ میرے احکام کی تعمیل تو دور کی بات ہے وہ مجھے گھسیٹ کر گھر سے باہر نکالتا ہے۔ میرے ساتھ گستاخانہ اور غیر انسانی سلوک کرتا ہے۔ میری بزرگی کا ادب نہیں کرتا، میرے سفید بالوں سے حیا نہیں کھاتا۔ میرے ناتواں جسم، کمزور انگ واعضاء، جھریوں دار چہرے اور جھکی کمر کا اُسے کوئی لحاظ نہیں۔ میری دیکھ بھال اور دوا دارو اور میرے تکالیف کو وہ یکسر فراموش کر چکا ہے۔ میں نے بھی اپنی جوانی اُس کے پالن پوشن، تعلیم و تربیت اور دیکھ ریکھ کے لیے داؤ پر لگائی تھی، اُس کو بھی وہ بھول چکا ہے۔

مگر غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ بزرگوں کو بے عزت کرنے والے نہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہے۔ وہ بھی سودیشی پیداوار ہیں اور شلغم کا کُشتہ کھا کر ہی جوان ہوئے ہیں۔ پھر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ جو میں سمجھتا ہوں موجودہ ماحول اور

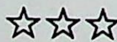
موجودہ معاشرہ ہے۔ موجودہ دور کے ٹی وی سیریل، فلمیں، رسائل اور جرائد ہیں۔ ریڈیو کی ایسی چینلز ہیں جو اس نوجوان کو سفر میں، حضر میں، گھر بیٹھے، راہ چلتے، بس میٹا ڈار میں، ہوٹل اور کنٹین میں، بیڈ پر اور جم خانے میں، پارک اور کھیل کے میدان میں، ایکس کرشن اور آؤٹنگ میں غیر مہذب، ہیجان انگیز اور مخرب اخلاق گانے سناتی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ہی میں نے ایک ٹی وی سیریل میں دیکھا کہ بیٹے نے باپ کو کس کر تھپڑ مارا۔ ایسے مناظر کا اثر کچے ذہنوں پر پڑنا لازمی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنا محاسبہ کریں، سوچیں، پتہ لگائیں کہ آخر خامی یا کمی کہاں پر ہے۔ ہمارے کردار میں، ہماری تعلیم و تربیت میں، ہماری دانشگاہوں میں، ہمارے ذرائع ابلاغ میں، ہمارے پالن پوشن میں یا ہمارے گھریلو ماحول میں۔ جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے یہ قصور صرف اور صرف ہمارے گھریلو ماحول کا ہے کیونکہ ہم نے خود اپنے گھروں کو جہنم زار اور اپنے بچوں کی مجنونانہ حرکات کے لیے ایک ٹریننگ کیمپ بنایا ہے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ چلنا گناہ نہیں ہے اور نہ ہی مختلف سائنسی ایجادات سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج ہے مگر حدود کا پاس و لحاظ رکھنا بہر حال ضروری ہے۔ ٹی، وی کو اگر دنیا جہاں کی خبریں، سائنسی معلومات، نئی ایجادات اور تعلیم و تربیت کے لیے محدود کر دیا جائے تو ٹی وی رکھنے اور دیکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ٹی وی کو جب کمیونسٹ روس نے تعلیمی اغراض کے لیے استعمال کیا تھا تو وہ اُس میں سوفی کامیاب رہے مگر اسی ٹی وی پر اگر حیا سوز فلمیں، مخرب اخلاق ڈرامے، تماشے اور شو دیکھیں جائیں، یہود ملکیت والی چینلوں سے اگر عورت کی برہنگی اور معاملات پیار و محبت میں ماں باپ کے ساتھ مخالفانہ روش اور ٹکر لینے والی باتیں دیکھی جائیں تو سوچنے والی بات ہے کہ کمسن بچوں اور کچے ذہنوں پر ایسے مناظر کا کتنا منفی اثر پڑ سکتا ہے۔

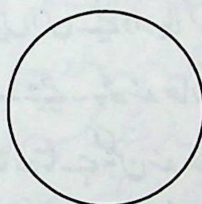
اور آج کل یہی ہو رہا ہے۔ ہر گھر ایک سینما گھر ہے اور یہود ایجنٹ کی عمل آوری احسن طریقے سے ہو رہی ہے۔ اس بدی اور بے راہ روی کے ماحول میں جب اپنی ہی اولاد ہم سے بھڑ جاتی ہے اور نوجوان لڑکی کھلے عام بوائے فرینڈ کے ساتھ گھومنے جاتی ہے اور کبھی کبھی ہفتے عشرے تک غیر لوگوں کے ساتھ ایکس کرشن پر جاتی ہے اور کلچرل ٹروپ کے ساتھ ریاست سے باہر بھی جاتی ہے تو اُس وقت ہم کُڑھتے کیوں ہیں۔ ہمیں بُرا کیوں لگتا ہے۔ یہ مایا جال تو ہم نے خود ہی بُن لیا ہے اور ایسا ماحول ہم نے خود ہی تیار کیا ہوا ہے۔ بقولِ شاعر

اپنے دامن کے لیے خار چُنے خود ہم نے
اب یہ چبھتے ہیں تو پھر ان سے شکایت کیا

خار اب ہمیں چبھنے لگے ہیں اس لیے واویلا کرنے کا کیا مطلب ہے۔ ہاں معاملات کو حد سے باہر جانے نہ دیجیے۔ کچھ سُدھار کی کوشش کیجیے۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بگاڑ ہوتا رہتا ہے لیکن سُدھار بھی ممکن ہے۔ ہم ماشاءاللہ مہذب ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ بہتر صورت پیدا کی جا سکتی ہے اور جناب احتشام اختؔر کے اس مشورے کو بھی اگر ذہن میں رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

ہمت اگر ہے آپ میں مشعل جلائیے
کیوں سر پھری ہوا کا گلہ کر رہے آپ

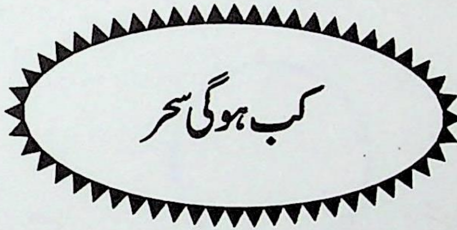




کب ہوگی سحر

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

(اقبال)


کب ہو گی سحر

''ماڈرن مجنون'' جو قوم کی عمارت کے حقیقی ستون ہو سکتے تھے اپنے منصب سے منحرف ہو کر فقط زنانہ وضع قطع کے زنانے ہو کر رہ گئے ہیں۔ایک زمانہ تھا جب نوجوان پر قوم فخر کرتی تھی کیونکہ ظاہر سی بات ہے کہ ڈھلتی عمر کے ساتھ قویٰ اور جذبات کمزور پڑ جاتے ہیں اور بوڑھوں کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے یا تو وہ ماضی کی داستانیں سُنایا کرتے ہیں یا پوتے پوتیوں کو سکول چھوڑنے یا بس سٹینڈ سے لے آنے کے لیے جاتے ہیں۔اگر یہ کام نہ ہوا تو راشن لانے کی ذمہ داری لے چکے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مسجد کمیٹی یا محلّہ ویلفیئر اور کفن دفن کمیٹی کے ممبر بن کر اپنی مصروفیات کو مختص کرتے ہیں۔مگر نوجوانوں پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ آنے والے کل کی تحریر بھی ہوتا ہے اور تصویر بھی۔وہ قوم کی ترقی کا ضامن اور تعمیرِ نو کا معمار بھی ہوتا ہے۔وہ گھر میں اپنی بہن کی عفت و عصمت کا رکھوالا اور سرحد پر دشمن کی نگاہِ غلط انداز کا عقاب اور غلط ڈگر پر قدم اٹھانے پر قدفن ثابت ہوتا ہے۔ مسئلہ گھریلو ہو، سماجی ہو یا پھر ملکی ہر وقت نگاہیں نوجوان پر ہی مرتکز رہتی ہیں۔

تقدیر ایمان کا جُز ہے جسے بلا چوں و چرا تسلیم کرنا اور اُس کا مرقوم ہونا اٹل ہے۔لیکن یہ ایک ایسی دلیل ہے جو پردے کے پیچھے مستور ہے۔اگر ایک انسان کو تقدیر کے بارے میں قبل از وقت معلوم ہو سکتا تھا تو وہ گھر سے باہر قدم بھی نہ رکھتا، نہ کشتی جہاز، موٹر بس یا ریل کا سفر کرتا اور نہ ہی سیر سپاٹا یا تفریح کے لیے دھرتی پر گھومتا، چہل قدمی کرتا۔یہی وجہ ہے کہ ایک انسان دنیا میں تگ ودو کرتا ہے، ہاتھ پیر مارتا ہے، روزی روٹی جُٹانے کے لیے کبھی گھر سے اور کبھی ملک سے نکل پڑتا ہے، کاروبار سنبھالتا ہے اور بازیچہ ہائے رنگا رنگ میں حصہ لیتا ہے۔میرے کہنے

کا مطلب ہے کہ ہم ایک نوجوان پر تکیہ کر کے اپنی آنکھ بند کر کے عہدہ برآ نہیں ہوتے یا اُس کو ہی اپنا نجات دہندہ (Saviour) تصور نہیں کرتے ہیں بلکہ تقدیر کے بارے میں کوئی بھی بات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہم دنیا داری اور دنیاوی ترقی کو آگے لے جانے کے لیے اُس کو ایک مضبوط ذریعہ مانتے ہیں کیونکہ اُس میں جسمانی قوت کے ساتھ جذبات، حوصلہ، بے خطر آگ میں کودنے اور فریش برین (Fresh Brain) ہونے کے سبب کچھ کرنے کا مادہ، ہمت، عزم صمیم اور بے فکری ہوتی ہے۔ جوانی کی جولانیاں ہی زندہ دلی کے کارہائے نمایاں انجام دے کر قوموں کو زندہ بناتی ہے، تہذیبوں کو زندہ رکھتی ہے، تاریخ کو زندگی دیتی ہے اور اپنے اسماء کو بھی زندہ جاوید کرتی ہیں۔ آپ نے محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ، صلاح الدین ایوبیؒ، بوعلی سیناؒ، بخت نصر، سکندر سائیرس جون آف آرک، ہنی بال اور اسی قبیل کے اُن ہزار ہا عہد آفرین شخصیات کا نام ضرور سُنا ہوگا، جنہوں نے اپنے وقت پر زمانے میں انقلاب لائے اور اُن کے نام پتھروں کے انمٹ سکوں پر کندہ ہو گئے۔ ایسے ہی نوجوانوں کے لیے ناقوس بجتے ہیں، شمعیں جلتی ہیں اور قصیدے لکھے جاتے ہیں اور رزمیہ داستانیں وجود میں آجاتی ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ہر ملک کے لوگ اپنے لوک ادب میں خاص تذکرے کرتے ہیں اور دادی اماں کی کہانیوں کے ہیروز بھی وہی ہوتے ہیں۔ مگر اس کے مقابلے میں ہمیں عصری سوغات میں کیا ملا۔ موجودہ ٹی، وی سے اثر پذیر ایک بے راہ رو نسل جس کے صرف کھمبے ہی لمبے ہیں مگر جڑیں بے حد کمزور ہیں۔ مغرب زدہ لباس کی ایک بگڑی ہوئی شکل میں ملبوس، کلائی میں رنگین، دھاگا یا لوہے کا کڑا، کبھی کبھی چوڑی کانوں میں مندراں اور پتلون ہپ پر اتنی نیچی کہ ذرا سا چھونے پر بھرم کھلتا ہے یار کی قامت درازی کا، اکثر سگریٹ اور شراب کے شوقین اور کچھ ڈرگ کے

بھی رسیا۔ یہ ٹھیک ہے ک ایسے سارے کے سارے نہیں ہیں۔ مانو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا نہیں ہے مگر کیا کریں ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے کیونکہ جب بھی ہماری نظریں اُٹھتی ہیں ہمیں ایسے ہی مسخرے نظر آتے ہیں اور ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ہمارے کھیتوں کی تمام ہریالی ایسی ہی بانجھ اور بے ہودہ ہے جو صیام کے دوران بھی سڑکوں پر کھلے عام سگریٹ سے شوق فرماتی ہے اور بے دھڑک آئس کریم کا بھی سیون کرتی ہے اور اس انداز سے گھور کر گذرتی ہے جیسے ہم نے انہیں اس حالت میں دیکھ کر گناہ کیا ہو۔

یہی دھان پان سی زنانہ فوج اب موبائل ہاتھ میں لینے سے تھکتی ہے۔اب کانوں میں آلے ڈال کر سماعت و گویائی کا بندوبست راہ چلتے، بائیک پر اور موٹر کار میں بھی ہو جاتا ہے۔کبھی کبھی راہ چلتے آپ کسی ایسے نوجوان کو ضرور دیکھتے ہوں گے جو باتیں کرتا ہوا چلا جاتا ہے اور آپ پہلی نظر میں یہی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ باورا ہے اور ہذیان بکتا ہے۔مگر یہی ہذیان بکنے والے ہمارے ''ماڈرن مجنون'' ہیں جنہوں نے غیرت کو پان بنا کر چبا ڈالا ہے۔ میرے خیال میں یہ بتانے کی حاجت نہیں کہ شرعی اصطلاح میں غیرت گھریلو مستورات بشمول بیوی کی عفت و عصمت کی حفاظت کرنے کو کہا گیا ہے۔اب جس کی بیوی نہ ہو تو اُس کے لیے معنی اور وسیع ہو جاتے ہیں۔اُس کے لیے ماں بہن کی عزت کے علاوہ امت مسلمہ کی ماں بہنوں کی حفاظت بھی مطلب ہو سکتی ہے۔اس عمل میں دفاع کرنے والا نوجوان مارا بھی جاتا ہے تو وہ شہادت کا درجہ پاتا ہے۔مگر ہمارے یہ مجنون غیرت کیا جانیں وہ تو ظاہر ہی ہے۔آج باغِ مہتاب سرینگر کا وہ گھرانہ اپنی معصوم اور کمسن بچی کے فراق میں آنسو بہا رہا ہے اور انصاف کی کرسی کی جانب نظریں جمائے بیٹھا ہے جسے آج تک بھی انصاف نہیں ملا جس بچی کو تین سال قبل موٹر کی

ٹکر مار کر شہید کر دیا گیا۔ اُس کا قصور صرف یہ تھا کہ مرحومہ نے مخاشی کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا۔ غیرت کا حقیقی معنوں میں دیوالیہ پٹ گیا ہے، ایسی صورت میں بزرگوں کا کیا ردِ عمل ہو سکتا ہے سمجھ سے بالاتر ہے۔

آخر یہ قوم کہاں جا رہی ہے۔ اس قوم کا نوجوان کیا صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ نشے اور ڈرگ کے متوالے سکولوں، کالجوں حتیٰ کہ اعلیٰ دانش گاہوں تک میں اس کا سیون کر کے اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی، اپنی قومی وراثت اور تحریک حریت کی بھی مٹی پلید کر رہے ہیں۔ بزرگ لیڈر کب تک قومی نیا کو کھینچتے رہیں گے اور جوان سال قائد بھی کب تک جوانی کی جولانیاں اور جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔ آخر یہ مشعل برداری تو اُن کو ہی کرنی تھی۔ مگر افسوس مایوسی اگرچہ کفر ہے مگر بہت دنوں سے اپنے چمن کی خستہ حالی، گلستان ک بُربادی اور گلوں کی جگہ خار بر آمد ہوتے دیکھ کر ہمارے حوصلے پست ہو گئے ہیں اور ہم ایک بیزاری کے شکار ہو گئے ہیں، اس لیے ؎

سنگ مرمر کی چٹانوں سے ڈھکی ہے وادی
سلسلے تاج کے پھیلے ہوئے تا حد نظر
برف کے بوجھ سے خم کھائی ہوئی شاخِ چنار
پوچھتی ہے کوئی بتلاؤ، کہ کب ہوگی سحر

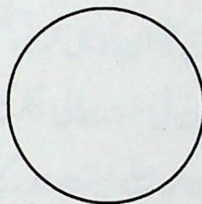
(سہیلؔ زیدی)

کامریڈ دوستوں کا کہنا ہے کہ ''وہ صبح کبھی تو آئے گی''، اور ہم بھی کہتے ہیں کہ وہ سحر کبھی ضرور پھوٹے گی، مگر حالات مدنظر رکھ کر میں نہیں سمجھتا کہ وہ صبح کبھی ہوگی اور ہمیں ایک تابناک اُجالے سے سرفراز کرے گی کیونکہ ؎

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ

(ڈاکٹر اقبالؔ)

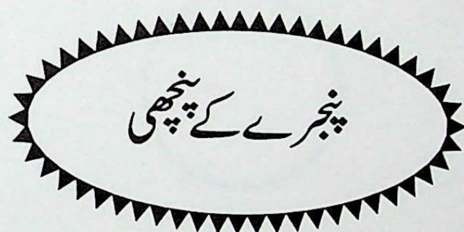




پنجرے کے پنچھی

یہ مقتل ہے وہ ذبح خانہ
چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو
مطلب تو ہے بچوں کا مروانا
چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو

(ساحرلدھیانوی) پیروڈی


پنجرے کے پنچھی

جب ہم چھوٹے تھے اُس وقت لوگ ہسپتال کو شفا خانہ کہا کرتے تھے اور اُن سیدھے سادھے خداترس لوگوں کو اُن شفا خانوں میں حقیقتاً شفا مل جاتا کرتی تھی۔ جیسے لوگ شریف، سادہ اور ایماندار تھے، ویسے ہی ڈاکٹر، متعلقہ عملہ اور شفا خانوں کے دیگر کارپرداز مخلص ہوا کرتے تھے۔ دوائیں سچی اور بااثر ہوا کرتی تھیں۔ نقل، دھوکہ دہی اور جعل سازی کسی کے وہم گمان میں بھی نہ تھی۔ لوگ ایک اعتقاد کے ساتھ شفا خانوں میں علاج ومعالجہ کے لیے داخل ہوجایا کرتے تھے۔ شفا خانوں کا عملہ مریض کا علاج اور خدمت بغیر کسی لالچ اور لاگ لپیٹ کے کرتا تھا اور فرضِ منصبی سے ہٹ کر انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر مریضوں کے ساتھ اپنائیت جتا کر حُسنِ سلوک کرتا تھا۔ نہ رشوت کا چلن تھا، نہ دھوکہ دہی کی بات تھی اور نہ جعلی دوائی دی جاتی تھی۔ نہ مریض کو دوسرے کے رحم وکرم پر ہونے کا احساس دلایا جاتا تھا اور نہ اُس کی مفلوک الحالی یا کم مائیگی سے متعلقہ عملہ کی خدمت گذاری میں کوئی تخصیص پیدا ہوتی تھی۔ نہ ڈاکٹر لوگ محض حصولِ زر کے بارے میں سوچا کرتے تھے اور نہ شفا خانوں کا عملہ شفا خانوں کی اشیاء اُڑا کر پرائیوٹ دوکانیں چلایا کرتے تھے۔ مگراب ______ اب تو اللہ ہی بیلی ہے۔

بغیر لائینس حاصل کیے نقلی دوائیاں بنانے والی کمپنیاں ڈاکٹروں کو مختلف تحائف جو چمچماتی ہوئی گاڑیوں کی شکل میں ہوتے ہیں، نقدوجنس کی صورت میں بھی ہوتے ہیں اور موجودہ دور کی مشینی سہولیات کے رنگ میں بھی ہوتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہی بچے کالے کالے چرمی بیگ لے کر بائیکوں اور کاروں میں گھوم گھام کر یہ زہر نقلی دواؤں کی شکل میں بازار میں کھپاتے ہیں۔ کیا ہوگا اس قوم کا۔ جب قومی صحت وتندرستی اور وقار وآبرو کی عمارت کے بنیادی

ستون ہی اس قوم کو کھوکھلا کر رہے ہیں تو افسپا سے قانونی اور آئینی تحفظات سے سرشار ایک معمولی بہشتی یا بھنگی کو ہم کیا آنکھیں دکھا سکتے ہیں۔ مہاجن کے قرضے کے بوجھ تلے دبا ہوا ایک دور دراز گاؤں کا ایک غیر ریاستی عساکر جس کے گھر کے باقی لوگ بے سروسامانی کی حالت میں زمیندار کے پاس بندھوا مزدوری کر رہے ہوتے ہیں، یہاں کے دوشالہ اوڑھے بہت ذی عزت خواجہ یا ڈاکٹر، انجینئر، صحافی، سکالر کو گولیوں کی بوچھاڑ کر کے فقط ایک لفظ اُچھال کر اُس سے زندگی چھین سکتا ہے_____ اُگروادی_____ یا کراس فائرنگ کا وکٹم جتلا کر بات کو آئی گئی کہہ کر معاملے سے منہ موڑ کر موج مستی میں لگ جاتا ہے اور اگلے ہفتے اُس کے سینئر اُس کی سراہنا اُسے پرموشن دے کر کرتے ہیں۔ اس طرح سے کتنے ذی عزت لوگوں اور سربرآوردہ شخصیات کو شہید کیا گیا۔ کیا چانیکہ نیتی ہے کہ حاکم اعلیٰ جہانگیر چوک میں سیب خریدتا ہے، ایک عام آدمی کی طرح سنگرمال شاپنگ سینٹر میں شال خریدتا ہے، ایک لذیذ آئیس کریم نوشِ جان کر کے پھر اپنی کُرسی پر بیٹھ کر ایک جھینپی ادا (Bashful Act) کے ساتھ حکم صادر کرتا ہے کہ ''افسپا کی منسوخی نا ممکن ہے''۔

ابھی حال ہی میں دہلی کے مشہور اپالو ہسپتال میں پانچ ماہ کی ایک کشمیری بچی کا آپریشن ہوا۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے وہ بالکل تندرست ہے۔ ہسپتال سے فارغ کرتے وقت وہاں کے ایک بڑے ڈاکٹر نے بچی کے والد سے کہا تھا کہ خطرناک قسم کے موذی امراض کشمیریوں کو بالخصوص اس لیے لاحق ہو جاتے ہیں کیونکہ کشمیری لوگ ایک تو گوشت زیادہ کھاتے ہیں اور دوسرے داووں کے نام پر انہیں زہر ملتا ہے۔ وادیٔ کشمیر نقلی ادویات ڈکارنے کا ایک بہت وسیع فلیڈ بن چکا ہے۔

ایک عورت کا پُر بہار لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ ماں بن جاتی ہے۔ کتنے پُر کیف

اور حسین نام سے یہ عورت سرفراز ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو دنیا کی بیشتر زبانوں اور قوموں میں مشترک ہے جب کہ کہیں تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ ایک چھوٹے سے بچے لے ک ۱۰۰ سال کے بزرگ تک کے کانوں میں جب یہ لفظ پڑتا ہے تو اُس پر ایک وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو وہ صرف محسوس کرسکتا ہے مگر لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ ایک عورت کو مخلوقات رب العالمین میں ایسا مقام عطا ہو جاتا ہے جس کی رُو سے اولادِ آدم کی انمول ترین جستجو یعنی جنت اُس کے قدموں کے نیچے آجاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی زچگی اور اُس سے قبل کے وہ کربناک لمحات جب وہ اُس عمل سے گذر رہی ہوتی ہے یا ماں بننے والی ہوتی ہے اُس کی زندگی کی خطرناک ترین ساعتیں بھی ہوتی ہیں۔ ماں اور نومولود دونوں کی زندگیاں ہوا میں لٹک رہی ہوتی ہیں اور اُمیدیں صرف رب رحیم وغفور کی کرم گستری سے بندھی ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر حالات ناموافق رُخ اختیار کر جائیں تو عورت کو لازماً نزدیکی ہسپتال یا اُس ہسپتال میں جہاں اُس کی اجسٹریشن ہو چکی ہوتی ہے، لے جانا پڑتا ہے۔ اُن نازک ترین لمحات سے نبرد آزما ہونے کے لیے حکومت کی طرف سے کئی زنانہ ہسپتال قائم کیے گئے ہیں مگر وہاں کی رشوت خوری اور استحصال سے شیطان بھی پناہ کا طالب ہے۔

کچھ عرصہ ہوا ہماری دو رشتہ دار لڑکیاں دردزہ شروع ہوتے ہی شہر کے ایک زنانہ ہسپتال میں پہنچا دی گئیں، وہاں کسی نے کوئی توجہ نہیں کی۔ رات کی ڈیوٹی پر تعینات سارا عملہ بشمول ڈاکٹر سو گیا، تیمادار رات بھر ہونقوں کی طرح کبھی ایک دروازہ پیٹیں کبھی دوسرا دُوار بجایں، کبھی روئیں کبھی چیخیں، جب کچھ نہ بن پڑا تو انہوں نے اپنا ہی منہ نوچنا شروع کیا۔ دوسری جانب مریضوں کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار اُس قیامت خیز رات کی صبح ہو جاتی ہے۔ ایک فرشتہ، ڈاکٹر کی

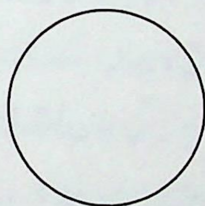
شکل میں کہیں سے نمودار ہو جاتا ہے، وہ مریضوں کو دیکھتے ہی آپریشن کا حکم دے دیتا ہے۔ بچے ماں کے پیٹ میں مر چکے ہوتے ہیں۔اُن کو ماں کا پیٹ چاک کر کے برآمد کیا جاتا ہے اور بڑے جتن کے بعد مریضوں کی جان بچ جاتی ہے۔اُس غمناک رات کا میں بھی گواہ ہوں جس میں اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ پن اور لاپرواہی سے چودہ بچے ہلاک کیے گئے۔ مجھے ابھی ماضی قریب میں بچہ ہسپتال میں ہوئے سینکڑوں بچوں کی اموات کبھی کبھی شک کے گھیرے میں لا کھڑا کر دیتی ہے۔ کہیں یہ فیملی پلاننگ کی ایک اور طرح کی سازش تو نہیں۔ ریاست کے دوسرے صوبے میں یہ بے رحمانہ بچوں کی اموات کیوں نہیں ہوتیں۔

وادیٔ دلسوز میں ویسے بھی انسانی جان کی قیمت ایک ٹھیکری کے برابر بھی نہیں مگر ایک ماں کو اس طرح تڑپانا جیسے یہاں کے زنانہ اور بچہ ہسپتالوں میں ہوتا ہے، تڑپا تڑپا کر بچے کی اور کبھی کبھی دونوں کی جان لینا، شاید ہٹلر کے زمانے میں یہودی مراکز اسیراں یا کنسنٹریشن کیمپوں (Concentration Camps) میں بھی نہیں ہوتا ہوگا۔ یہ وہ عمل ہے جس سے ہر ایک ماں، بہن، بیوی، بیٹی اور خود ڈیوٹی پر متعین زنانہ ڈاکٹر بھی گذر جاتے ہیں۔مگر اُس کے باوجود یہ بے حسی اور غیر ذمہ دارانہ پن کیا معنی رکھتا ہے۔ آنکھوں کا پانی بھلے ہی مر گیا ہو کیا دل بھی پتھر کا ہو گیا ہے۔ساحرلدھیانوی کی روح کے ساتھ معذرت چاہتے ہوئے اُن کی ایک قوالی کی پیروڑی کرتے ہوئے یہی عرض کرنا چاہوں گا

یہ مقتل ہے وہ ذبح خانہ
چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو
مطلب تو ہے بچوں کا مروانا
چاہے یہ چاہے وہ مانو

قفس میں اسیراس پنجرے کے پنچھی کی درد بھری داستان کون سُنے گا
کون سمجھے گا______ کوئی بھی نہیں______ کوئی سمجھ ہی نہیں
سکتا۔ جو سمجھتے ہس وہ انجان بنتے ہس ۔اس پنجرے کے پنچھی کا درد بانٹنے والا کوئی
نہیں ہے______ کوئی بھی نہیں۔

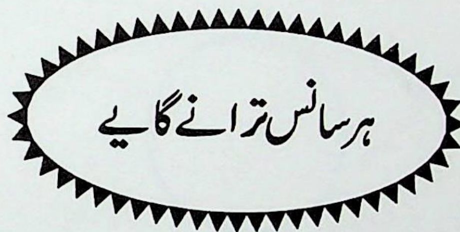




ہر سانس ترانے گائے

کوئی سبق نہ ہم سے مکمل پڑھا گیا
تھی زندگی قلیل صحیفے ضخیم تھے

(پرتپال سنگھ بیتابؔ)


ہر سانس ترانے گائیے

سلیقہ وشائستگی کے ساتھ بات کرنا اور بات میں میٹھے، خوشگوار اور بہترین الفاظ کا استعمال کرنا ایک مہذب انسان کی ترجیحات میں سے ہونا لازمی ہے۔ شائستہ اور تہذیب یافتہ لب ولہجہ مخاطب کو بھی متاثر کیے بنا نہیں رہتا اور خوبصورت زبان بولنے والے کا سوسائٹی میں بھی مان سمان رہتا ہے۔ چنانچہ آپ نے یہ بھی سُنا ہوگا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے:

اللہ جمیل و یُحب جمال

یعنی اللہ تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔

اس طرح سے مذہبی طور پر ایمان وعمل سے لے کر، کردار واخلاق، ادب و عادات بلکہ زبان و بیان تک خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش اسلامی معاشرہ کی ایک علامت بن جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو فن تجوید وقرأت کا دائرہ اسی مرکزی اور بنیادی خیال کے گرد گھومتا ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ سے اپنے احکامات کو عام کرنے کے لیے خوبصورت زبان کو استعمال کرنے کا ایک اور حکم بھی نافذ ہوا ہے۔ چنانچہ ہم قرآن کریم کی ہدایت سورہ بنی اسرائیل، ۵۳ میں پڑھتے ہیں:

وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

(میرے بندوں سے کہہ دو بات وہ کہیں جو زیادہ اچھی ہو)

رب العالمین کے اس حکم میں تینوں باتیں شامل ہیں۔ یعنی بات بھی اچھی کہی جائے، اُس کا انداز بھی اچھا ہو اور مواد کے اعتبار سے بھی اچھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت ہم مناسب آواز، صحیح لب ولہجہ، ترتیل اور خوش الحانی کا خاص خیال رکھتے ہیں جب کہ اُس کے لیے بھی الگ سے حضور

پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے:

زینو القرآن با صفاتکم (ترمذی)

(قرآن کو اپنی آوازوں کے ذریعہ سے مزّین کرلو)

زبان کی ایک بہت بڑی اہمیت ہے جس کا سمجھنا ہر فرد کے لیے از حد ضروری ہے۔ آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ ظہور اسلام سے قبل عرب کے لوگ سماجی اعتبار سے کردار، اخلاق میں نہایت پست اور گئے گذرے تھے۔ اُن کی وحشت ناکی اور درندگی کی سینکڑوں مثالیں تاریخ کے صفات پر رقم ہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کردار واخلاق کی اُس گراوٹ اور تنزلی کے باوجود وہ زبان کے بارے میں بے حد محتاط تھے اور اس قدر سنجیدہ تھے کہ وہ عرب کو چھوڑ کر باقی دنیا کو عجم یا عجمی یعنی گونگے کہا کرتے تھے۔ بے حد گنوار اور ریگستانوں میں بود و باش کرنے والے بدّو بھی اس بارے میں اس قدر محتاط (Conscious) تھے کہ کہتے ہیں ایک بدّو کی شادی حسب معمول اور حسبِ روایت ایک بدّو لڑکی کے ساتھ ہوگئی اور رات کو دولہے نے دلہن سے کہا کہ چلو سوتے ہیں چراغ کو بُجھا دو ______ اُقتل سراج ______ لفظی معنی میں چراغ کو قتل کر دو یعنی بُجھا دو۔ مگر یہ محاورہ اُس زمانے میں زبان سے خارج (متروک) ہو چکا تھا۔ اور اُس کا استعمال روزمرہ کی زبان میں نہیں ہوتا تھا۔ یہ سُنتے ہی لڑکی نے، غور فرمایئے ایک نوعمر الھڑ بدّو لڑکی نے، خیمے سے باہر آکر شور شرابہ ڈال کر اپنا منہ پیٹنا شروع کر دیا۔ کارواں کے دوسرے لوگ بھی خیموں سے باہر آکر استفسار کرنے لگے تو لڑکی نے بتایا کہ وہ لٹ گئی اُسے ایک عجمی کے ساتھ شادی کر دی گئی ہے، کیونکہ اُس نے غلط زبان بولی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ بدوں کا حال تھا تو دیہاتوں اور شہروں میں رہنے والے لوگ زبان کے بارے میں کتنے سنجیدہ رہے ہوں گے۔

اِسی طرح دورِ جہالت میں لُبیدؔ نامی ایک شاعر جب کوئی تازہ کلام کہتا تو چمڑے کے ٹکڑوں پرلکھ کراُسے خانہ کعبہ کی دیواروں پرٹانگ دیا جاتا تھا۔شاعر کی شہرت اور زبان کی نیرنگی کا یہ عالم تھا کہ لوگ پڑھنے میں سبقت کرنے کے لیے ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھا کرتے تھے۔ایک دن صاحب موصوف اپنے تین اورساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں پرسوار کہیں جارہے تھے تو کہیں دور کی ایک آواز اُس کے کان میں پڑی ______

والعصر ان الانسان لفی خسر

لُبید نے گھوڑے سے نیچے اُتر کر زمین پر سجدہ کیا۔ساتھیوں نے اُس کا تمسخر اڑایا کہ وہ اپنے دین سے پھر گیا ہے۔لُبید نے جواب میں کہا ارے نادانو تم کیا جانو میں نے کس اونچے پائے کا کلام سُنا ہے۔میں نے دین کونہیں کلام کوسجدہ کیا ہے۔یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اپنی زبان پر نازاں ہونے کے بھرم اورخوش فہمی کوتوڑنے کے لیے رب العالمین نے اُن کے لیے ایک ایسا کلام نازل فرمایا جس کے آگے روئے زمین کی فصاحت اور بلاغت ماند پڑگئی۔

دیکھا گیا ہے کہ عصر حاضر میں خاص کرلوگ جتنا جسمانی صحت کا خیال رکھتے ہیں،ایک سے بڑھ کر ایک صابون، شیمپو، کریم، پوڈر،لوشن اور کلر کی خریداری کی طرف توجہ دیتے ہیں۔لباس کی بہتری، عمدگی اور مروجہ فیشن کٹنگ اور فٹنگ پر دھیان دیتے ہیں۔گھروں کوسجانے سنوارنے اور مختلف آرائشی سامان فرشنگ اور فلورنگ وغیرہ اپنا وقت، پیسہ اور دماغ صرف کرتے ہیں، اتنا زبان کی درستگی، صحت یا کلام کی عمدگی اور الفاظ کی سلاست و بلاغت پر صرف نہیں کرتے اور نہ ہی اس ضمن میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت کرتے ہیں۔حالانکہ ایک مہذب اور روشن خیال اور تعلیم یافتہ معاشرہ کے لیے جسمانی، اخلاقی، ذہنی اور روحانی صحت کے

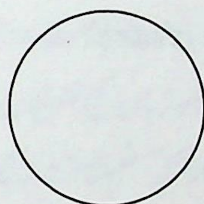
ساتھ ساتھ زبان کی صحت کا بھی خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ ایک آدمی کتنا اونچے خیالات، شائستہ فکر اور پاکیزہ تدبر ہی کا کیوں نہ ہو، اگر اُس کا طرزِ تکلم اور پیرایۂ اظہار بھونڈا ہو، ناقص لب ولہجہ ہو تو اُس کی ساری شخصیت ساری نگہداشت (upkeep) مٹی میں مل جاتی ہے۔ اگر ایک بے حد خوبصورت انسان کو گندہ لباس یا گدڑی پہنا دی جائے تو وہ اپنی وجاہت کھو دیتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ میٹھا انداز بیان اور پاکیزہ طرز تکلم فرض بھی ہے اور سنت بھی جب کہ کریم پوڈر، فرنشنگ، فلکنگ اور اونچی عمارات کا تعمیر کرنا اسراف ہے جس کے لیے "ولا تُسرِفُو" کی قدغن سامنے ہے۔

قرآن کریم کی معنوی اور صوتی متن نے تمام علمی اور ثقافتی زبان کو بھی متاثر کیا اور رفتہ رفتہ مسلمانوں نے فصاحت، بلاغت اور عمدہ طرز تکلم کو اپنا شعار بنالیا۔ ایسے معاشرے اور ماحول میں پھر زبان کی غلطیاں اور طرز بیان کی کمزوری اور ایک نقص بن کے رہ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم ثقافت کے فروغ واشاعت اور ترتیب و ترویج کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی صحت کو بھی ایک اہم مقام ملتا گیا۔ زبان کی غلطیاں شرمناک اور نا قابل معافی تصور کی جانے لگی۔ تاریخ اسلام کے وشال ادبی اور ثقافتی ذخیرے سے اس بارے میں دو چھوٹی مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔ ایک بار دربارِ نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی عرب نے محاورہ کے استعمال میں غلطی کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا، اپنے اس بھائی کی اصلاح کرو یہ بھٹک گیا ہے۔ اِسی طرح خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کو حسن بن الحرؒ نے اپنے ایک معتمد کے ہاتھ ایک خط بھیجا جس میں زبان کی غلطی رہ گئی تھی۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے بہ واپسی جواب حسن بن الحرؒ کو پیغام بھیجا کہ کاتب کی کمر پر ایک درہ لگایا جائے۔

آخر پر یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک انسان کو صحبت کا اثر جہاں اخلاق و عادات، رویے و رجحان اور مذہب و ثقافت پر پڑتا ہے وہی زبان و بیان پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے اچھی صحبت اختیار کرنے کے ساتھ اگر اچھی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جائے تو ضرور اُن کا ایک خاطر خواہ اثر زبان پر بھی ہوگا۔ جو لوگ مطالعہ سے دور رہتے ہیں اُن کی زبان ماحول و سماج کی عوامی کثافتوں سے محفوظ نہیں رہتی۔ ٹی وی بینی کو اگر کم کر کے مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جائے تو یقینی طور پر ہم میں صحتِ زبان اور حُسنِ بیان آئے گا جو دنیاوی عزت و احترام کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی کا بھی موجب بن سکتا ہے۔

و ما علینا الا البلاغ

☆☆☆

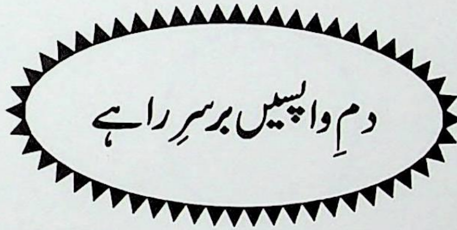


چلتے چلتے

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے

ملاح بھی ہے ناؤ بھی ہے دل بھی ہے لیکن
بے کھٹکے ہمیں پار اُترنا تو آئے

(کالی داس گپتا رضاؔ)


دمِ واپسیں بر سرِ راہے

بنی نوع انسان نے تاریخ عالم کے مطالعے اور لیل و نہار کی مقررہ گردش سے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی صحیح رہبری اور سچی راہنمائی دین کے ذریعے سے ہوتی رہی ہے۔ دین ______ راستہ، رہبری، راہنمای، لائحہ، طریقہ اور اصول کو کہتے ہیں۔ ایک انسان دنیا میں اپنی معاشی اور سماجی زندگی گذارنے کے لیے ہر ایک کام ایک طریقے سے، ایک لگے بندھے ضابطے سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک آئین یا ایک اصولِ عمل داری مرتب کرتا ہے۔ اگر حیاتِ انسانی ایک قانون اور ضابطے کے تحت رواں دواں نہ رہے تو پھر وہ انسانی برداری یا انسانی سماج نہ رہ کر حیوانوں کی بستی ہو جاتی ہے۔ جس میں لاقانونیت کا راج ہونا لازم و ملزوم ہے۔ یہ اصولِ ضابطہ یا آئین جب انسان بناتا ہے تو اُس کی فطری کمزوریوں اور بشریت کی طرح اُس میں سُقم اور کمزوریاں رہتی ہیں، اُس کے برعکس اگر یہ ضابطہ یا آئین اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا تو وہ بلاشبہ مکمل، بے عیب اور پائیدار ہوگا۔

چنانچہ انسانی آنکھ نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ جو دین دھرم، دیوی دیوتا، معبود، مذاہب و ادیان انسان نے خود گڑھ اور تراش لیے اُن کا زمانے میں کیا حشر ہوا اور آگے بھی اگر ایسی کوئی حرکت ہوگی تو اُن کا بھی یقیناً وہی حشر ہونا لازمی ہے۔ تاریخ کے صفحات پلٹنے پر ہمیں کہیں بعید از عقل یونانی دیو مالائی قصے تو کہیں ہنومان اور مہابھارت کی محیر العقول داستانیں نظر آتی ہیں۔ ایک طرف دیوتاؤں کا باپ زیوس ملتا ہے تو دوسری طرف آرٹیمس دیوی کھڑی نظر آتی ہے۔ ایک جگہ ہیلیس ہے تو دوسری جگہ مردوک ہے۔ نیکی اور بدی کے توام جھوٹے خدا یزدجر اور اہرمن بھی اپنی جھوٹی خدائی کی کرسیاں سنبھالے ملتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں

ایسے بھی مواقع آئے کہ کبھی انسان نے خود ہی خدا بنائے اور کبھی خود ہی خدا بن کے بیٹھے۔ آذر نے اگر خدا تراشے تو نمرود فرعون نے خدایت کا دعویٰ کر ڈالا۔ شداد نے اگر خدا کی تخلیق کو چیلنج کیا تو مارکس اور لینن نے سرے سے ہی خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ یہ انسان کا بنایا ہوا خدا کبھی ہمیں جٹا دھاری سادھو کے روپ میں نظر آتا ہے تو کبھی ہاتھی کی شکل میں، کبھی جوان العمر مرد کے روپ میں تو کبھی ایک خوبصورت عورت کی شبیہ میں۔ آذر بُت تراشتا ہے، نمرود خدا بن بیٹھتا ہے، فرعون لوگوں سے خود کو پجواتا ہے، سکندر بھی خود کو دیوتا نامزد کرتا ہے اور یہ انسان نہ جانے کیا کیا کرتا ہے۔ ایک لکڑیوں، بالوں اور کھالوں سے اپنی حاجت روائی چاہتا ہے تو دوسرا چاند، سورج اور ستاروں سے بھی یہی مطالبہ کرتا ہے۔ ایک انسانوں کی لکھی ہوئی کتاب کو مجسم روح و جسد قرار دے کر اُسے ''صاحب'' پکارتا ہے اور اُس کے روبر عبادت کی غرض سے سجدہ کرتا ہے اور دوسرا انسانوں کے ہی دروازوں پر دھاگے باندھ کر خدائی ٹیلی فون ایکس چینج کے ساتھ تار جوڑنے کی ایک مضحکہ خیز کوشش کرتا ہے۔ یہ انسان کتنا بوالعجب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت بھی سارے عرب دیش کی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ چنانچہ مسدس میں مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

قبیلے قبیلے کا بُت ایک جُدا تھا
کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزیٰ پہ وہ نائلہ پہ فدا تھا
اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا

غرضیکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹے فرسودہ دعووں میں کوئی بقا کوئی ثبات نہیں ہوتی۔ اگر بقا اور پائیداری ہے تو وہ فقط اللہ کی ہے، اللہ کے راستے کی ہے،

اللہ کے دین کی ہے، اللہ کے طور طریقے یا یوں کہیں کہ اسلامی طور طریقے کی ہے۔ اسلامی طور طریقے اور عقائد اس قدر سادہ اور دلنشین ہیں کہ ایک معمولی سی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی انہیں تسلیم کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اسلام کے اِن طور طریقوں میں نہ فلسفی گتھیاں ہیں، نہ عقلی دوڑ دھوپ ہے۔ منطقی جوشگافیاں ہیں نہ الف لیلوی قصے ہیں اور نہ یونانی یا ہندوی دیو مالائی محیر العقول داستانیں۔ چند نہایت سیدھے اور صاف اصول ہیں جنہیں عقل انسانی بڑے آرام اور شائستگی کے ساتھ قبول کرتی ہے۔ اسلامی عقاید کی خوبی یہ بھی ہے کہ ہر چیز نہایت قطعی اور صاف ہے۔ اُن میں نہ کوئی مفروضات ہیں، نہ قیاسیات، نہ کوئی شک وشبہ ہے اور نہ ہی مشکلات اور سختیاں ہیں۔

خالق کائنات کی طرف سے انسان کے لیے سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ رب نے اُسے زندگی دی ہے، اُسے انسان بنایا ہے۔ بے جان پتھر کا ٹکڑا، مٹی کا ڈھیلا یا ٹھیکری نہیں بنایا ہے۔ چند ساعتوں کے لیے زندہ رہنے والا مچھر، مکھی یا بِھڑ نہیں بنایا۔ مٹی میں ملا کیچوا یا نالی کی گندگی میں لوٹیں لگانے والا کیڑا نہیں بنایا۔ پھر اُسے مکان، دوکان، کوٹھیاں، واہن، روپیہ پیسہ، کھانا پینا، کپڑا لتا آل اولاد اور عیش و آرام دیا۔ وسیع دھرتی اُس کے مشاہدۂ حق اور گھومنے پھرنے کا فیلڈ بنایا۔ عقل، سوچ سمجھ، علم و ادراک سے بہرہ ور کیا۔ عزتِ نفس اور ادب و اخلاق کے ساتھ روشناس کرایا۔ احساسات اور آنسو دیے، بذلہ سنجی اور ہنسی دی۔ پاس ولحاظ اور عدل وانصاف سکھایا۔ مراتب اور رشتے کا احترام بتایا۔ مظلوم کی مدد اور نادار کی دلبری کے جذبے سے سرفراز کیا۔ درد دل کے راز ہائے بر بستہ سے آگاہ کیا

میں ناچیز کیا کیا بتاؤں اور کتنا گِناؤں۔ مگر یقینی طور انسان نادان نہیں ظالم ہے۔ اتنے رحیم وکریم اور شفیق ورفیق پروردگار کو سائیڈ لائن کر کے اِدھر اُدھر

کے شیطانی راستوں پر بھٹکتا رہتا ہے۔ آخر اُسے کون سی چیز بھٹکنے کے لیے پامال کر رہی ہے۔ افسوس کتنا خود فراموش اور خود غرض ہے یہ۔ اپنے مہربان رب کی کون کون سی اور کتنی نعمتوں کا انکار کرے گا، کس کس احسان سے منہ موڑے گا، کیا اُس کے کانوں میں یہ الفاظ بار بار نہیں پڑتے رہتے ہیں

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ O

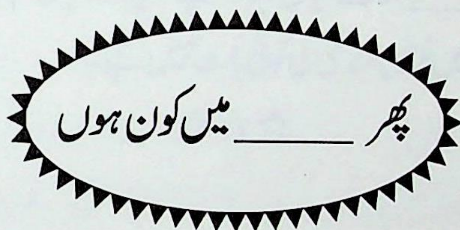
مگر اے انسان پھر بھی بہرے اور اندھے بنتے ہو۔ ذرا سوچو اس میں کس کا خسارہ ہے۔ سوچو! سوچو! مگر پلیز ذرا جلدی سے کیونکہ ''دم واپسیں بر سرِ راہ ہے'' کی ٹلی کسی بھی وقت بج سکتی ہے۔ پھر پیرڈ ختم اور تم لائف سائنس مضمون میں ____فیل____ ارے میاں بچاؤ اپنے آپ کو۔ ہاں! ہاں! یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔ اس میں غرض مندی کی کوئی بات نہیں ہے۔



پھر ____ میں کون ہوں

تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

(غالبؔ)


پھر ـــــ میں کون ہوں

بحیرہ روم کے شمال مشرق میں دریائے تائبر کے مغرب کی جانب روم یا ویٹیکن سٹی آباد ہے۔ فنِ تعمیرات، فن سنگ تراشی یا مجسمہ سازی کے لیے عہد قدیم میں مشہور اس خوبصورت ملک کے بارے میں پرانی تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے لگ بھگ آٹھ سو برس قبل البالونگا کی قدیم مملکت میں ایک بھائی حکمران تھا جب کہ دوسرے بھائی ریہا سلوا کا حکومت میں کوئی حصہ نہ تھا۔ اُس کے ہاں جب دو بچے پیدا ہوئے تو اغلب یہی تھا کہ اُن بچوں کا اپنے وقت پر تخت کی دعویداری اور وراثت کی جائز بحالی کے ڈر کو مدنظر رکھ کر اُس دعوے کو ابتدا میں ہی ختم کرنے کے لیے حکمران بھائی نے دونوں بچوں کو رازداری کے ساتھ قتل کر حکم دے دیا۔ شاہی احکامات بجالانے کے لیے جانے والے شاہی ملازم کو اُن بچوں پر رحم آیا۔ اُس نے اُن کو ایک ٹوکری میں ڈال کر دریا میں بہا دیا۔ حسنِ اتفاق سے یہ ٹوکری دریائے تائبر کے کنارے آلگی۔ ایک مادہ بھیڑیا اُن کو اُٹھا کر اپنی گھپا میں لے گی اور اپنے بچوں کے ساتھ اُن کو بھی پالتی رہی۔ کچھ وقت کے بعد فاسفیو ٹاس نامی ایک چرواہے کی نظر اُن پر پڑی تو وہ اُن کو اُٹھا کر اپنے گھر لے آیا جہاں پر اُن کو چرواہے کی بیوی نے پالا پوسا، بڑھا کیا اور ان کے نام راموليس اور ریمس رکھ لیے۔

نوجوانی میں ایک بار دونوں بھائیوں کی آپس میں ٹھن گئی۔ جھگڑا اس قدر طول پکڑ گیا کہ راموليس نے ریمس کو قتل کر ڈالا اور پھر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب اُس نے طاقت حاصل کر لی تو اُس نے آس پاس، دور دراز، گاؤں اور شہروں سے لوگوں کو لا لا کر اُس جگہ پر بسانا شروع کیا اور سن ۷۵۳ قبل مسیح میں خود بادشاہ بن کر مملکت روم کی بنیاد ڈالی۔ بھیڑیئے کی دودھ کی خاصیت اپنا رنگ لائی،

یہی وجہ ہے کہ رومی لگ بھگ ڈھائی ہزار سال تک خون ریزی اور جنگوں میں ہی الجھے رہے اور بھیڑیوں ہی کی طرح شکار میں مصروف رہے۔ ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے رہے اور لوٹ مار، قتل و غارت میں مصروف رہے۔

یونانی، مصری، عراقی تہذیبوں کی طرح رومی تہذیب بھی اپنی جگہ مشہور ہے۔ روم کے بارے میں کئی محاورے مشہور ہیں جیسے روم جل رہا تھا تو نیرو بنسی بجا رہا تھا ۔روم ایک دن میں نہیں بنا، روم میں وہی کرو جیسے رومیوں کو کرتے دیکھو وغیرہ۔ ان محاورات سے روم کی انفرایت کی نشاندہی ہوتی ہے۔روم نے اپنی نشاۃ ثانیہ حاصل کرنے سے قبل اپنی دولت، شہرت، درندگی، سفاکی، عیاشی اور تعیش کی بڑی مشہور روایات اور داستانیں تاریخ کے صفحات پر رقم کی ہے۔اسی ملک نے نیرو کو پیدا کیا جس کو سفاکی اور قتل و غارت گری کے نظاروں سے لطف ملتا تھا۔ اُس نے اپنی ماں اور بیوی کے ساتھ ساتھ ہزاروں لوگوں کا قتل عام کروا کے روم میں آگ لگوادی اور خود ایک اونچی جگہ پر بیٹھ کر نظارہ لیتا رہا۔ مارکس جیسا فلسفی باشادہ بھی اُسی ملک میں پیدا ہوا اور سنیکا بھی اُسی جگہ پیدا ہوا جس کو اپنے فلسفیانہ مضامین کی باعث عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔اسی ملک میں حضرت عیسیٰؑ کو بھی مصلوب کیا گیا تھا اور اُسی جگہ رومیوں نے سن ۸۰ء میں کولوسیم (Collo seum) نامی وہ ہال یا کھلی چھت والی وہ بلڈنگ بھی بنائی تھی جو چھ سو فٹ لمبی اور ساڑھے پانچ سو فٹ چوری تھی، جس میں پنتالیس ہزار رومیوں نے بیٹھ کر اُن مظلوم عیسائیوں کا تماشہ دیکھا جن کو انتی دروازوں سے اندر لا کر شیروں کا نوالہ بننے کے لیے شیروں کے سامنے ڈال دیا گیا تھا۔ اسی ملک نے مشہور عالم فاتح جولیس سیزر پیدا کیا جس نے اور ملکوں کے علاوہ برطانیہ اور فرانس کو بھی فتح کیا تھا اور اُس کی قوم نے اُس کی بہادری اور فتوحات کا معاوضہ اُسے قتل کر دیا دیا۔

اِسی ملک میں بادشاہ قسطنطین اول بھی ہوا جو تاریخ میں قسطنین اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ جس نے ۳۱۲ء میں عیسائی مذہب اختیار کر کے بُت پرستوں (pagan) کے مندوروں کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسی ویٹیکن سٹی میں لگ بھگ پندرہ سو ہال، بے شمار لائبریریاں اور کئی آرٹ گیگریاں ہیں جن میں مقدس آرٹ، مخرب اخلاق آرٹ، قدیم آرٹ اور ماڈرن آرٹ کے بے شمار نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہی آرٹ گیلریوں میں مشہور زمانہ مصوروں جیسے رفائیل، دِونچی، مائیکل انجلو کے شاہکار نمونے بھی ملتے ہیں۔ دنیاوی طاقت حاصل کرنے کے بعد اسی ملک میں راہبوں نے مذہبی ہدایات اور روحانی مشن کو خیر باد کہہ کر ہوس پرستی اور شہوت رانی کی انتہا کر دی۔ پوپ ششم راڈر گو بور گیا اور پوپ نہم بینڈکٹ نے اپنی زندگی کا مقصد ہی شہوت پرستی بنا لیا تھا۔ انہی کی اولادوں میں بور گیا اور لکریزیا (Borgia and Lucrezia) ہوئے جو تاریخ انسانی کے انمٹ فحاشی اور ہوس پرستی کے گوشے ہیں۔ جین پلاڑی (Jean Plaidy) کی کتاب میڈونا آف سیون ہلز (Madone of seven Hills) کے مطابق پوپ راڈر گو نے اپنی ہی بیٹی کے ساتھ شادی کر کے اُس کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کیے تھے۔ لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر ویٹیکن سٹی پہلے بھی اور اب بھی تمام دنیا کے عیسائیوں کے لیے محترم، مکرم اور عزت مآب ہے۔

سن ۱۹۳۹ء میں اُس وقت کے پوپ نے مہاتما گاندھی سے ملنے کی درخواست اس بنیاد پر رد کر دی تھی کیونکہ وہ صرف لنگوٹی باندھا کرتے تھے۔ جبکہ پوپ سے ملنے کے لیے ایک مکمل ڈریس کا ہونا لازمی تھا۔ مگر جب مسولینی کی فاشسٹ فوجوں نے نہتے اور بے سروسامان حبشیوں پر حملہ کر دیا تو اُسی پوپ نے اُن کی درندگی، سفاکی اور ظلم و جبر روبہ عمل لانے کے لیے دعائیں دیں۔ ایک اور

پوپ نے بعد میں جنوبی ہند کی ایک رقاصہ اور مغنیہ کی شرفِ ملاقات شاید اس لیے بخشا تھا کہ وہ ایک مالدار اور صاحبِ ثروت یوراج کے ہمراہ ملاقات کو گئی تھی اور یہ جان کر سابقہ فرمانروائے ہند بھی پرنس کوٹ (بند گلا کوٹ) پہن کر گئے تھے مبادا واسکٹ اور دھوتی کو ایک نامکمل ڈریس مان کر انہیں شرفِ ملاقات نصیب نہ ہوتا۔ یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ بھارت میں اقلیتی فرقوں سے وابستہ لوگوں کو اجاڑا بھی جاتا ہے، زندہ جلایا بھی جاتا ہے، جائیداد کو پھونک بھی ڈالا جاتا ہے اور تہہ تیغ بھی کیا جاتا ہے مگر سابقہ والیٔ ہند (واجپائی) صرف عیسائیوں کے زخموں پر پھاہا رکھنے کے لیے پاپائے اعظم کے ہاتھوں پر بوسہ دینے ویٹیکن سٹی جاتے ہیں۔

(۲)

اگر اسی طرح کا ایک اور سیاسی آشواسن دوسری ایک اقلیت کے بارے میں شاہ سعود کو بھی دیا جاتا تو شاید ہمارا حال وہی ہوتا______

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

انسانی زندگی بذاتِ خود ایک عجوبہ ہے۔ آئے دن ہم عجیب وغریب واقعات سے دوچار ہوتے ہیں اور مشاہدے کے علاوہ حیران کن واقعات سنتے بھی رہتے ہیں۔ اِسی ملک کے بارے میں ایک حیران کُن واقعہ تاریخ کی صفحات کی زینت بنا ہے۔ لیجیے ملاحظہ فرمائیے:

آج سے لگ بھگ ایک سو تیرہ سال قبل یعنی جولائی ۱۹۰۰ میں اٹلی (روم) کا بادشاہ امبراتو اول شہر مونزرا میں ایک ہوٹل میں اپنے کچھ عمائدین سلطنت افسران خاص اور چند احباب کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ اچانک بادشاہ کی نظریں سامنے کاونٹر پر بیٹھے ایک سفید مونچھوں والے مگر باوقار شخص پر پڑیں۔ جو

معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اُس ہوٹل کا مالک تھا۔ بادشاہ نے اپنے ساتھ بیٹھے اشخاص سے کہا کہ میں نے ضرور اُس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔ یہ میرا شک نہیں بلکہ یقین ہے۔ تجسس دور کرنے کے لیے بادشاہ نے ہوٹل مالک کو اپنے پاس بلوایا اور اُس سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ہوٹل مالک نے جواب میں کہا، حضور گستاخی معاف، آپ نے مجھے ضرور آئینے میں دیکھا ہوگا کیونکہ لوگ اکثر آپ سے میری مشابہت بلکہ بھرپور مشابہت کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ ہماری شکلیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی تو ضرور ہیں مگر میں ایک معمولی آدمی ہوں میں اس کا برملا اظہار یا تفنن طبع کی خاطر معمولی ذکر بھی نہیں کرسکتا ہوں۔

بادشاہ نے حیران ہوکر ہوٹل مالک سے اُس کا نام پوچھا، اور جواب میں اُس نے کہا، جہاں پناہ میرا نام امبراتو ہے اور میرا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ میں ۱۴ر مارچ سن ۱۸۴۴ء کو ساڑھے دس بجے صبح پیدا ہوا تھا۔ بادشاہ یہ سُن کر اُچھل پڑا اور ہکا بکا رہ گیا کیونکہ یہی اُس کی پیدائش کا وقت، تاریخ اور سن تھا۔ بادشاہ نے ہوٹل مالک سے کہا کہ جب ہماری پیدائش ایک ہی دن اور ایک ہی وقت پر ہوئی ہے اور آپ کا نام بھی میرے ہی نام جیسا امبراتو ہے تو پھر میں کون ہوں؟

مزید حیرانگی اور تجسّس کو دور کرنے کے لیے بادشاہ نے ہوٹل مالک سے مندرجہ ذیل سوالات سے جوابات طلب کیے۔ کیونکہ بادشاہ اب حقیقی معنوں میں ایک گہری سوچ میں غرق ہوچکا تھا۔

آپ کہاں پیدا ہوئے؟

کیا آپ شادی شدہ ہیں اگر ہاں تو آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟

آپ کی بیوی کا نام کیا ہے؟

آپ کے کتنے بچے ہیں اور اُن کے نام کیا ہیں؟

آپ یہ ہوٹل کب سے چلا رہے ہیں؟

کیا آپ کو کھیلوں کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے؟

ہوٹل مالک نے مسکرا کر اور بڑے تحمل کے ساتھ ان سوالات کے جوابات اس طرح دیے:

جناب والا! میں تورینو میں پیدا ہوا تھا، وقت اور تاریخ پیدائش میں پہلے ہی گوش گذار کر چکا ہوں۔ میں شادی شدہ ہوں اور میری شادی ۱۲/اپریل سن ۱۸۶۶ء کو ہوئی تھی۔ میری بیوی کا نام مرگھی ریٹا ہے، میرا صرف ایک ہی لڑکا ہے جس کا نام دیتوریو ہے۔ میں یہ ہوٹل ۶ جنوری سن ۱۸۷۸ء سے چلا رہا ہوں۔ مجھے کھیلوں کے ساتھ بے حد دلچسپی ہے اور کل جس تقریب میں آپ کھیلوں کے سلسلے میں انعامات تقسیم کرنے والے ہیں، میں اسٹیج کے قریب ہی آپ کے درشنوں کے لیے حاضر رہوں گا۔ آپ نے صحیح اندازہ لگا لیا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی ملے ہیں۔ جس فوجی یونٹ میں آپ کرنل تھے میں بھی اُسی یونٹ میں ایک معمولی سرجنٹ تھا۔ مراتب کی پاس داری کی وجہ سے ہمارا ملنا جلنا بہت کم ہوتا تھا۔ کیونکہ آپ جانتے ہی ہیں کہ فوج میں ڈسپلن کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔

یہ سُن کر بادشاہ مبہوت ہو کے رہ گیا۔ اُس کی حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ ہوٹل مالک سے کہنے لگا کہ ہمارا نام، تاریخ پیدائش، وقت پیدائش، جائے پیدائش، بیویوں کے نام، لڑکوں کے نام سب ایک جیسے ہیں۔ حتیٰ کہ جس روز آپ نے ہوٹل کھولا ہے، اُسی روز میری بھی تاج پوشی ہوئی تھی۔ اتنی مشابہت اور مماثلت یقیناً بے انتہا تعجب خیز اور حیرت خیز ہے۔ میں واقعی چکرا گیا ہوں۔

اگلے روز کھیل کے میدان میں بادشاہ امبراتو نے تقریب کے شروع ہوتے ہی ہوٹل مالک امبراتو کو تلاش کیا تو اُسے اپنے مصاحبوں سے اطلاع ملی کہ وہ اُسی

صبح کو وفات پا چکا ہے۔ بادشاہ کو زبردست رنج ہوا۔ اُس نے بہت افسردہ ہو کر اپنے افسروں سے کہا کہ اس تقریب سے فارغ ہوتے ہی اُس کے جنازے میں شرکت کرنے کے لیے چلیں گے۔ مگر اتنے سارے اتفاقات ہونے کے بعد بادشاہ کی زندگی میں ایک اور اتفاق ہونا باقی تھا۔ اپنے مصاحبین اور افسران کے ساتھ ابھی بادشاہ کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ تماشہ بین لوگوں کے ہجوم میں سے تین فائر ہوئے اور اُن میں سے دو گولیاں بادشاہ کے دل کو چیر گئیں اور وہ وہی پر، گر کر ڈھیر ہو گیا۔

دنیا میں بے شک چند لوگ ایسے پیدا ہوتے ہیں جن میں کچھ یا بہت کچھ مشابہت ہوتی ہے۔ مشابہت، مطابقت، موافقت، یکسانیت، مماثلت مما رست ایسے الفاظ ہیں جو ہم نوالہ وہم پیالہ ہیں یا غیر ادبی زبان میں یہ سارے الفاظ ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں مگر جو واقعہ مذکور ہو چکا ہے اُس میں دو اشخاص میں اتنی مماثلت یا یکسانیت واقعی حیران کن اور انفرادی نوعیت کی ہے

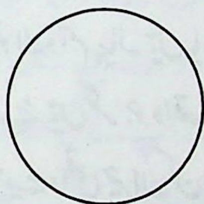
چلتے چلتے دو شعر بھی سُنتے جایئے

کچھ نہ کچھ ہر شخص کا انداز رندانہ بھی ہے
بزمِ ہستی در حقیقت ایک میخانہ بھی ہے
زندگی روتی ہوئی سی اِک حقیقت ہی نہیں
زندگی ہنستا ہوا سا ایک افسانہ بھی ہے

(نریس کمار شاد)

(جنوری ۲۰۱۳ء)





بور کا دِیا

نالہ کرنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

(سعید النسا حرماںؔ)


بورکا دِیا

مکۃ المکرّمہ سے تقریباً سوا چھ سو کلومیٹر دور سعودی عربیہ کا ایک سرحدی علاقہ عیسر ہے جو بحر احمر یعنی ریڈ سی کی جانب پڑتا ہے۔ وہاں برف گرتی ہے اور درجہ حرارت کبھی کبھی پندرہ ڈگری تک ،گر جاتا ہے۔ اُس جگہ کا موسم سال بھر نسبتاً ٹھنڈا ہی رہتا ہے۔ ویسے بھی سارے عربیہ میں قلیل مدتی گُہر بستہ راتوں میں پالا پڑتا ہے اور لوگ ٹھنڈ سے بلاشبہ ٹھٹھرتے ہیں۔ دیگر ممالک کے لوگ خصوصاً برصغیر ہندو پاک کے بیشتر باشندے گرچہ گرم علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر سردی کو سہہ جاتے ہیں جس طرح گرمی کے دنوں میں بے انتہا گرمی کو برداشت کر لیتے ہیں کیونکہ سارا مشقت کا کام صرف انڈور ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں فیلڈ میں ہوتا ہے۔ اُسی طرح بہار، بنگال، اڑیسہ وغیرہ کے لوگ بھی اب سردیوں کے دوران وادی میں ٹھہرتے ہیں۔ آگے اکتوبر مہینہ آتے ہی وہ مزید ایک پل کی دیر کیے بنا کھسک جاتے تھے مگر اب وہ سارا سال وادی میں بخوشی ٹھہر جاتے ہیں۔ رہی سردی تو وہ اُس کو اُسی طرح برداشت کر لیتے ہیں جس طرح ہم بہ امر مجبوری یا بہ سلسلہ تجارت و ملازمت یا تعلیم و تربیت دیگر جگہوں پر گرمی کو سہہ جاتے ہیں یا برداشت کر لیتے ہیں۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مزدور پیشہ لوگ رنگ ساز، مستری، معمار، ترکھان، کھیت مزدور اور دیگر محنت کا کام کرنے والے بدیسی یہاں جاڑوں کے دوران بھی کیوں ٹھہرتے ہیں اور سردی کی سختیاں اور اضافی خرچہ برداشت کر لیتے ہیں۔ اس ضمن میں جب ہم نے اعتماد میں لے کر کچھ لوگوں کے ساتھ بات کی تو اُن باتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ اول تو یہاں کام ہی کام ہے، کام کی تلاش میں بھٹکنا یا پریشان ہونا نہیں پڑتا، اگر ہمت ہو اور جسم میں طاقت و توانائی ہو تو سال کے

پورے تین سو ساٹھ باسٹھ دن کام دستیاب رہتا ہے۔ یہاں تک کہ عید کے دن بھی قربانی کا ذبیحہ اور گوشت کی تقسیم کاری وغیرہ کا کام مل جاتا ہے۔ اور ٹائم کا کام کے علاوہ یہاں اُجرت بہت اچھی ملتی ہے۔ بھارت میں کسی بھی جگہ مزدور کو یومیہ مزدوری چالیس پچاس روپیہ سے زیادہ نہیں ملتی اُس پر بھی میٹ کا کمیشن کٹتا ہے جب کہ یہاں حالیہ اُجرت تین سو سے تین سو پچاس روپیہ کے درمیان ملتا ہے۔ کامگاروں جیسے ترکھان، معمار، مستری کو دوگنا ملتا ہے جب کہ لوہے کا کام کرنے والے کو اڑھائی گنا ملتا ہے۔ چیزوں کی قیمتیں بھی ابھی ماضی قریب تک اعتدال پر ہونے سے ہماری قیمت خرید بھی متاثر نہیں ہوتی تھی۔

یہاں کام کے دوران دو وقت، دو دو تین تین پیالیاں چائے اور اُس کے ساتھ روٹی ملتی ہے۔ اگر صاحب خانہ رحم دل ہوا (جو اکثر حالات میں ہوتا ہے) یا مزدور کم ہوئے تو دن کا کھانا بھی اُس سے نکل جاتا ہے۔ ڈانٹ، پھٹکار، زور زبردستی بالکل نہیں ہوتی بلکہ سگریٹ بیڑی پینے اور گھٹکا مار کر سُستانے کا بھی وافر موقعہ مل جاتا ہے۔ کسی کیا، بلکہ اکثر گھروں میں ہفتہ عشرہ مزدوری کے دوران دو تین دعوتیں بھی ہو جاتی ہیں کیونکہ یہاں کے دستور کے مطابق نیب ڈالیں تو دعوت، سیڑھی بنائیں تو دعوت، سلیب ڈالیں تو نقد و جنس، برآمدہ بنائیں تو دعوت اور چھت ڈالیں تو دعوت، غرضیکہ دعوتیں ہی دعوتیں ——— یہاں مزے ہی مزے ہیں۔ سچ مچ کشمیر جنت ہے جنت، جنت بے نظیر۔

ایک بہاری مزدور نے اپنا نام ظاہر کیے بنا بتایا کہ شارجہ، دوبئ اور دیگر عرب ممالک میں مزدور کو آسانی کے ساتھ ماہانہ بارہ چودہ ہزار روپیہ مل جاتا ہے مگر اُس کے لیے کام بیل کی طرح کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس ہم یہاں سہولیت کے ساتھ کام کر کے اُس سے زیادہ کما لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم میں سے بیشتر

لوگ سردیوں میں یہیں رہ جاتے ہیں اور ہر طرح کا کام کرتے ہیں۔ آپ کی نظریں مزدور کے کام تک ہی محدود ہیں، آگے ہم مزدوری یا کھیت مزدوری ہی کیا کرتے تھے مگر اب ہم پکوڑے بیچتے ہیں، سبزی ترکاری اور پھل بیچنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ بقر عید پر قربانی کا ذبیحہ کر کے قصاب کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ صفائی کا کام کرتے ہیں، مٹر بیچتے ہیں، رضائی، لحاف تکیوں میں روئی بھرتے ہیں۔ ٹینٹ، سائیبان بچھاتے ہیں، گھروں کی صفائی ستھرائی، مسجدوں کی امامت، درسگاہوں کی مُدرسی، دوکانوں اور باغوں کی چوکیداری، غرضیکہ وہ کون سا کام ہے جو ہم لوگ نہیں کرتے ہیں۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ کشمیر میں حالات کیا بھی ہوں، کیسے بھی ہوں مگر ہمارے لیے یہ شارجہ ہے شارجہ بلکہ شارجہ سے بہت بڑھ کر۔ کیونکہ وہاں جانے کے لیے بہت سازادِ راہ چاہیے جو ہم کو مہاجنوں سے چالیس فی صد سود پر حاصل کرنا پڑتا ہے اور برسوں پاسپورٹ حاصل کرنے میں لگ جاتے ہیں مگر یہاں کے لیے ایسی کوئی دقت نہیں، کوئی اضافی خرچہ نہیں اور کوئی قرضے کا بوجھ نہیں۔

سادہ دلی سے کہی ہوئی اُس مزدور کی یہ بات کتنی صحیح، جامع اور سچ ہے۔ ہمارے یہاں دیہاتوں سے لوگ پڑھ لکھ کر (اور کچھ بغیر پڑھے لکھے) سرکاری نوکریوں میں آ گئے، میڈیکل، پولیس، فائر سروس اور دیگر حفاظتی دستوں میں شامل ہو گئے۔ کھیتوں کو کالونیوں میں تبدیل کر دیا، سونا اُگلنے والی دھرتی ماں کا سودا نوکری کے چند پیسوں کے ساتھ کر دیا اور خود کو نہ کھیت کا، نہ کھلیان کا اور نہ ہی گاؤں کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں اور دلفریب حسین مرغزاروں کا رکھا۔ دور دراز گاؤں میں جہاں کچھ زمینیں بچی رہی اُن پر باہر کے مزدوری سے کھیتی کروانے لگے اور کھیت، کھلیان، کوٹھار کی چابیاں اُن کے ہی سپرد کر دیں اور خود دھرتی ماں کے

ساتھ دغا کرنے والا یہ بندہ خودفریبی میں مبتلا رہا۔ تارِعنکبوت سے گھر بنانے والے اس مخمور انسان نے کبھی یہ نہ سوچا کیا اُس کی ذنبیل ہمیشہ پنجاب کے سامنے ہی گدائی کرتی رہے گی؟

شہر میں چھوٹے چھوٹے کام کرنے والوں کے پاس پیسہ آ گیا اس لیے خود تو وہ لالے بن بیٹھے اور کام کرنے کے لیے کرایہ کے مزدوروں کو رکھ لیا۔ چونکہ پھل فروٹ، سبزی، ترکاری، پٹھورا پکوڑا، مٹر، مکی بُھٹا بیچنا معیوب سمجھا جانے لگا اس لیے وہ کام بھی بنگالیوں اور بہاریوں نے سنبھال لیا۔ ایک تخمینے کے مطابق وادیٔ کشمیر کے شہر و دیہات میں صرف چھولے سموسے بیچنے والوں کی ہی چالیس ہزار دوکانیں ہیں۔ کیا آپ کوئی گاؤں قصبہ ایسا بتا سکتے ہیں جہاں آس پاس میں یہ کھا جا نہ پہنچا ہو۔ شہر کے تمام خلیفوں نے اپنی ذات (Sab-cast) تبدیل کر لی۔ آبائی پیشہ ترک کیا اور تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو گئے۔ اب وہ موٹر گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ اُن کا کام کون کرے ______ ظاہر ہے دہلی والا، یو، پی والا اور وہ بھی من چاہی اونچی اُجرتوں پر۔ کیوں نہیں کشمیر جو شارجہ ہے۔ یہاں دلہن کو مہندی لگانے والے یا والی کی بکنگ چھ ماہ قبل ہزاروں روپے معاوضے کے عوض کی جاتی ہے اور وہ بھی باہر والا ہی ہوتا ہے۔

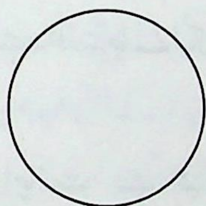
یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ میرا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ کسی کو پڑھنے، آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا حق نہیں۔ یہ صرف ایک جملہ معترضہ تھا کیونکہ بات یہ ہو رہی تھی کہ دساور سے کامگار کیوں ٹرانسپورٹ ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگ پیشہ ور ہو کر بھی اپنے پیشے سے کیوں مُنہ موڑ رہے ہیں۔ دراصل کشمیری کی سرشت ہی اب ایسی ہو گئی ہے کہ اُس کو باہر کی ادائیں ہی بھاتی ہیں۔ البتہ یہ بات غور طلب ہے کہ جب برتن مانجھنے کا سِکر پیر بھی باہر سے ہی آتا ہے تو پھر ایک

کشمیری کے لیے وادی میں کیا رہ جاتا ہے۔ کیونکہ حسب سابقہ اور حسب معمول یہاں باہر کے ہی لوگ ہر اعلیٰ و ادنیٰ کرسی پر بیٹھ کر کشمیریوں کی چھاتی پر مونگ دلتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ جموں کے افسر اعلیٰ جن کو جموں میں حکومت کرنی چاہیے تھی وہ بھی اسی کشمیری پر قہر بن کے ٹوٹ پڑے ہیں۔ اُس پر مستزاد اور بھی کئی ایسے مار ہیں جو آئے دن اُس کو سہنے پڑتے ہیں۔ کبھی بجلی کے نام پر، کبھی رسوئی گیس کے نام پر، کبھی پینے کے پانی کے نام پر، کبھی پولیس تھانوں اور عدالتوں کے چکر کاٹنے پر، کیونکہ اب یہود طرز عقوبت پر مار بچوں سے ہی شروع کی جاتی ہے اور حراستی گمشدگی اور بیلٹ فورس کی گولیوں سے ہلاکت سوا الگ، کشمیری ایک بور کا دِیا ہو کے رہ گیا ہے جس میں بتی ہے اور نہ تیل۔ یہ مالک ہو کر بھی ہمیشہ دوسروں کے ہی دست تطاول کے نیچے جیتا رہا ہے۔ اور نہ جانے ایسی صورت حال کب تک رہے گی۔ بقول سعید النسا حرماں ؎

نالہ کرنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

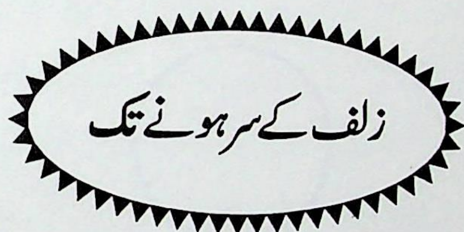
☆☆☆

(فروری ۲۰۱۳ء)



زلف کے سر ہونے تک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
(غالبؔ)


زلف کے سر ہونے تک

راجہ سیم دیو کی عہد حکومت میں ذوالقدر خان یا ذوالجو نامی ایک تاتاری نے کشمیر پر حملہ کر کے اِسے تخت وتاراج کر دیا۔ کشمیر میں گیارہ گھر باقی بچنے کی ضرب المثل یا تلمیح اُسی واقعہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس طرح سے سن ۱۳۰۵ء میں اصولی طور پر ہندو دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور رینچن نامی ایک تبّتی شہزادہ یا سیاح حکومت پر کسی طرح سے قابض ہو گیا۔ مذہب کے بارے میں اُسی کا اعتقاد ڈانواڈول تھا۔ ابھی وہ یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ کون سا مذہب اختیار کر کے اُسے ''راج دھرم'' ٹھہرائے کہ اِسی اثنا میں ایک صبح کو اُس نے ایک مسلمان صوفی بزرگ حضرت عبدالرحمٰن عرف بُلبل شاہ صاحب علیہ الرحمہٰ کو نماز پڑھتے دیکھا۔ یہ طرزِ عبادت اُس کو اپیل کر گئی اور سلطان صدرالدین کا نام اختیار کر کے حکومت کرنے لگا۔ صرف اڑھائی سال حکومت کرنے کے بعد اُس کی وفات ہوئی۔ اِسی دوران سابقہ ہندو راجہ سیم دیو کا بھائی ادھیان کہیں سے نمودار ہوا تو اُس نے کوٹا رانی سے مل کر حکومت پر قبضہ کر کے یکے بعد دیگرے کشمیر پر تقریباً سولہ سال راج کیا جب کہ سوات کے شاہ مرزا نے سن ۱۳۴۳ء میں شمس الدین کا لقب اختیار کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا سلطان سکندر سن ۱۳۹۴ء میں اور سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ ۱۴۱۷ء میں اور اُس کے بعد اُس کا بیٹا حاجی خان سن ۱۴۶۹ء میں بالترتیب تخت نشین ہوئے۔ موخر الذکر چونکہ عیاش اور ناکارہ تھا اس لیے مغربی کشمیر سے چکوں کو اُبھرنے کا موقعہ ملا، انہوں نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح سے سن ۱۵۵۴ء میں چکوں کا پہلا بادشاہ قاضی چک کشمیر کے تخت وتاج کا وارث بنا جب کہ اُس سے قبل سالہا سال تک افراتفری رہی اور کاٹھ کے شہزادے قلیل مدتی حکومت کرتے رہے اور عوام الناس سیاسی ریشہ دوانیوں

اور ظلم و جبر کی چکی میں پستے رہے۔

چکوں کی بیس سالہ حکومت یوسف شاہ چک کی اکبر بادشاہ کے ہاتھوں گرفتاری حبہ خاتون کی جدائی اور ولی عہد یعقوب شاہ چک کی ہزیمت کے ساتھ سن ۱۵۸۶ء میں اپنا بوریا بسترہ لپیٹ کر ختم ہوگئی اور یوسف شاہ چک بہار کے بسواک علاقے میں اپنے مہجور اور جلاوطنی کے شب روز گذار کر اپنی نسل، اپنا نام و نمود اور عصائے شاہی کو چٹیل سنگی ویرانوں میں دفن کر کے اکبر بادشاہ کی کوتاہ عقلی کا ماتم کرنے لگا کیونکہ نئی شریعت دین الٰہی کا موجد کوتاہ قد بادشاہ اُسے لاہور یا دہلی کے آس پاس بھی کسی جگہ بندی بنا کر رکھ سکتا تھا۔ اُسے بہار کے دور دراز سنگ زاروں میں جلاوطن کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ اس طرح سے سن ۱۵۸۷ میں مغلوں کا دورِ حکومت شروع ہوا جو مختلف گورنروں کی تعیناتی کے بعد سن ۱۷۵۳ء میں اختتام پذیر ہوا۔ سن ۱۷۵۴ء میں شاہان دُرانی یعنی افغانستان کی پٹھان حکومت جس کا پایہ تخت کابل میں تھا، کشمیر پر ستم ڈھانے کے لیے کشمیریوں کے سروں پر مسلط ہوگئے اور ظلم و جبر کی ایک وحشت ناک داستان رقم کرنے کے بعد انہوں نے سن ۱۸۱۴ء میں سکھوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

سکھوں کا پایہ تخت لاہور میں تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ صرف ایک آنکھ سے لاہور سے لے کر چماتھنگ اور کوہ مری سے لے کر چترال تک حکومت کی بھاگ ڈور سنبھالتے تھے۔ صرف ایک گورنر میاں سنگھ یا موہن سنگھ نے انصاف پسندی سے کام لے کر سکھاشاہی کی تلمیح قائم کی اور کشمیریوں کے لیے کچھ راحت کا سامان کیا ورنہ جتنے بھی بقیہ سکھ گورنر کشمیر میں تعینات ہوئے انہوں نے ظلم و ستم کی حد کر دی۔ مسجدوں کو بند کر دیا، اذان پر پابندی لگا دی، جامع مسجد کو چوبیس سال (۱۸۱۹ء۔۱۸۴۳) تک مقفل رکھا اور قحبہ خانوں کی بات ہی کیا غسل خانوں تک

ٹیکس لگایا، سکھ سپاہی جب ایک کشمیری کا تفریحاً قتل کیا کرتے تھے تو اُن پر بیس روپیہ جرمانہ عاید کیا جاتا تھا جو مختلف قسم کا کمیشن (رشوت) کی وصولیابی کے بعد ہندو لواحقین کو چار روپیہ اور مسلمان وارثان کو دو روپیہ ملتا تھا۔ بدیشی مؤرخین ہیوگل، ڈریو، ینگ ہسبنڈ، وائن اور لارنس وغیرہ کے مطابق سکھ کشمیریوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ڈھور ڈنگر سے کم تر گردانتے تھے۔ بقول وائن (Vigne) انہوں نے کشمیراز ینگ ہسبنڈ کو کوٹ کیا ہے:

اُس پُر رونق خوشحال اور جاہ وحشم کے بارے میں ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے جو بے رحم اور ظالم سکھوں کی حرص وہوس کی وجہ سے ملک سے رخصت ہو چکی ہے۔

اور کشمیر پر کچھ عرصہ قبل شائع شدہ تاریخ کی کتاب (My Frozen Turbulance in Kashmir) کے مصنف شری جگ موہن سابقہ گورنر ریاست جموں وکشمیر اور سابقہ ممبر پارلیمنٹ باجپا جنہوں نے ایمر جنسی کے دوران پرانی دہلی میں ترکمان گیٹ کے علاقے میں زندہ انسانوں کے اوپر بل ڈوزر چلا کر اور کشمیر میں قدم رنجہ فرماتے ہیں بچوں کا قتل عام کروا کر ایک دائمی شہرت (بدنامی) حاصل کر لی ہے۔ اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

پھلا سنگھ نامی ایک لوکل کمانڈر نے حضرت امیر کبیرؒ کی خانقاہ کو مسمار کرنے کے لیے ایک توپ باندھ کر رکھی تھی مگر بیربل در کی مداخلت سے یہ معاملہ ٹل گیا۔ سکھ کشمیریوں کو من حیث القوم ذلیل نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔

مہاراجہ رنجیت کی دوسری آنکھ بند ہونے کے ساتھ ہی کشمیر پر سکھوں کا استحصال ختم ہوا تو کشمیر کا سودا پیڑ پودوں، پہاڑوں، ندی نالوں، چرند و پرند، زمین و

جائیداد حتیٰ کہ ذی روح انسانوں کا بھی ڈوگروں کے ہاتھوں بیعہ نامہ امرتسر کے تحت سن ۱۸۴۶ء میں صرف ۷۵ لاکھ روپیہ میں ہوا تھا۔ تاریخ میں ایسا سودا یا دنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں ہوا ہوگا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ مال مویشی کی طرح انسان بھی بیچے اور خریدے گئے اور اس طرح سے پھر ایک بار غلام وہی رہے صرف مالک بدل گئے، ظلم وستم وہی رہے صرف طریقے بدل گئے، قتل وغارت وہی رہی صرف ہتھیار دوسرے آگئے، استحصال وہی رہا صرف محاصل نئے آگئے۔ تازیانے وہی رہے صرف مار دوسری طرح کی پڑنے لگی اور ایک کشمیری آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اگر وہ زرِ خرید غلام نہیں تھا پھر زر کے عوض کیوں فروخت ہوا۔ اور اس خرید وفروخت کا اختیار کس نے کس کو دیا تھا۔

سن ۱۸۴۶ء سے سن ۱۹۴۷ء تک ڈوگرہ دور حکومت نے پھر طبقاتی نظام حکومت کو جنم دیا۔ سو سال کی تاریخ پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر سکھوں نے مسلمانوں کو کم تر از بھیڑ بکری سمجھا تو ڈوگروں نے اُسے کتوں کے عوض فروخت کر دیا۔ یہ بات اس طرح سے جانی جاسکتی ہے کہ جب گاؤں کے مسلمانوں کو زبردستی بیگار پر گریز اور گلگت وغیرہ کے برف زاروں اور موت کے کریہہ المنظر مقامات پر پاؤں میں گھاس کے چپل ڈال کر ڈوگرہ سپاہیوں کے لیے رسد کا سامان لے کر بھیجا جاتا تھا تو برفیلے قبرستانوں سے کوئی زندہ لوٹ کر نہیں آتا تھا اگر اگر اتفاق سے کوئی زندہ بچ بھی جاتا تھا تو اُسے ڈوگرہ حاکم چینیوں کو چینی کتوں کے عوض فروخت کر دیتے تھے۔

(۲)

سن ۱۹۴۷ء میں جب کشمیر کو صدیوں کے بعد ایک خودمختار ریاست یا ملک مل سکتا تھا تو پھر وہی عمل دہرایا گیا۔ آگے کوتوال ڈوگرہ ہوتا تھا پھر کوتوال کشمیری ہو گیا۔ آگے مانو وریندر سنگھ سلاتھیا قہر الرجال بن کر برس پڑتا تھا پھر عبدالسلام بٹ بجلیاں گرانے لگا۔ ظلم و جبر، استحصال، قید و بند ایذارسائی، ٹک ٹکی اور بیگار سے جو لوگوں کے اجسام میں ڈھیلا پن، کس اور بل پڑ گئے تھے وہ کوتوال شہر نے استری پھیر کر دُرست کر دیے۔ سلوٹیں صاف ہو گئیں۔ بنیادی سطح اور جبر و استبداد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ غلام وہی رہے صرف نظام حکومت بدلا، منتظم بدلے، مالک بدلے اور راج بدل گیا۔ کشمیری مسلمان کو ایک غار سے نکال کر دوسرے کھوہ میں پھینکا گیا۔ پینسٹھ سال گذر گئے اس گہرے، کالے، تاریک کنویں میں سانپ اور بچھو اور دیگر حشرات الارض اُن کو ڈستے رہے ہیں۔ وہ مرتے رہے اور مر رہے ہیں مگر کوئی اُن کا والی وارث نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی دیکھنے سُننے والا نہیں ہے۔ منڈیروں پر کچھ لوگ اظہارِ ہمدردی کے لیے آتے ضرور ہیں مگر انہیں وہ سانپ اور بچھو پھنکار مار کر بھگا دیتے ہیں۔

معلوم تاریخ کے آئینے میں سابقہ سات صدیوں کا یہ تاریخ پس منظر اور مختصر سی رُوداد اس لیے قلم بند کی گئی تا کہ قارئین اندازہ کر سکیں کہ ایک کشمیری نے بالعموم اور ایک کشمیری مسلمان نے بالخصوص کبھی چین و راحت کی سانسیں نہیں لیں ہیں۔ ڈھور ڈنگر کی طرح بلکہ کیڑے مکوڑوں کے انداز میں لوگ ہمیشہ مرتے رہے، فنا ہوتے رہے، کبھی زلزلوں سے، کبھی سیلابوں سے کبھی قحط سالی سے اور کبھی ظلم و زبردستی سے، سر والٹر لارنس کے الفاظ میں:

''موجودہ صدی (اُنیسویں) میں چار خطرناک بھونچال آئے جن میں سے آخری دو ۱۸۶۴ء اور ۱۸۸۵ میں ظہور پذیر ہوئے۔ زیادہ تیز اور خطرناک جھٹکے سرینگر اور بارہمولہ میں محسوس کیے گئے۔ سن ۱۸۸۵ کا زلزلہ ۳۰رمئی کو آیا تھا اور جھٹکے ۶راگست تک محسوس کیے جاتے رہے۔ اسی زلزلے کی نذر تین ہزار پانچ سو لوگ شہید ہو گئے تھے''۔

مؤرخین نے کشمیر میں اُنیس ہولناک قحطوں جن میں دو موجودہ صدی (انیسویں) میں پڑے تھے۔ ایک سن ۱۸۳۱ء میں قحط شیر سنگھ نامی اور دوسرا ۱۸۷۷ء میں۔ ہوا یوں کہ بارشیں اکتوبر ۱۸۷۷ء سے جنوری ۱۸۷۸ء تک متواتر برستی رہیں جس وہ سے قحط پڑا اور کشمیر کی آبادی آٹھ لاکھ سے گھٹ کر صرف دو لاکھ رہ گئی۔ صرف شہر سرینگر کی آبادی ایک لاکھ ستائیس ہزار چار سو سے گھٹ کر صرف ساٹھ ہزار رہ گئی۔

خطرناک اور تیز بارشوں سے پھل والے درختوں کو بھی نقصان پہنچا اور بھوکے لوگوں نے سیب ناشپاتی کے شگوفے اور توت کے کچے پھل کھائے۔ اُسی پر بس نہیں ہوا۔ اُس کے بعد انہوں نے جھاڑیوں، دلدلوں اور درختوں کی جڑوں سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانا شروع کی جس سے طرح طرح کی بیماریوں کے شکار ہو کر وہ مرنے لگے۔ کتنا دلدوز نظارہ رہا ہوگا جب بے گور و کفن لاشیں، کونوں، کھدروں، جوہڑوں اور کنوؤں میں پڑی سڑتی رہی اور آوارہ کتوں کی خوب خوب ضیافت کا سامان مہیا ہوتا رہا۔ شہروں میں شال باف حد سے زیادہ اس وباء کے شکار ہوئے اور یہاں یہ بات بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اہل ہنود فاقوں کے کم ہی شکار ہو گئے تھے۔ (ویلی از ڈبلیو ایچ لارنس ؔ)

آج سے بتیس چونتیس سال قبل پروفیسر نیپال سنگھ سابق سیکریٹری، مسٹر جے فریرا سابق اکیڈمک آفیسر اور مسٹر کے شرما سابق چیف اکاؤنٹنٹ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن بھوپال مدھیہ پردیش کے ساتھ میری ملاقات گلمرگ میں ہوئی۔ جب ذرا بے تکلفی ہوئی تو مذکورہ پروفیسر صاحب نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں ایک چبھتا ہوا سوال جھاڑ دیا، کہ کشمیریوں کو جھوٹا، دروغ گو سمجھا جاتا رہا ہے، یہ کس حد تک صحیح ہے اور اس بارے میں میری کیا رائے ہے۔ آئیں بائیں، شائیں کے بغیر میں نے سپاٹ لہجے میں کہا کہ ایسا سو فی درست ہے۔ یہ دوٹوک، برجستہ اور خلاف توقع جواب سن کر موصوف حیران رہ گیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا کہ کہیں میں مذاق تو نہیں کر رہا ہوں اور پھر میں نے اپنے جواب کی توضیح کی۔ میں نے لارنس کی کتاب ویلی (جس کا تذکرہ آگے ہی کر چکا ہوں) سے ایک حوالہ دیا جس میں مورخ یوں رقم طراز ہے:

''ایک کشمیری کو ضعیف الاعتقادی نے ڈرپوک، جبر واستبداد نے جھوٹا دروغ گو جب کہ آفاتِ سماوی نے خودغرضی اور شقی القلب بنا دیا ہے''۔

دوسری ایک جگہ فرماتے ہیں:

''کشمیری وہی کچھ ہے جو اُسے اُس کے حکمرانوں نے بنا دیا ہے''۔

یقیناً ساری بات، ساری تاریخ، سارے مفروضات اور سارے اعتراضات والزامات کی تفسیر اسی ایک جملے میں ہے۔ یہ فقط ایک جملہ ہی نہیں پوری ایک داستان ہے۔ پوری ایک تاریخ ہے۔ عزت و بے چارگی کی، افلاس و درماندگی کی، ظلم واستحصال کی، ٹیس اور رستے ناسوروں کی، آہ و بقا اور آنسوؤں کی، کسک و کراہ کی، کرب و بلا کی اور اُس کشمیری مسلمان کی جو اس زمانے میں بھی لالٹین اور شمع جلا کر اپنے بچوں کے اُترے چہرے دیکھتا ہے کہ وہ ہوم ورک کرنے کی سراسیمگی

میں ہیں جب کہ چاند پر جانے کے لیے ٹکٹوں کی بکنگ شروع ہونے والی ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت جس کی بھی رہی ہو مگر ہر دور میں یہی کشمیری مسلمان دست تطاول کا شکار رہا ہے۔ اُس کے برعکس کشمیر پر مہا بھارت کے زمانے سے ہندوؤں کی حکومت رہی، بڈ شاہ کے دور حکومت میں انہوں نے فارسی پڑھی تو نہ صرف حکومت کے کارکن کہلائے بلکہ اُمراء اور وزراء بھی ہو گئے۔ سکھوں کے دور حکومت میں اُن کی بہت بہتر پوزیشن تھی اور حکومت میں رسائی تھی اور پھر ڈوگرہ حکومت کے سو سال میں ڈوگرے برائے نام حکومت کرتے تھے جب کہ اصلی حکمران کشمیری پنڈت ہی تھے۔ سرکاری عہدوں کے علاوہ اُن کے پاس زمینیں تھیں، جاگیریں تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب ایک خط پڑھوانے کا معاوضہ ایک کشمیری پنڈت مسلمان سے ایک دن کی مزدوری لیتا تھا اور خط لکھوانے کی صورت میں خط پوسٹ بکس میں مسلمان ہی ڈالتا تھا مگر وہ پنڈت جی کے کسی رشتہ دار کے نام ہوتا تھا اور لکھوانے والے کے ساتھ کمال امروہی والا معاملہ ہی پیش آتا تھا کہ۔

برسوں جوابِ یار کا
دیکھا کیے ہم راستہ

بات کو یوں بھی ایک چھوٹی سے مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ جب ۱۸۷۷ء کے قحطِ عظیم میں چھ لاکھ مسلمان لقمہ اجل بن گئے (بلکہ اجل کے بعد لقمہ سگ بھی بن گئے) تو دو سال کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ نے عظیم جانی نقصان کے بارے میں کم و بیش سُنا تو اُسے صدمہ ہوا ورنہ اُسے قحط سالی سے ہوئے اموات کے بارے میں کانوں میں بھنک تک پڑنے نہیں دی گئی تھی۔ علی الرغم اُسے بتایا گیا کہ بھوک سے رعایا میں کوئی ہلاک نہیں ہوا تھا۔

(۳)

یہاں یہ سوال بھی سر اُبھارتا ہے کہ جب دنیا بھر کی قومیں، نسلیں، لوگ اور ملک آزادی کے حقدار ہیں یا آزادرہ کر دنیا میں جی رہے اپنے پیدائشی حق کا خاطر خواہ استعمال کر رہے ہیں تو پھر یہی ایک قوم کیوں ہمیشہ سے یا کم از کم سابقہ سات صدیوں سے غلاموں کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ نہ اس کی اپنی شناخت ہے، نہ عزت نفس ہے۔ وہ ریاست سے باہر جاتا ہے تو اُسے مختلف ملک دشمن معاملات میں پھنسا کر جیلوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اُس کے بہو بیٹیوں کی عزت وعصمت اپنے گھر میں بھی سلامت نہیں ہے۔ ورنہ آج تک دنیا میں کس دولہے کو شادی کے منڈپ سے اُٹھا کر بیگار پر برفیلے صحراؤں میں، اونچی پہاڑ چوٹیوں کے ساتھ نبرد آزمائی کے لیے بھیجا گیا ہو۔ اُس ک بعد اُن دولہا دلہن کا ملن پھر کبھی نہیں ہوا۔ ایک یورپین مصنفہ کا کہنا ہے کہ میں نے کشمیر کے ایک دیہات میں بہار کے دنوں میں ایک بوڑھی عورت کو اپنے کھیت میں ہل چلاتے دیکھا، وہ براہ کے گیت گا رہی تھی اور اپنے دولہے کے انتظار میں ایک موہوم اور نا آسودہ امید کے سہارے آسمان کی وسعتوں کی طرف دیکھ کر شاید کاتب تقدیر سے گلہ کر رہی تھی جس کے بندوں نے منڈپ میں ہی اُس کا دولہا اُس سے جُدا کر دیا تھا۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ کن لوگوں کو آج تک کتوں کے عوض بیچا گیا، اس میں شک نہیں کہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ، سائنس وٹیکنالوجی کے عروج کے عوض جب ساری دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے، اس صدیوں کے غلام ابنِ غلام کے گلے میں بھی تعلیم وترقی کا جُواپڑا ہے مگر اُس کا جسم آزاد ہے، نہ روح، جسمانی غذا وافر مقدار میں مہیا ہے مگر روحانی غذا عنقا ہے، لذت نفس ہے مگر لذت ذہن

میسر نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہی بات ہوگئی کہ

ذرا اپنا ذوقِ اسیری تو دیکھو
چمن بیچ کر ہم قفس مول لائے

اس لیے اب جب کہ دنیا میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلاب آچکا ہے، سوچ اور اپروچ میں تبدیلی آ چکی ہے۔ تمام بنی نوع انسان کو مقدم، معزز اور اشرف سمجھا جانے لگا ہے۔ افریقہ کو ایک زمانے میں تاریک براعظم کہا جاتا تھا۔ وہاں تمدن و تہذیب کا سایہ تک نہ پڑا تھا۔ لوگ ننگ دھڑنگ پھرا کرتے تھے اور جانوروں کی طرح جانوروں کا شکار کر کے کچا گوشت چباتے تھے۔ آج وہاں کے لوگ بھی تہذیب یافتہ دنیا کا حصہ بن چکے ہیں۔ آج افریقہ میں بیسیوں آزاد ریاستیں اور آزاد ملک ہیں۔ آج اُن بے انتہا پچھڑے ہوئے غیر متمدن اور حیوان نما انسانوں کی بھی اپنی حکومتیں ہیں، اپنے راج ہیں۔ آج وہ بھی آزادی کا مفہوم سمجھ چکے ہیں جن کو یورپین ڈھور ڈنگر کی طرح ہانک کر اور پکڑ کر غلاموں کی منڈیوں میں بیچا کرتے تھے۔ آج وہی غلاموں کے سوداگر اُنہی سابقہ غلاموں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر امداد باہمی کے ایگریمنٹ اور اقرار نامے سائن کرتے ہیں۔ اس لیے حالات اِسی بات کے متقاضی ہیں کہ وادی کے اس غلام کو بھی آزادی کا تحفہ ملنا چاہیے۔ ایک ایسی آزادی نہیں جو بیڑیاں اُتار پھینکی اور جُوا گلے میں ڈال دیا، اختلاف کا جُوا، پارٹی بازی کا جُوا، ایک دوسرے کا گریبان پکڑنے کا جُوا، مطلب براری اور اقربا پروری کا جُوا ______ نہیں بلکہ ایسی آزادی جو اپنی حکومت کی نعمت سے بھی ہمکنار کرے۔ ایک ایسی مبنی بر انصاف حکومت جو لوگوں کی، لوگوں سے اور لوگوں کے لیے ہو، ایک خود مختار حکومت۔ اپنا ملک، اپنی حکومت، اپنا ودِھان، اپنا پردھان اور اپنا نشان ______ مملکت جموں و کشمیر

تبت ہا______ہاں!

مجوزہ حکومت میں حسبِ معمول اور حسبِ سابقہ دساور سے لوگ آ کر کشمیریوں کے قضاء وقدر نہ بنیں۔ موجودہ حالات کیا ہیں، سب کو معلوم ہے مگر ڈنڈے اتنے سخت پڑے ہیں کہ کوئی اُف تک کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ہاں! زخم سہلانے کے لیے لوگوں کو ڈھیر سارے اور کئی طرح کے قرضے مل رہے ہیں جن سے وہ موٹر کاریں خرید کر ''ہر فکر کو دھویں میں'' اڑا دیتے ہیں اور اس بات پر کبھی غور نہیں کرتے کہ موٹر کار کے ساتھ گھر بھی رہن ہو گیا۔ گویا اپنا کیا ہے، کچھ بھی نہیں______جو کبھی تھا بھی نہیں۔ باہر کے لوگ یہاں بیسیوں پُر فضا مقامات کے علاوہ زبرون پہاڑی کے دامنوں میں پری محل کے قریب پریوں کے مست و مخمور نغموں سے اپنے اہل وعیال اور رشتہ داروں کے ساتھ سرشار ہوتے رہتے ہیں اور مالک کشمیری اُن کوٹھیوں اور بنگلوں میں صرف پونچھا مارتے ہیں اور جھاڑو پھیرتے رہتے ہیں۔ بس اتنی سی مالکانہ حیثیت ہے اُن کی۔ شاہی چشمے کا صحت بخش پانی ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچ جاتا ہے مگر کشمیری قطروں کے لیے ترستا رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ''اپنے تو اپنے ہوتے ہیں'' مگر ہمارے اپنے کہاں ہیں؟۔

بہر حال دوستوں کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ ہمارے سارے پڑوسی دیشوں کے ہمارے ساتھ دوستانہ مراسم برقرار رہیں گے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کا تعاون درکار ہوگا جو برقرار رہنا لازم وملزوم ہے۔ آج کل کے سائنس و ٹیکنالوجی کے دور میں اس کے بنا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ رہی کسی اور ملک کے ساتھ اپنی قسمت جوڑنے کی بات جسے عام بول چال میں الحاق کہا جاتا ہے، اُس عمل کے لیے اب وقت نکل چکا ہے۔ یوں تو ہمارا الحاق معنوی اعتبار سے ہر ایک

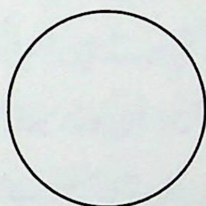
ملک اور خاص طور پر پڑوسی ملکوں کے ساتھ ہونا ضروری ہے مگر عملی طور پر اپنے ملک کی سالمیت اور انفرادیت برقرار رہنی چاہیے۔ آج کل کے زمانے میں ملکوں میں انقلاب بپا ہو رہے ہیں، ملکوں میں نئی ریاستیں اور ریاستیں خود مختار ملکوں میں تبدیل ہو رہی ہیں کیونکہ آدمی بے حد آزادی پسند ہو گیا ہے۔ جو حقیقی معنوں میں اُس کا بشری اور پیدائشی حق ہے۔ ایک وقت تھا جب حکومت برطانیہ کے راج پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایک طرف غیر معتمدن افریقن دوسری جانب ترقی یافتہ یورپین اور تیسری طرف ترقی پذیر مشرق اور مشرق وسطیٰ کے ممالک اُن کی حکومت میں شامل تھے۔ نہ ہوتے تو آج فلسطین ______ اسرائیل کا مسئلہ نہ ہوتا کیونکہ برطانیہ نے ہی یہودیوں کو ہوم لینڈ دینے کا وعدہ کیا تھا اور بالفورڈ کی دورِ حکومت میں جنگ عظیم دوم کے ختم ہوتے ہیں اسرائیل کی نیب عرب سرزمین پر، عربوں سے زبردستی زمین ہتھیا کر اور اُن کو مار بھگا کر ڈالی گئی۔ مگر آج کیا حالت ہے؟ آج ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ میں جو سیاسی منصوبے معرضِ وجود میں آتے ہیں اُن کا اطلاق سکاٹ لینڈ کی سرحدوں تک ہی محدود رہتا ہے۔

موجودہ دور میں کمیونزم کے چھکے چھوٹ چکے ہیں۔ روس کی زبوں حالی تو دنیا نے دیکھی۔ یہ وہی روس ہے جو افغانستان سے شکست کا ذلت بھرا داغ لے کر لوٹا مگر اسی روس نے انقلاب ۱۹۱۷ء میں مسلمانوں کا قتل عام کر کے دیگر تعداد کے علاوہ چوبیس ہزار حافظ قرآن شہید کر دیے۔ کوہ قاف کی ان دیکھی اور ان چھوئی سرحدوں سے شجر ممنوع جیسی زمینوں سے، پریوں کے گلستانوں سے، شہزادوں کے بوستانوں سے، کمیونزم کے مرقدوں سے، یورپ کے جگر سے اور ایشیاء کے دل سے کئی مسلم اور دیگر ریاستیں اور ممالک پھوٹ چکے ہیں۔ آج انسان نے کمپیوٹر نیٹ ورک کے ذریعے گلوب کے رگ و ریشے کو سکیڑ کر اپنی مٹھی میں بند کر دیا

ہے۔اس لیے اب آزادی کا مطلب صرف آزادی ہوتا ہے۔آج مطلق اللعنان بادشاہوں کی نیندیں اڑ چکی ہیں، انسانیت کے قاتل سراسیمہ اور خوفزدہ ہیں۔ فرعون جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔آج ''نقش باطل'' مٹ رہے ہیں اور نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ بہرحال دیکھیے کہ کیا ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری آہ بھی اثر کر جائے اور زلف سر ہو ہی جائے اور ہم بھی کسی وقت غلامی کا یہ جُوا اُتار کر پھینکنے کے قابل ہوسکیں اور آزاد فضاؤں میں آزادی کی سانسیں لے سکیں۔

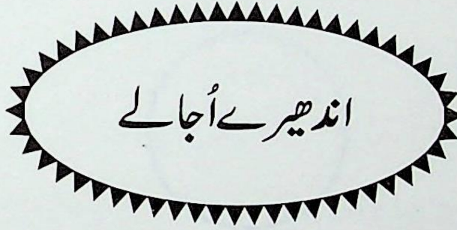


(فروری ۲۰۱۳ء)



اندھیرے اُجالے

کس نے ذروں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا
کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
(ہری چند اختر)


اندھیرے اُجالے

حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب، آئینِ کائنات یا کتاب اللہ میں سورہ صف میں ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے:

اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا، اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ اُس کی تصدیق کرتا ہوں جو میرے سامنے تورات میں سے ہے اور ایک رسول کی خوش خبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا، اُس کا نام احمد ہے۔ سو جب وہ اُن کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ صریح جادو ہے۔ (سورہ صف۔٦)

اگر یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات سے انکار کر دیا تو انہوں نے اپنے طور سے صحیح کیا کیونکہ ایسا اُن کا شیوہ ہے۔ اُس سے قبل بھی ہزاروں برسوں تک انہوں ے پیغمبروں کو جھٹلایا تھا______ قتل کیا تھا۔ پیغمبر زادوں کو ملک بدر کیا تھا۔ جلیل قدر پیغمبر حضرت لوطؑ اور حضرت داوٗد علیہ السلام پر بدکرداری کے الزامات لگائے تھے اور خود اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی بے انتہا آزمائشوں میں ڈال کر اُن کو تکلیفیں پہنچائی تھی اور بار بار تنگ کیا تھا۔ یہی وہ قوم ہے جس کو پیغمبروں نے بد دعائیں دیں۔ ایک ناشکر گذار دُھتکاری ہوئی بے حیا قوم سے اور کیا متوقع ہوسکتا ہے۔ اور وہی حالت جو اُن کی صدیوں پہلے تھی آج بھی ہے بلکہ اب کے خباثت کچھ زیادہ ہی عروج پر ہیں۔ انسانوں کے قاتلوں کے سامنے مرد عورت، بوڑھوں بچوں میں کوئی امتیاز نہیں، وہ صرف بہتا ہوا انسانی خون دیکھ کر ہی آسودگی پا لیتے ہیں۔ آگ و آہن ہی اُن کا ایجنڈا ہے۔

بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی بات مانی، اُن پر ایمان لایا اُن کے ناصر و حواری ہو گئے اُن کو تو اپنے پیغمبروں کی بات ماننی چاہیے تھی مگر انہوں نے بھی حق بات سے انکار کیا کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ بات قرآن شریف میں

مرقوم تھی جس کو اپنی تنگ نظری کی وجہ سے انہوں نے الہامی کتاب یا صحیفہ آسمانی ماننے سے ہی انکار کیا تھا تو عیاں ہے کہ اُس میں درج کوئی بات یا بشارت کیسے قبول کر لیتے جو اُن کے مطلب کی نہ ہوتی۔ اپنے تحریف شُدہ غیر مصدقہ صحائف کا تو وہ دم بھرتے ہیں لیکن ''لاریب'' اور ''انا لحٰفظون'' سندات رکھنے والے فرقان مجید سے وہ آنکھیں چراتے ہیں بلکہ اُس کے ساتھ گستاخانہ رویہ بھی رکھتے ہیں۔

اب جہاں تک اُن کی اپنی مذہبی کتب کا تعلق ہے جو پرانے اور نئے عہد ناموں (Old and New Testaments) پر مشتمل ہیں، یعنی تورات، زبور، انجیل، وہ جیسے کہ مذکور ہو چکا ہے سب تحریف شدہ ہیں اور اُن میں وقت پر من چاہی تبدیلیاں کر دی گئیں ہیں، خصوصاً اُن آیات میں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد، صفات، شکل وشمائل، عروجِ اسلام، اصحابِ رسول، خانہ کعبہ کا ذکر آتا ہے۔ حقیقی معنوں میں وہ صحائف فقط کاغذ کے پھول بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن بقول قرآن مجید ''پھر بھی اُن میں کچھ صداقت ہے''۔ کیونکہ یہ ممکن نہ تھا کہ صحائف میں سو فی صد تبدیلی کی جاتی۔ آیئے ذرا دیکھتے ہیں کہ اُن تحریف و تنسیخ شدہ صحائف میں تحریف کے باوجود ہمیں کس طرح کی آیات ملتی ہیں۔ کم از کم یہ ہم نہیں کہتے بلکہ یہ اُن کی اپنی آکاش وانی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

> اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہیں کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ بھی نہیں ہے۔ (یوحنا: ۱۴۔۳۰)

دنیا کے سردار تو یقیناً خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوئے جنہیں کافۃ للناس یعنی اگلوں اور پچھلوں سب کا ہادی اور پیغمبر کہا گیا ہے۔ حتیٰ کہ جو اُن کی بعثت سے پہلے کے لوگ تھے اور جو قیامت تک پیدا ہوں گے، سب کے لیے وہ ہادی اور رحمت، رحمۃ للعالمین ہیں۔ جنہیں معراج کرایا گیا اور معراج سے قبل اُن سے تمام

انبیاء کی امامت کرائی گئی۔ ''مجھ میں اُن کا کچھ نہیں ہے''۔ نسبت کیسے ہوتی یا ہو سکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک عصر کے رسول تھے جب کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سید الاولین و آخرین ہیں، ہادی ہیں، بشیر اور نذیر، کافۃً للناس، رحمۃ للعالمین پیغمبر آخر الزمان، ختم المرسلین، پیغمبر بحر و بر، رسول اسود و احمر شافیٔ محشر اور ساقیٔ کوثر ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) .... کیا تُو وہ نبی ہے (یوحنا ۱۔۲۱)

ابتدائے آفرینش سے ہی سابقہ امتوں میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیش گوئیاں چلی آ رہی تھیں کیونکہ بقول قرآن شریف تخلیق آدم سے قبل ہی تمام پیغمبروں سے روحانی طور پر یوم میثاق پر اس بات کا اقرار لیا گیا تھا کہ اگر اُن کے دور نبوت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو اُن کو اپنی نبوت سے دست بردار ہو کر اُن کی ہی اتباع کرنی ہوگی۔ ایسا تو ہوتا نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وقت پر مبعوث ہونا تھا۔ ایسا اُن کی کبریائی، عظمت و حشمت اُجاگر کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس طرح ان حالات میں جب انتظاری کیفیت حد سے زیادہ دراز ہو گئی اور لوگ یگ یگ سے اُن کے لیے آنکھیں بچھائے رہے تو پھر امتوں نے نام مبارک لینا چھوڑ دیا اور صرف وہ نبی کہتے رہے، جس کا پیارا ترجمہ جناب ذات بابرکت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہو گیا ہے۔ اُن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہلایا جانا یونہی نہیں تھا اُس کی ایک بیک گراؤنڈ تھی۔ ملاحظہ فرمائیے کہ انجیل کیا کہتی ہے:

لیکن جب وہ روحِ حق آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے وہ
اپنی طرف سے نہیں کہے گا لیکن جو کچھ سُنے گا وہی کہے گا۔ (یوحنا: ۱۶۔۱۳)

اس پر کچھ کہنا یا تبصرہ کرنے کی حاجت ہی نہیں ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی قرآنی آیت کریمہ سے معاملہ صاف ہو جاتا ہے:

اِنمَا انَّا بشرٌ مِثلُکُم یُوحیٰ اِلَیَّ (میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں صرف مجھ پر وحی آتی ہے، یعنی میں وہی کہتا ہوں جو رب کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے)

آگے دیکھیے کہ انجیل میں تحریف کے باوجود کیا مرقوم ہے:

تمہارے درمیان ایک شخص کھڑا ہے جسے تم نہیں جانتے یعنی میرے بعد کا آنے والا جس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے میں لائق نہیں۔ (یوحنا ۱۔۲۷)

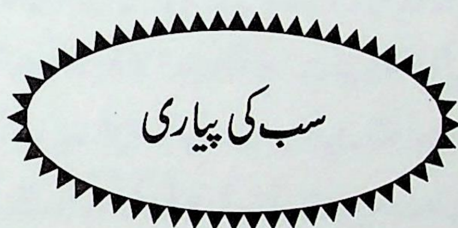
حضرت یحییٰ علیہ السلام کے اس ارشاد پر کسی تبصرے کی حاجت نہیں کیونکہ یہ اور بھی خود وضاحتی ہے۔ یعنی من بعد یعنی میرے بعد کا آنے والا۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا۔ دوسرے اس میں عجز وانکسار اور کسرِ نفسی ہے۔ ایک جلیل القدر پیغمبر خود ہی فرماتے ہیں کہ میں اُس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں۔ اور یہ بھی ظاہر بات ہے پیغمبر خدا کا عجز وانکسار کسی خاص الخاص شخصیت کے لیے ہی ہوسکتا ہے جس کے لیے خود ہی فرمایا کہ ''ایک تو وہ میرے بعد آنے والے ہیں اور دوسرے میں اُس کی جوتی کی تسمہ کھولنے کے لائق نہیں''۔ اب نصاریٰ اس پیشن گوئی کو کسی دوسرے کے ساتھ منسوب کرتے مگر اُس کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نام نامی کی بشارت سُنا کر معاملے کو قبل از وقت ہی صاف کر دیا تھا۔

اپنی مذہبی کتابوں یا آسمانی صحایف میں مرقوم حقائق کو نظر میں رکھ کر کسی انکار، حُجت یا دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ کیونکہ اندھیرے اُجالے آپس میں کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ پھر بھی متعلقہ لوگ اگر اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر اڑے رہتے ہیں تو اُس میں اُن کا اپنا ہی نقصان ہے کیونکہ روشنی کی موجودگی میں اندھیروں میں بھٹکنا صرف تنگ نظری، تعصب اور جہالت ہے اور اُس میں دونوں جہانوں کے خسارے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ **وما علینا الا البلاغ** ☆☆☆

سب کی پیاری

سر پر کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے
شادماں شادماں رہی اُردو
جس قدر کی گئی نظر انداز
اُس قدر سخت جان رہی اُردو

(تنویرؔ)


سب کی پیاری

کاہنوں اور نجومیوں نے فرعونِ مصر کو اِس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے فلاں دن ایک بچہ پیدا ہوگا جواُس کی سلطنت اور تخت وتاج کے لیے وِناشک ثابت ہوگا۔ شخصی راج تھا، بادشاہ مطلق العنان تھا، آناًفاناً حکم نافذ ہوا۔ چونکہ مخصوص بچے کی نشاندہی ممکن نہ تھی اس لیے اُس تاریخ پر جتنی بھی نرینہ اولاد پیدا ہوئی، اُن سب کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کا حکم صادر ہوا______ دیر کس بات کی تھی فوراً ہی حکم کی تعمیل ہوئی۔ معصوم بے زبان بچے گاجر مولی کی طرح کٹ گئے اور بے بس والدین بس دیکھتے رہ گئے۔ آنسو بہاتے رہے اور خاموش گریہ زاری کرتے رہے۔

قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ جو کچھ لوحِ محفوظ پر دستِ قدرت سے رقم ہو چکا تھا وہی ہونے جا رہا تھا۔ وہی بچہ جسے فرعون کی فرعونیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینی تھی، پانی میں بہہ کر آتا ہے، فرعون کے محل میں پہنچ جاتا ہے اور اُس کی پرورش اس طرح سے محل میں ہو جاتی ہے کہ وہ فرعون کا بھی چہیتا بن بیٹھتا ہے بلکہ فرعون کی ہی گود میں پلتا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد سارے ہندوستان میں متعصب رجعت پسند گُٹوں، پنتھوں اور سنگھٹنوں نے مل کر کتنے جتن کیے، کتنی کوششیں کیں، کیا کیا حربے استعمال کیے کہ اُردو زبان کو ہندوستان سے دیس بدر کیا جائے مگر وہ اپنی مذموم کوششوں میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اُردو اسکولوں کو بند کر دیا گیا۔ مسلم تنظیموں کے زیرِ انتظام چلنے والے اسکولوں اور مدرسوں کا گرانٹ روکا گیا۔ نصاب میں تحریف کی گئی۔ دفتروں سے سرکیولر اُردو میں آنے کے بجائے ہندی میں آنے لگے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام میں ''مسلم'' حذف کروانے کے لیے ایڑی

چوٹی کا زور لگایا گیا۔ مردم شماری کے اعداد و شمار کا غلط اندراج کیا گیا۔ دفتروں اور ریلوے اسٹیشنوں کے نام ہندی میں لکھے گئے اور ریڈیو، ٹی، وی میں اسے پس پشت ڈالا گیا۔ حالانکہ اُس وقت وہ یہ بات بھول گئے کہ اُردو ہی نسیمؔ، چکسبتؔ، سرشارؔ، عرشؔ، مُلاؔ، فراقؔ، رازؔ، دلؔ، خمارؔ، محرومؔ، آزادؔ کے ساتھ ساتھ مالک رام آننؔد، کشمیری لال ذاکرؔ، ہری چند اخترؔ، گیان چند جینؔ، شام لال کالڑا، ڈاکٹر منوہر سہاے انورؔ، پرکاش ناتھ پرویزؔ، پیارے لال رونقؔ، پچھمن داس شایقؔ، نوبترائے نظرؔ، دیانرائن نگمؔ، مہاراجہ کشن پرسادؔ، تیج بہادر سپروؔ، میلا رام وفاؔ، گلزار دہلویؔ، کرشن چندرؔ، پریم چند، دیوندر اسرؔ، مہندر ناتھ وغیرہ کے علاوہ اُن کروڑوں بھارتیوں کی بھی زبان تھی اور ہے جو نہ صرف گھر اور باہر روزمرہ میں اُسے برتتے ہیں بلکہ سینکڑوں غیر مسلم اس میں طبع آزمائی بھی کرتے ہیں۔ اسے مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کرنا حق وانصاف کے منافی ہے۔ آج بھی ہر سال غیر مسلم شعراء وادباء کے ترتیب دیتے ہوئے بیسیوں شعری مجموعے اور کئی نثر پارے منصۂ شہود پر آتے ہیں۔

میں مکرر عرض کروں گا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ممبئی کے شیوسینک گڑھ میں فلمیں بنتی ہیں اور ایک سال میں دس بیس نہیں دو چار سو ہندی سرٹیفکٹ والی فلمیں بنتی ہیں جس کے ڈائیلاگ اور گانے ٹھیٹ اُردو کے ہوتے ہیں۔ اسی راج ٹھاکرے کی نگری میں مشہور و معروف آسمانِ اُردو کے چاند ستاروں کی پذیرائی بھی ہوئی اور حوصلہ افزائی بھی۔ مختلف شہروں اور قصبوں سے بڑے بڑے شعراء اور ادباء ممبئی نگری کے باسی بنے، کچھ عارضی طور اور کچھ مستقلاً۔ بہزادؔ لکھنوی، نورؔ لکھنوی، آرزوؔ لکھنوی، سعادت حسن منٹوؔ، خمارؔ بارہ بنکوی، ساحرؔ لدھیانوی، اسدؔ بھوپالی، ایس ایچ بہاری، کیفیؔ اعظمی، عصمت چغتائیؔ، کرشن چندر، سردار جعفریؔ، جانثار اخترؔ،

اختر الایمانؔ، حسن کمالؔ، شہر یارؔ، خواجہ احمد عباسؔ، مجروحؔ سلطان پوری، اسرار الحق مجازؔ، ندا فاضلیؔ، حسرتؔ جے پوری، ابراہیم اشکؔ وغیرہ مقبول عام فنکاروں سے جتنی خدمت اُردو زبان کی فلموں کے ذریعے سے ہوئی اتنی ہزار سال میں ہزاروں سکولوں اور کالجوں میں پڑھانے سے بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ آج ریڈیو یا دور درشن پر کوئی فلمی گانا آتا ہے اور دوسرے دن گلی، محلے، ٹی سٹال، بازاروں اور درس گاہوں میں نوجوان وہ گانا گنگنا رہے ہوتے ہیں۔ مشاہدے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ لکچر، اخبار یا کتاب ایک انسان کے ذہن پر اس قدر اثر انداز نہیں ہوتی جتنا ایک سکرین، پردہ سیمیں یا دور درشن (ٹی وی) کا ٹیوب ہوتا ہے اُس کا ثبوت یوں بھی دیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی مراحل میں روس نے اپنائی، وی جب درس وتدریس کے لیے استعمال کیا تو روسی اپنے مقصد میں سوفیصد کامیاب رہے۔

عصر حاضر میں ہر سال تقریباً دوسو تامل زبان میں بنی فلموں کو ہندی زبان میں ڈھب کیا جاتا ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اُن تمام فلموں کے گانے ٹھیٹ اُردو زبان کے ہوتے ہیں جن کے تخلیق کار اُردو زبان کے ہی چاند ستارے جیسے سمیرؔ، نواب آرزوؔ اور ابراہیم اشکؔ وغیرہ ہوتے ہیں۔

آج مردم شماری کے جدولوں میں خانہ پُری کرتے وقت لوگ اپنی مادری زبان بے شک ہندی لکھواتے ہیں مگر عملی صورت میں بولتے اُردو ہی ہیں۔ آج شمال میں ژرنگ ڈورجے جو گانا گنگناتا ہے وہی گانا جنوب میں آنند کمار اسوامی بھی گنگنا رہا ہوتا ہے۔ اُسی گانے سے مشرق میں سوموپٹ نائیک لطف اندوز ہوتا ہے اور اُسی گانے سے مغرب میں دینو بھائی شاہ حظ اٹھاتا ہے اور وہ ایک فلمی گانا ہوتا ہے جو خالص اُردو زبان کا ہوتا ہے، اُردو زبان میں ہوتا ہے، کیوں نہ ہو

شہد و شکر سے شیریں ، اُردو زبان ہماری

کشمیر سے دکن تک ، برما سے کابل
سب کی زبان پر ہے ، اُردو زبان ہماری

فلموں کے علاوہ ٹی ،وی سیریلز میں ایسی اصطلاحات اور محاورات کا استعمال بے محابا کیا جاتا ہے جو خالص اُردو زبان کے ساتھ وابستہ ہیں۔سائنس کا ایک اصول ہے کہ جتنی زور سے آپ بال کو دیوار پر ماریں گے، اتنی ہی زور سے دیوار اُس بال کو ری باونڈ کرے گا۔اسی طرح ہماری پیاری اور میٹھی زبان کو دور لے جانے کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں اتنی ہی زیادہ وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی چلی گئی۔آج کل کے دور میں تحقیق وتالیف اور نشر واشاعت کا کام اتنا بھارت میں نہیں ہوتا جتنا یورپی ممالک میں ہوتا ہے اور آئے دن زبان وادب پر بیسوں کتابیں چھپتی ہیں۔آج کل سارے مشرق وسطیٰ اور یورپ میں مشاعرے ہوتے ہیں اور کتابیں تیار ہوتی ہیں اور دنیا کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے ملک کی یونیورسٹی میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔

حیران کن بات یہ ہے کہ چین میں بھی اُردو نے اپنے قدم جمائے ہیں۔ چیانگ سی ایک چینی اُردو شاعر ہیں۔کسی ماہر اُردو اہلِ زبان کی طرح اُردو لکھتے ہیں، پڑھتے ہیں اور بولتے ہیں۔اتنا ہی نہیں بلکہ اساتذہ کی طرح اُردو میں شاعری بھی کرتے ہیں۔لیجیے تفننِ طبع کی خاطر اُن کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے

چیانگ سی کو تو چوانگ سو مت کہہ
بات سچ ہے پر روبرو مت کہہ

خیالِ مردِ مومن ، سوزِ غالب ، فکر مودودی
مرا محبوب ہے اُردو ادب نیچے سے اوپر تک

حالات کی کرشمہ سازیاں دیکھیے جو لوگ اُردو زبان کو دیس نکالا دکھانا چاہتے

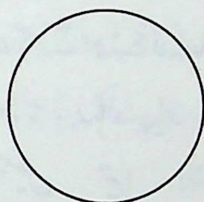
تھے وہی آج اسے مختلف ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے پر آمادہ ہیں۔ کچھ ریاستی سرکاریں اس بارے یں پیش رفت کر چکی ہیں جب کہ دہلی کی ریاستی سرکار نے پنجابی کے ساتھ ساتھ اُردو کو بھی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ بقول تنویر صاحب

سر پر کانٹوں کا تاج پہنے ہوئے
شادماں شادماں رہی اُردو
جس قدر کی گئی نظر انداز
اُس قدر سخت جاں رہی اُردو

اُردو زبان کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ میں نے خود ایک ملیشاہ کے نوجوان کو گٹار پر اُردو کا ایک گیت گاتے ہوئے دیکھا

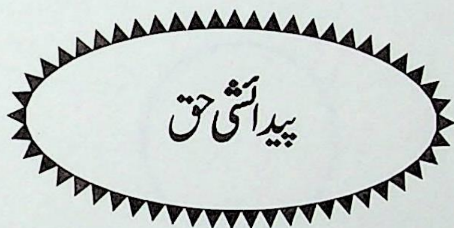
دوست دوست نا رہا پیار پیار نہ رہا
زندگی اب ہمیں تیرا اعتبار نہ رہا

☆☆☆



پیدائشی حق

الٹ کر دیکھیے قالین وضعداروں کے
شکستہ فرش پھٹے بوریے نکلتے ہیں
(ڈاکٹر محبوب راہی)


پیدائشی حق

برصغیر ہندو پاک کا اگر ایک جنرل سروے کیا جائے جس میں لوگوں کے رہن سہن، کھان پان، اوڑھنا بچھونا، کپڑا، فلورنگ، فرشنگ، ملبوسات، بدعات، فضولیات اور اسرافات وغیرہ پر معلومات اکٹھی کی جائیں تو میرے خیال سے اُس زمرے میں ریاست جموں وکشمیر اور خاص طور سے وادیٔ کشمیر کافی حد تک خوشحال ٹھہرائی جاسکے گی۔ لوگ نسبتاً آسودہ حال اور متمول ہیں۔ صفائی کرمچاری کے پاس بھی اپنا گھر ہے۔ کوئی بھوک سے نہیں مرتا اور زندہ رہنے کے لیے کوئی عورت عصمت فروشی نہیں کرتی۔ ہاں گلیمر ورلڈ کی کوئی اور وجہ ہو تو دوسری بات ہے۔ ریاست میں نہ ہی جھونپڑ پٹی کا دستور ہے اور نہ یہاں فٹ پاتھوں پر بسیرا کرنے والے ملتے ہیں جب کہ جتنی یہاں کی آبادی ہے اتنے لوگ صرف کولکتہ میں فٹ پاتھوں پر زندگی گذارتے ہیں۔ ہندوستان میں گھومنے والے ریاستی لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ ننگ دھڑنگ بچے مٹی اور دھول میں لوٹیں لگاتے ہوتے ہیں اور کئی عورتوں کا مال ومتاع صرف ایک دھوتی ہوتی ہے۔ گرین ریولیشن والے اس ملک میں ہزاروں لوگ یومیہ صرف بھوک کی وجہ سے مرتے ہیں۔ کوڑا کرکٹ کے ڈھیروں اور ڈسٹ بنوں سے کتنے لوگ اپنی روزی روٹی جٹاتے ہیں اور جوٹن کے ٹکڑے جمع کر کے اپنی اکھڑتی سانسوں کو سنبھالتے رہتے ہیں۔ کچھ جنس کھانے کو مل جائے تو اُس کو پکانے کے لیے ریلوے ٹریکوں سے کوئلہ چُن چُن کر ایندھن کی ضرورت پوری کی جاتی ہے۔

ہندوستان کے ہر شہر میں کتنے ہزار لوگ سائیکل رکشا کھینچتے کھینچتے خون تھوک تھوک کر مرتے ہیں اور ٹھنڈ پڑ جائے تو وہی لوگ اُس کے بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ لاکھوں چھوٹے بڑے گاؤں میں ہر سیلاب کے بعد نو مہینوں کے لیے ایک نیا گھر

بنتا ہے اور اگلا سیلاب آ کر جب اُسے بہا کر لے جاتا ہے تو پھر پھونس کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں ابھی انسانوں کی ویسی کسمپرسی اور خستہ حالی روشناس نہیں ہوئی ہے۔ ابھی انسان دشمنوں نے اس کو مراد آباد اور ملیانہ، گجرات اور ممبئی نہیں بنایا ہے، گرچہ زخم بہت گہرے لگے ہیں جو ہمیشہ رستے رہیں گے اور تاریخِ انسانی، تاریخِ اخلاق و عزتِ نفس اور تاریخ عفت و ناموس تا دور قیامت شرمندگی کے آنسو بہاتی رہے گی۔ پھر بھی کسی خوش فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ دوستوں کی کمی نہیں ہے۔ بقول انیس دہلوی

بڑا چالاک ہے وہ بستیوں کو قتل کرتا ہے
مگر دنیا نے اُس کے ہاتھوں میں خنجر نہیں دیکھا

اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ یہاں کوئی غریب نہیں ہے۔ یہاں غریب بھی ہیں، یتیم بھی ہیں، مظلوم اور بے سہارا بھی ہیں گر اللہ کے فضل و کرم سے یہاں کے لوگوں میں جذبہ ملی، جذبہ اخوت اور روایتی شرافت ہے جس کا ثبوت یہاں کے لوگ بار بار دے چکے ہیں اور بیسیوں ٹرسٹ، سینٹر اور راحت خانے اُس کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔

قطع نظر اِن حالات و معاملات کے یہاں بھکاریوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ بھکاریوں کے بھی ذاتی گھر اور جائیدادیں ہیں۔ آپ عرس پر، میلے ٹھیلے میں، تفریح کے لیے پارک و باغات میں، خریداری کے لیے دوکانوں یا سٹورز میں، تازہ دم ہونے کے لیے چائے خانوں یا ریسٹوران میں، سفر کرنے یا گھر جانے کے لیے بس یا میٹا ڈار میں بیٹھیے بھکاری آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہسپتالوں کی حالت زیادہ بُری ہے۔ وہاں بھکاریوں کا کوئی حساب شمار ہی نہیں ہے۔ رنگ رنگ کے مختلف طریقوں سے دہائی دینے والے آتے ہیں۔

چونکہ بیمار کا تیمار دار کہیں جا نہیں سکتا اس لیے اس کے سر پر ہر وقت تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ دفاتر میں فرائض کی انجام دہی کے دوران درجنوں کے حساب سے بھکاری آن ٹپکتے ہیں۔ لوگ دینا بھی چاہتے ہیں اور دیتے بھی ہیں مگر آخر کتنے لوگوں کو دیں گے، کس کس کو دیں گے، مانگنے والوں میں عورتوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پہلے ہاف میں جو برقعہ پہنے آتی ہے تو دوسرے ہاف میں وہی جلوے بکھیرتی ہے۔ مانگنے والوں کے سوال مختلف ہوتے ہیں۔ کوئی گھر سے ہسپتال کے لیے آتا ہے تو اُس کے پیسے کھو جاتے ہیں، کوئی گھر جانا چاہتا ہے مگر بس کا کرایہ پاس نہیں ہوتا، کسی کا باپ، بچہ یا شوہر ہسپتال میں دوا کے لیے ترس رہا ہوتا ہے۔

گھروں میں بھی لاتعداد بھکاری آتے ہیں۔ کوئی نقد پیسہ چاہتا ہے، کوئی جنس پر اکتفا کرتا ہے اور کوئی ''جو ہی وٹیا سو ہی کھٹیا'' کے مصداق جو ملے اُسی پر اکتفا کرتا ہے۔ کوئی ایک چیز لینے کے بعد پرانے کپڑوں کی فرمائش بھی کرتا ہے۔ آپ از راہِ ہمدردی دے بھی دے گے مگر دو چار روز میں وہی کپڑا جہلم ویلی مارکیٹ میں کھلے بازار میں بکاؤ ہوتا ہے۔ معاملہ جو بھی ہو آپ بھیک دینے سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ بھکاری بھیک لینا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے اور نہ ملنے پر جھگڑے پر اتار و ہو جاتا ہے۔ پچھلے برس میں نے باہر کے ایک بھکاری کو دو روپیہ کا ایک سکہ دیا، وہ بدزبانی کرنے لگا، کہنے لگا تمہارے پاس اتنا بڑا مکان ہے پھر بھی دو روپیہ دیتے ہو، کمال ہے صاحب!۔ میں ہونقوں کی طرح اُس کا روئے مبارک تکتا رہ گیا۔

گرمیوں کے دوران شہر سرینگر میں خاص طور پر اور دیہاتوں میں عام طور پر بھکاریوں میں پچاس فی صد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ٹی ڈی سی کے اعداد و شمار کے مطابق بھیک کے لیے آنے والے بھکاری سیاح گردانے جاتے ہیں

جب کہ ہمارے لیے وہ باعث مصیبت بن جاتے ہیں۔ ایسے سیاحوں کے مرددن بھر بوٹ پالش کرتے پھرتے ہیں، نقلی ادویات، دانت منجھن یا معمولی نوعیت کے کھلونے بیچا کرتے ہیں اور اُن کی عورتیں یا سڑکوں پر ہوتی ہیں یا مختلف علاقوں کا پھیرا لگا کر آتی ہیں۔ رات کو مختلف پکوان کے ساتھ سانجھا دم لگتا ہے اور پھر خوابِ راحت کے مزے، نہ غم جنت نہ غم دوزخ، جو دم نکلے سو واہ! واہ! ایسے ہی کپڑے یا کینواس کے خانہ بردوش دیسی شراب کے اور ڈرگ پیڈلر بھی ہوتے ہیں اور بائی پاس شاہراؤں پر لمبے سفر سے آنے والے ٹرک ڈرائیوروں کی راحت کا سامان بھی یہی لوگ فراہم کرتے ہیں جب کہ گھروں میں رہنے والے مکینوں کو ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے

کہیں یہ ______ وہ تو نہیں

بدیسی بھکاریوں سے ہٹ کر اُن کی اور بھی خاص طور سے چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک عام بھکاری جو خدا اور انسانیت کے نام پر ڈائرکٹ سوال کرتا ہے، دوسرا اِن ڈائرکٹ یعنی نفسیاتی الجھن میں ڈال کر خصوصی طور پر عورتوں میں ڈر پیدا کر کے مال مارتا ہے، تیسرا نار، مار اور آب کے نام پر دہائی دیتا ہے اور ایسے لوگ ہمیشہ کسی نہ کسی آگ یا سیلاب کی نذر ہو چکے ہوتے ہیں جب کہ چوتھا ٹھگ لیتا ہے۔ ابھی چند روز قبل ہی میری دیوار کے ساتھ لگنے والے دوسرے گھر میں دن دہاڑے ایک خوش پوش، باریش، خوب تن و توش، باحواس و ہوش، کاکلِ زاغ بر گوش، چشم مے نوش، دُعا فروش، روئے جلال و جوش، دوشالہ بردوش، پاؤں میں طلائی پاپوش ، مع مکمل جوش و خروش نے ایک ستم کوش کے صحن میں داخل ہوتے ہی کھولی اپنی شبد کوش پہلے صرف پانچ روپے طلب کیے۔ پھر پیسے واپس کر کے چائے کے ایک کپ کا سوال کیا، اُسی بہانے گھر میں داخل ہو کر آخر میں دو میٹر سبز کپڑا، ایک کلو

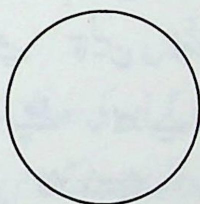
چائے کی پتی اور پندرہ سو روپیہ نقد لے کر چلتا بنا اور گھر والے ۔

کارواں گذر گیا غبار دیکھتے رہے

بہت سارے لوگ بھیک مانگنے کو پیشہ بنا کر جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ یہ کم دِقت طلب، کم محنت طلب اور بغیر سرمایہ کاری کا ایک آسان ترین مالی منفقت والا کاروبار ہے اور جو اصل مستحق ہیں وہ شال کندھے پڑ ڈالے لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ ملتے ہیں اور خندہ پیشانی کے ساتھ باتوں کا جواب دے دیتے ہیں ۔ یقیناً وہی لوگ بھوکوں مرتے ہیں ۔ عزت نفس کی پاسداری کی وجہ سے نہ وہ مانگ سکتے ہیں اور نہ سوال ہی کر سکتے ہیں ۔ ایسے لوگوں ہی کے لیے ڈاکٹر محبوب راہؔی کا کہنا ہے کہ ۔

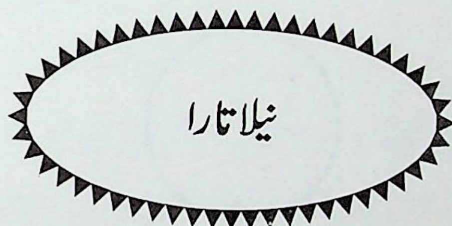
الٹ کر دیکھیے قالین وضعداروں کے
شکستہ فرش پھٹے بوریے نکلتے ہیں

☆☆☆



نیلا تارا

یہ ہے خار خار وادی یونہی زخم زخم چلنا
یہ ہے پتھروں کی بستی یونہی دل گداز رکھنا
(شاذ تمکنت)


نیلا تارا

اسرائیل کے معنی ہیں مردِ خدا۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ اُن کی نسل بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے ایک بیٹے کا نام یہودہ اور ایک کا نام بن یامین تھا۔ فلسطین کے علاقہ یہودہ میں اُن دونوں کے قبائل کی حکمرانی تھی۔ یہ قبائل یہود کہلائے جاتے تھے اور باقی قبائل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تمام تر قبائل کو اور اپنے خاندان کو مصر بلا لیا جہاں اُنہیں عزت و احترام کے ساتھ رکھا گیا۔ یہ سارے قبائل چار سو سال تک مصر میں رہے۔ اس طویل مدت میں وہ قبائل سے ایک طاقتور قوم میں تبدیل ہو گئے جس سے ہمعصر فرعونِ مصر کو خطرہ محسوس ہونے لگا۔ اس لیے اس قوم کو ختم کرنے کے لیے فرعون نے بنی اسرائیل کے نرینہ اولاد کے قتل کا حکم دے دیا۔

مصر سے نکل آنے اور حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین کے کچھ حصے فتح کر لیے اور وہاں کے اصلی باشندوں پر انہوں نے رحم کرنا گناہ سمجھا۔ باشندوں کو قتل کرنا اور اُن کی کھیتوں پر قبضہ کر لینے کو بنی اسرائیل خدائے یہودہ کی خوشنودی جانتے تھے۔ دوسروں کی زمین پر پاؤں پسارنا، وہاں کے باشندوں کو املاک سے محروم کر کے انہیں بھکاری بنا دینا، وہاں کی صنعت، حرفت، تجارت اور انتظامیہ پر اپنا آسیب طاری کر دینا، وہاں کے اصلی مکینوں کو مویشی بنا دینا ایک یہودی کی فطرت میں شامل ہے۔

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ آلِ اسرائیل کے بادشاہ اور پیغمبر بنے۔ اسرائیل کے پرچم پر جو ستارہ ہے اُسے وہ داؤدؑ کا ستارہ کہتے ہیں۔ گیارہویں صدی قبل مسیح میں حضرت داؤدؑ نے پہلی بار یروشلم کو دارالحکومت بنایا اور دسویں صدی قبل مسیح میں حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس میں ہیکل تعمیر کروا دیا۔ یہ بنی

اسرائیل کے عروج کا زمانہ تھا۔

قوم یہود کو جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے ظلم وستم سے نجات دلا کر دریا پار کر کے لائے تو وہ تشکر وممنونیت میں اُن کے مطیع وتابعدار رہ کر عبادت الٰہی میں مصروف ومگن رہتے حالانکہ اُن کی شکم سیری کا بندوبست بھی از طرف اللہ عنایت و مہربانی کے طور پر ہوتا تھا، مگر فطری اور طبعی مفتن اور سرکش قوم ہونے کے ناطے اُس وقت بھی وہ اپنی نافرمانیوں، کفر والحاد اور فتنہ وسرکشی سے باز نہیں آئے۔ چنانچہ قرآن شریف کے سورۂ مایدہ آیت ۷۸ میں اس کی سمت یوں اشارہ دیا گیا ہے:

> جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا اُن پر داوٗد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔

اِس کے ساتھ ہی سورۂ بنی اسرائیل آیت ۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِس طرح ہے:

> اور ہم نے بنی اسرائیل کو اُن کی کتاب میں یقینی خبر دی تھی کہ ضرور تم ملک میں دو دفعہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی اختیار کرو گے۔

حالانکہ ضرورت تو نہیں مگر اس سلسلہ میں توراۃ کو بھی دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، چنانچہ توراۃ میں لکھا ہے:

> انہوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھوں میں اڑایا اور خدا کی باتوں کو ناچیز جانا اور اُس کے نبیوں کی ہنسی اڑائی یہاں تک کہ خدا کا غضب ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا۔ چنانچہ وہ کسدیوں کے بادشاہ (بخت نصر) کو اُن پر چڑھا لایا جس نے اُن کے مقدس کے گھر میں اُن کے جوانوں کو تلوار سے قتل کیا اور اُس نے جوان، کنواری، بوڑھا کیا، عمر رسیدہ کسی

پر ترس نہ کھایا اور خداوند کے گھر کے سب ظروف چھوٹے بڑے اور
خزانے اور بادشاہ ودیگر سرداروں کے خزانے یہ سب وہ بابل لے گیا
اور جاتے جاتے خدا کے گھر کو جلا ڈالا اور یروشلم کی فصیل ڈھادی اور
یروشلم کے تمام محلوں میں آگ لگادی اور تمام قیمتی سامان کو بُرباد کرڈالا،
جولوگ تلوار سے بچے اُن کو بابل لے گیا وہاں وہ اُس کے اور اُس کے
بیٹوں کے غلام رہے۔

تورات......تواریخ......II......ب......۳۶، آیت ۱۶......۲۱

حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت داوٗدؑ کے وقت میں بنی اسرائیل نے جسمانی ترقی کا اور حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں روحانی ترقی کا کمال حاصل کرلیا۔ دونوں نبیوں نے دیکھا کہ قوم اب سخت دل ہوتی جارہی ہے، سرکشی اور فتنہ فساد بپا کرتی ہے، معصیت اور بے راہ روی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتی ہے۔ احکام الٰہی کی مطلقاً کوئی پروانہیں کرتی ہے اور دن بدن بداخلاقی، بدکرداری اور فحاشی میں مبتلا ہوتی جارہی ہے، اس لیے دونوں نے اُن پر لعنت کی اور اُن سزاؤں کا بھی ذکر کیا جو اُن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی تھیں۔

حضرت داوٗدؑ کے کوئی چارسو سال بعد بابل کے فرمانروا بخت نصر کے ذریعے سے یہود قوم پر تباہی آئی اور حضرت عیسیٰؑ کے کوئی ستھر سال بعد ٹاٹیس (Titus) یا عربی میں طیطوس رومی کے ذریعے دوسری بار یہ قوم اُجڑی اور اِن دونوں تباہیوں سے جس کا اصل باعث اُن کی سرکشی اور نافرمانی تھی یہ قوم بالکل ذلیل ہوگئی۔ گو یروشلم پر ہر دور، ہر یگ اور ہر زمانے میں اور بھی کئی حملے ہوئے اور ہر بار بُربادی وتباہی ہوئی مگر یہ تباہی انتہا کو دوبار پہنچی جس میں حضرت موسیٰؑ وحضرت ہارونؑ کی باقیات وتبرکات ضائع ہوگئیں۔ حتیٰ کہ توراۃ کا اصلی نسخہ یا وہ تختیاں جن پر توراۃ کے احکام

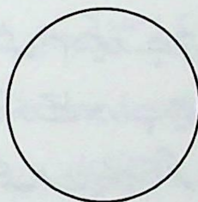
مرقوم تھے بھی تلف ہو گیا۔ یہودی زنجیروں میں جکڑ کر بابل پہنچائے گئے جہاں انہوں نے صدیوں تک غلامی کی زندگی بسر کی۔ اُنہی دو تباہیوں کے دوران کافی سارے یہودی جان بچانے کی خاطر اِدھر اُدھر نکل گئے، بکھر گئے اور دنیا کے کئی حصوں یں پھیل گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران، افغانستان، کشمیر وغیرہ میں یہودیوں کی آمد کے آثار و شواہد مل جاتے ہیں جب کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود وادیٔ کشمیر میں کئی رسومات کا چلن آج تک باقی ہے (انشاء اللہ اُن کا ذکر ایک الگ کالم میں کروں گا اگر زندگی رہی تو) بہر حال یہی یہود قوم کی اصلی تباہی تھی جس کی وجہ اُن کی سرکشی، فساد، بنی نوع انسان پر ظلم اور احکام الٰہی کی فراموشی کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

اسرائیل کا قیام اور اس کی توسیع یہودیوں کا ایک بہت پرانا خواب تھا جسے انہوں نے ''وسیع تر اسرائیل Greater Israel'' کا نام دے رکھا ہے۔ انہوں نے پہلے اسرائیل بنایا پھر اُسے وسیع کیا اور اب اُسے وسیع تر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسرائیل کے قیام، استحکام اور اس کی توسیع امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن یہ کارنامہ بہر حال یہودیوں کا ہے کہ انہوں نے اِن بڑی طاقتوں کو اپنی مخصوصی شیطانی اُستادی سے اپنے زیر اثر کر لیا ہے۔ لبنان، شام، مصر اور دیگر جگہوں پر حملے اُسی توسیع پسندی اور ہوس ملک گیری کی ایک کڑی ہے۔ لبنان ہی کی مثال لے لیجیے، کہا یہ جا رہا تھا کہ لبنان سے فلسطینی گوریلا فورس اور بعد میں حزب اللہ کے مجاہدین کو باہر نکالنے کے لیے حملہ کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ سن ۱۹۸۴ء کے دوران اور خاص کر سن ۲۰۰۶ء میں اُنہیں منہ کی کھانی پڑی مگر یہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اسرائیل نے بیروت کی شہری آبادی، فلسطین کے مہاجر کیمپوں اور اُن کی بستیوں پر جس بے دردی کے ساتھ بم

برسائے وہ فقط درندہ صفت یہود کا ہی کام ہوسکتا ہے۔ یہودیوں کے ہاں غیر یہودی خاص کر مسلمانوں کی قتل و غارت گری مذہبی فریضے کا حکم رکھتی ہے۔ یہودیوں کے مذہب میں غیر یہودی کا قتل ایک مذہبی رسم بھی ہے جسے Ritual Murder کہا جاتا ہے۔

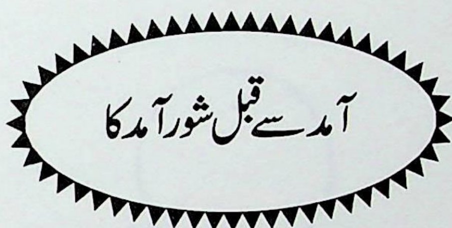
لبنان اور فلسطین میں بمباری کے دوران لاکھوں مردوں، عورتوں، بچوں کے جسم کے ٹکڑے اڑ رہے تھے اور شہر ملبے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو رہے تھے اور وہی قتل و غارت گری، تباہی و بربادی ہر یہودی کے لیے روحانی تسکین اور سرور کا باعث بن رہی تھی۔ ایک بار ولد شگال شیرون نے کہا تھا کہ اسرائیل کی جنگ صرف لبنان یا فلسطین تک محدود نہیں بلکہ ہماری (یہودیوں) کی جنگ عالم اسلام کے ساتھ ہے۔ موجودہ وقتوں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح اور کن حربوں سے عالم اسلام پر یہود کے تابڑ توڑ حملے ہو رہے ہیں۔ کوئی اور دین ہوتا تو یا کوئی اور قوم ہوتی تو اُس کا نام و نشان تک مٹ چکا ہوتا مگر چونکہ یہ رب کا مقرر کردہ دین ہے اور اُمتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی وجہ سے ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد'' کے مصداق، اس یہودی خلفشار کے باوجود آج بھی غیر مسلم بڑی تعداد میں صرف اسلام کو ہی گلے لگا رہے ہیں۔





آمد سے قبل شور آمد کا

بشارت دی مسیحا نے کلیم اللہ نے تیری
ہوا آمد سے پہلے شور تیری آمد آمد کا


آمد سے قبل شور آمد کا

قرآنِ کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

اور اللہ نے جب نبیوں کے ذریعے سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اُس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اُس کی مدد کرنی ہوگی، کہا گیا ــــــ کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے بوجھ کا عہد لیتے ہو۔ انہوں نے کہا ــــــ ہم اقرار کرتے ہیں کہا پس گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ (سورۂ آل عمران:۸۱)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیش گوئیاں نہ صرف ہندو، یہود اور نصاریٰ کی کتابوں میں ہی ہیں بلکہ دیگر مذاہب کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے ہمیں مختلف زبانوں کی مذہبی کتابوں میں ایک ہی معنی کے ساتھ کئی الفاظ ملتے ہیں جیسے نراشنس، اتوست اراٹا، مے ترِیا، مماہ، جن کے معنی بہت تعریف کیا گیا یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنتا ہے۔ اگر چہ کچھ کتابیں اور صحیفے جن کو قرآن نے زبرالاولین کہا ہے، گردشِ زمانہ کے ساتھ تلف ہو گئے ہیں تو اُس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ آخری آسمانی کتاب جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت ہوئی ہے میں جگہ جگہ اُس کی تائید ہوتی ہے اور سب سے بڑا ثبوت بذات خود مذکورہ ''یوم میثاق'' ہے، کیونکہ ظاہر ہے جب بھی کوئی پیغمبر مبعوث ہوا ہوگا تو اُس نے آنے والے یعنی موعود پیغمبر کے لیے ضرور پیشن گوئی کی ہوگی۔

سائنس یا ٹیکنالوجی میں کوئی غیر معمولی بات یا عجیب واقعہ ظہور پذیر ہو جائے تو اُسے عجوبہ کہا جاتا ہے اور اگر وہ عجوبہ دین یا کارخانۂ قدرت سے متعلق ہو

تو اُسے معجزہ کہا جاتا ہے۔ سابقہ ایام میں کیا کچھ ظہور پذیر ہو چکا ہوگا چونکہ ماضی کی وہ تاریخ اندھیرے پردوں میں روپوش ہے اس لیے ہم حتمی طور کچھ نہیں کہہ سکتے مگر جہاں تک بیسویں صدی کا تعلق ہے اس صدی میں کئی ایک عجوبے یا معجزات رونما ہوئے جو تاریخ اوراق پر محفوظ ہو گئے۔ چنانچہ گذشتہ صدی میں روس میں ایک جیالوجیکل سروے کے دوران حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی پر لگی ایک تعویز نما تختی اور یروشلم میں ایک مٹی کے ٹیلے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک مرصع رو پہلی چاندی کی تختی مل گئی جن پر خاندانِ نبوت کے نامِ پاک تھے۔ عراق میں دو اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں آ کر بادشاہ وقت کو بتایا کہ اُن کی آخری آرام گاہ میں پانی آتا ہے۔ ترکی کے ایک بہت پرانے غار سے اصل انجیل کے چند اوراق (چمڑے کے ٹکڑے) ملے جن پر نام نامی اور آمد سے قبل کی بشارت تھی۔ اسی طرح کئی ایک معجزے وقوع پذیر ہو چکے ہیں جن کی تفصیل سر دست اس کالم میں نہیں آ سکتی۔ البتہ ایک معجزے کے بارے میں مختصر طور پر کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

سن ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم اول پورے شباب پر تھی۔ یہود کی سازشیں رنگ لائی تین اس لیے خدا کا قہر عذاب بن کر لوگوں پر برس رہا تھا۔ تقریباً ساری دنیا اس کی چپیٹ میں آ چکی تھی۔ ہزاروں لاکھوں مارے جا چکے تھے۔ ہزاروں لاکھوں زخمی، اپاہج، بے یارو مددگا اور بے وسیلہ پڑے تھے۔ ہوس ملک گیری اور انتقامی جذبے نے انسان کو انسان کی صف سے اٹھا کر درندوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ اسی دوران بیت المقدس سے چند میل دور اونترہ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک انگریز فوجی دستہ کہیں اپنے فوجی مشن پر جا رہا تھا، رات اندھیری تھی اور ہر سو ظلمات کا راج تھا۔ مگر تاریکی کے باوجود فوجیوں نے دیکھا کہ ایک ٹیلے سے

تیز روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ فوجی یہ عجوبہ روزگار واقعہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ کمانڈر کے حکم پر خاموشی کے ساتھ سٹینڈ بائی ہو گئے۔ چاروں طرف باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کیا مگر کوئی خطرے والی بات نظر نہ آئی۔ اس کے بعد اس دستے نے تمام فوجی تدابیر بروئے کار لا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر ٹیلے کو گھیرے میں لے لیا۔ اُن کی حیرانگی دوبالا ہوگئی بلکہ وہ کچھ کچھ پریشان بھی ہو گئے جب یہ مشاہدے میں آیا کہ روشنی کسی وسیلے سے نہیں بلکہ زمین کے اندر سے پھوٹ رہی ہے۔

فوجی افسر نے تھوڑی دیر غور و خوض کیا اور من ہی من ہر پہلو کو سلجھایا، آخر میں کمانڈر کے حکم سے زمین کی کھدائی شروع ہوئی۔ تقریباً بارہ فٹ کی گہرائی میں سے ایک روپہلی چاندی کی تختی برآمد ہوئی جو تقریباً ۲۷ انچ لمبی اور ۱۸ انچ چوڑی تھی اور جس کے حاشیے لعل و جواہر سے مزین تھے۔ جونہی تختی باہر نکالی گئی تو روشنی آنا بند ہوگئی۔ فوج کی اس ٹکڑی کا کمانڈر میجر اے این گرینڈل تھا۔ سب نے بڑی حیرانگی کے ساتھ تختی کو دیکھا مگر اس پر تحریر عبارت کسی کے سمجھ میں نہ آسکی۔ اُن دنوں برطانوی فوج کا سربراہ جنرل ڈی، او گلیڈ سٹون تھا۔ اس لیے میجر گرینڈل نے یہ تختی ایک چھوٹی سی رپورٹ کے ساتھ فوجی ہیڈ کوارٹر میں اُس کی خدمت میں روانہ کر دی کیونکہ میجر ذاتی طور پر اس بارے میں کوئی رائے دینے یا فیصلہ لینے کا مجاز نہیں تھا۔

سن ۱۹۱۸ء میں جب جنگ کا خاتمہ ہو گیا تو باقی ضروری ملکی معاملات نپٹ کر حکومت کے ایما پر تختی پر تحقیق شروع ہوئی۔ حکومت برطانیہ نے فرانس، جرمنی اور امریکہ سے ماہر السنہ قدیمہ اور قدیم زبانوں کے ماہرین بلوا کر کام شروع کروا دیا، کئی ماہ کی محنت، دماغ سوزی اور عرق ریزی کے بعد ماہرین کو پتہ چلا کہ یہ لوحِ

سلیمانی ہے۔ اور اُسی زبان میں تحریر ہے جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا مشہور قصیدہ غزل الغزلات (زبور میں) ہے۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی باقی انبیاء کی طرح اپنے محبوب آنے والے موعود، ختم المرسلین، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

میرا محبوب سرخ وسفید ہے
وہ دس ہزار☆ میں ممتاز ہے (☆فتح مکہ)
اُس کا سر خالص سونا ہے
اُس کی زلفیں پیچ در پیچ اور کوے سی کالی ہیں
اُس کی آنکھیں اُن کبوتروں کی مانند ہیں
جو دودھ میں نہا کر لبِ دریا تمکنت سے بیٹھے ہوں
اُس کے رخسار پھولوں کے چمن ہیں
اور بلسان کی اُبھری ہوئی کیاریاں ہیں
اُس کے ہونٹ سوسن ہیں
جن سے رقیق مُر ٹپکتا ہے
اُس کے ہاتھ زبرجد سے مرصع سونے کے حلقے ہیں
اُس کا پیٹ ہاتھی دانت کا کام ہے
جس پر نیلم کے پھول بنے ہیں
اُس کی ٹانگیں کُندن کے پایوں پر سنگِ مرمر کے ستون ہیں
وہ دیکھنے میں لُبنان اور خوبی میں رشکِ سرو ہے
اُس کا مُنہ ازبس شیرین ہے

ہاں! وہ سراپا عشق انگیز ہے

اے یروشلم کی بیٹیو

نوٹ: مفتی مصر مرحوم نے زبور کا قدیم نسخہ دیکھا تھا، اُن کے کہنے کے مطابق اس قصیدے کی آخری دو لائنیں یوں تھیں

خلو محمدیم زہ زوَدی وزہ رعی

یا بتوث یروشلایم

محمدیم کو کس شیطانی کے ساتھ بدلا کر ''سراپا عشق انگیز'' کر دیا گیا ہے، اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہیں کہ انہوں نے کہاں کہاں تحریف و تنسیخ کے طاغوتی ہتھکنڈے چلائے ہیں۔ اصل میں عبرانی میں کہے اس شعر کا ترجمہ یوں بنتا ہے:

ہاں وہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے

اے دختران یروشلم

وہی میرا پیارا وہی میرا محبوب ہے

(زبور، باب ۵، آیات ۱۰۔۱۶)

۳ جنوری ۱۹۲۰ء کو رپورٹ آئی اور ماہرین نے رپورٹ دی کہ تختی کی عبارت کا ترجمہ قریب قریب یوں بنتا ہے

اللہ۔ احمد۔ ایلی۔ باھتول۔ حاسن۔ حاسین

یاہ احمد مقذا.........اے احمد ﷺ ہماری دادرسی کر

یاہ ایلی انصطاہ..........اے علیؓ مدد کو پہنچو

یاہ باھتول اکاشی ....اے بتولؓ نگاہ رکھ

یاہ حاسن اضومظع ....اے حسنؓ خوشی دے دو

یاہ حاسین بارفو..........اے حسینؓ شادمان کردو

یہ رپورٹ دیکھ کر اور خصوصی طور پر اس میں نامِ پاک دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ فیصلہ ہوا کہ اس لوح کو برٹش میوزیم میں رکھ دیا جائے۔ مگر اُس وقت کے لاٹ پادری نے اس کی زبردست مخالفت کی، کیونکہ اُس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی اور اُسے مسیحت کی دیواریں گرتی نظر آنے لگیں تھیں اس لیے یکم مارچ ۱۹۲۳ء کو ایک خفیہ حکم نامے کے تحت اُسے لندن کے سیکرٹ چرچ روم میں رکھا گیا جہاں نہ جانے اور کیا کیا ہے، کتنے رازہائے سربستہ ہیں جو وہاں چھپائے گئے ہیں۔

اللہ کے نور کو پھیلنے سے کون روک سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے:

چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ کی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا چاہے کافر کتنا بُرا مانیں (سورہ صف، ۸)

دو آدمی ولیم اور ٹامس جو چرچ کے ملازم تھے کو سچائی کے بارے میں معلوم ہوا، انہوں نے اپنے ضمیر کے آگے سپر ڈال دیے اور راز سے پردہ ہٹایا۔ اسلام کو سچا دین تسلیم کیا اور نیو کیسل لندن میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور فضل حسین اور کرم حسین کے ناموں سے پکارے جانے لگے اور پھر دو سال کے بعد سن ۱۹۲۵ء میں دونوں صاحبان زیارت حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔

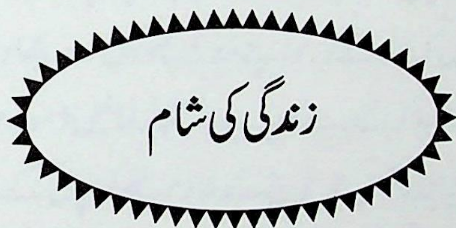
بشارت دی مسیحا نے کلیم اللہ نے تیری
ہوا آمد سے پہلے شور تیری آمد آمد کا

و صلی اللہ تعالیٰ علیه و آله و اصحابه وسلم

حوالہ: (۱) رسالہ الحرم قاہرہ، ذیعقدہ ۱۳۷۴ھ، (۲) مسلم کرانیکل لندن ۳۰ دسمبر ۱۹۲۶ء (۳) الاسلام دہلی فروری، ۱۹۲۷ء (۴) تفسیر قرآنِ حکیم

زندگی کی شام

جفائے غیر پر ماتم تو کرتے رہتے ہو
خود اپنے تیر کے ماروں کا تذکرہ بھی کرو
(ساقی لکھنوی)


زندگی کی شام

اُستاد منطقی استدلال کا سہارا لے کر شاگردوں کو سمجھانے کے لیے مثال دیتے ہیں۔ کیا آلو ایک سبزی ہے؟ _____ بالکل ہے۔ کیا تمام سبزیاں آلو ہیں؟ _____ بالکل نہیں۔ پادری اکثر غیر شادی شدہ ہوتے ہیں! _____ جی بالکل۔ کیا تمام غیر شادی شدہ لوگ پادری ہوتے ہیں _____ بالکل نہیں۔ اسی طرح گاؤں میں بودو باش رکھنے والوں کے پاس زمین ہوتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اُن تمام لوگوں کے پاس زمینیں ہوں جو گاؤں میں سکونت رکھتے ہیں۔ وادی کشمیر کے کچھ لوگ سردیوں کے دوران مدت دراز سے اپنی زندگی کی گاڑی ہانکنے کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں میں شال، دوشالے، پرس، بیگ، چادر اور دیگر سوئی کا کام لے کر جاتے ہیں اور بقول کسے ہلدی اور چائے کما کر لاتے ہیں مگر بھارتی پولیس کی مہربانی سے کتنے ایسے لوگ ہیں جنہیں پکڑ کر اُن پر جھوٹے کیس بنا کر اور اُگر وادی کا لیبل چسپاں کر کے اذیت خانوں میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ والدین خانماں برباد اور گھر تو اُن کے تباہ ہو ہی جاتے ہیں مگر ساتھ میں اُن کی زندگیوں کی شام بھی ہو جاتی ہیں۔ کشمیر بار ایسوسی ایشن ہندوستان کی مختلف جیلوں میں جا کر جب کچھ روح فرسا واقعات اور دردناک کہانیاں اکٹھا کر کے سُناتی ہے تو پتھر دل بھی دہاڑیں مار کر رونے لگتے ہیں۔ وادی سے باہر مختلف کاروباری سلسلے میں یا علاج و معالجے کے لیے جانے سے نوجوان تو کیا بوڑھے بھی خوفزدہ رہتے ہیں۔ نگروٹہ جموں اور امرتسر پنجاب میں یہاں کے ٹرک اور ٹیکسی ڈرائیوروں کے ساتھ کیا ہوتا ہے، وہی جو اُن ٹانگہ بانوں کے ساتھ ہوا تھا جب وہ سن سنتالیس کے پُر آشوب دور میں ڈوگروں کو بحفاظت جموں پہنچا کر لوٹنے پر ہوا تھا۔ سیب لے کر جانے والوں کو پھلوں سے لدی بھری پڑی ٹرکوں کے

عوض میں کیا ملتا ہے۔ فضیحت، دھتکار، گالیاں، مار پیٹ اور جیل۔ مشہور کشمیری گلوکار غلام نبی شیخ کو کس نے مارا اور کس جرم میں مارا۔ کیا گیتوں کا شہزادہ راگنیوں کے بھان برسا کر اور سُروں کے تیر چلا کر آتنک پھیلاتا تھا۔ آخر ہم کہاں جائیں۔ ہمارا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد نبوت میں یہودیوں کو ختم کرنے کے لیے اُس وقت کے فرعون رعمیسِ دوم نے نرینہ بچوں کو مارنے کا حکم دیا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ جب مرد نہیں رہتے، عورتوں کی کثرت ہو جاتی تو فحاشی پھیل جاتی۔ اس طرح سے وہ ایک تیر سے دو شکار کرتا تھا۔ اول قوم کو تباہ اور دوسرا اخلاقی طور انحطاط پذیر۔ کیونکہ جس قوم میں فحاشی بڑھتی ہے تو وہ قوم اخلاقی، سماجی اور معاشرتی پسماندگی میں تو آہی جاتی ہے مگر ساتھ میں اُس قوم کا ضمیر بھی سو جاتا ہے۔ وہ قوم بے غیرت بھی ہو جاتی ہے۔ موجودہ وقتوں میں یہودی اُسی ایجنڈا پر عمل کر کے ساری دنیا میں اخلاقی زوال پذیری کا باعث بن رہے ہیں۔ چونکہ ہمارے یہاں بھی اُن کے ہی مشورے پر عمل ہو رہا ہے، اسی لیے آئے دن یہاں اخلاقی بربادی کی باتیں عام طور پر سُنی جاتی ہیں۔ کچھ معاملوں میں تشہیر ہو جاتی ہے، اگر اُس میں بڑے لوگ ملوث ہوئے تو وہ جلد ہی معدوم ہو جاتے ہیں مگر عام طور پر یہ باتیں ظاہر نہیں کی جاتیں۔

چھوٹے بچوں کا قتل اب عام سی بات ہوگئی ہے۔ اس لیے وادی کے مسلمانوں کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ سوچ سمجھ کر اپنی بپتا کو عالم انسانیت میں لے جانے کی ضرورت ہے۔ پتھر مارنا اُس کا حل نہیں ہے۔ اِس طرح سے بچوں پر تعزیرات لگ جاتی ہے۔ وہ تعلیم و تربیت سے بھی جاتے ہیں، گھر کی شفقت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں اور عقوبت و اذیت خانوں میں سحر پھوٹنے کے ساتھ ہی اُن کی زندگی

کی شام بھی ہو جاتی ہے۔ اِن باتوں کی علت جو بھی دیکھیے نقصان بہر حال قوم کا ہی ہو جاتا ہے۔

کشمیری پنڈتوں نے جب کشمیر سے خروج لیا تب باہر جا کر انہوں نے ہر ایک چیز کے ساتھ مصالحت کی، ضروریات کے ساتھ کامپرومائز کیا مگر بچوں کی تعلیم کے ساتھ کوئی کامپرومائز نہیں کیا۔ انہوں نے سب کچھ چھوڑ دیا، گھر بار، مال و جائیداد، کھیت کھلیان، باغ آرچارڈ مگر تعلیم کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ تعلیم کو ہر صورت میں جاری رکھا، گرمی اور سردی میں، بند کمروں اور کھلے میدانوں میں، نہر کے کناروں پر اور توی کے پتھوں پر، اندھیرے اور اُجالے میں، لالٹینوں کی ملگجی اور شمع کی ٹمٹماتی روشنیوں میں، مٹی کی چادروں اور ریت کے بستروں پر، مرحبا ـــــ آفرین ـــــ مہاجر بھائیوں، بہنوں، بزرگوں اور بچوں پر۔

مگر ستم ظریقی دیکھیے ہم تعلیم کو ہی خیر باد کہہ رہے ہیں۔ وادی سے باہر نہ صرف برصغیر میں بلکہ دنیا کے ہر ملک میں لوگ تعلیم کی طرف بھرپور دھیان کے ساتھ ساتھ خاطر خواہ وقت بھی دیتے ہیں، تب ہی اُن کے بچے تعلیمی دوڑ میں آگے آگے ہوتے ہیں۔ وہی بچے معاشی، صنعتی، سائنسی و ٹیکنالوجی کا انقلاب لانے کا باعث بنتے ہیں اور وہی بچے سمندروں میں گل کھلانے والے اور ریگستانوں میں فلک نما عمارات اور آسمان سے باتیں کرنے والے ٹاور بنانے والے بن جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی اِس بات پر دھیان دینے کی کوشش نہیں کہ ہمارے بچوں کو ایک سال یا تین سو پینسٹھ دنوں میں کتنے دن کوچنگ یا سکول جانے کے مل جاتے ہیں۔ ذرا مندرجہ ذیل تفصیل کو ملاحظہ کیجیے، ہوسکتا ہے کہ میں غلط بیانی کروں تو براہِ کرم مجھے ٹوکیے ضرور۔

ایک سال میں اتوار کے ۵۲ دن، گزیٹیڈ چھٹی کے ۲۹ دن اور علاقائی چھٹی

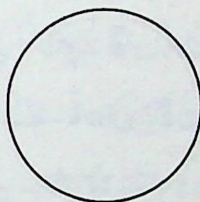
کے ۴۸ دن بنتے ہیں۔ اُس کے بعد اتفاقی یا حادثاتی چھٹی کے صرف دو دن مان لیجیے۔ ٹیچرس میٹنگ، پیرنٹس ڈے، لانگ ریسس، گیمز، ریس، مارچ پاسٹ، ۱۵ اگست، ایکسکرشن اور اسی طرح کی دیگر مصروفیات کے آپ تعلیمی سال کے دوران صرف بیس دن لگا لیجیے۔ کل یہ ۱۰۷ دن ہو گئے۔ پھر سردیوں کی چھٹیاں ۹۰ دن، گرمیوں کی چھٹیاں آٹھ دن، امتحان سے قبل تیاری کے دو دن، امتحان دینے کے بعد رزلٹ کی تیاری وغیرہ کے لیے آٹھ دن۔ کل ملا کر یہ دو سو پندرہ دن ہو گئے۔ حالانکہ بنتے اِس سے زیادہ ہیں کیونکہ میں نے اِس میں نیا تعلیمی سال شروع کرنے پر ایڈمیشن کے دن نہیں گِنے۔ یہ ڈاٹا نویں جماعت تک کے کلاسوں سے متعلق ہے۔ پھر ٹین پُلس ٹو اور آگے کے لیے خدا ہی حافظ ہے۔ بہر حال مندرجہ بالا دنوں کے ساتھ پھر ہڑتال کے دن لگا لیجیے۔ اگر کوئی ہڑتال نہیں ہوئی تو آپ کے بچے کے لیے تعلیمی سال پانچ مہینے کا بنتا ہے اور اگر درمیانہ درجہ کی ہڑتالیں ہوئیں تو تعلیمی سال تین مہینے کا رہ جاتا ہے۔ اب یہ تین مہینے کا ہو یا پانچ مہینے کا، خدا را انصاف کریئے یہ بچہ جس کی تعلیمی اوقات کار میں آف ہی آف لکھا ہو، پڑھے لکھے بغیر ہی ٹی وی دیکھ کر، یا ادنیٰ درجے کا کرکٹ کھیل کر، سڑکوں پر غُل غپارہ کر کے، ہمسائیوں کے شیشے توڑ کر کیا ہونہار بن سکتا ہے اور مقابلہ جاتی امتحانات میں کھرا اُتر سکتا ہے۔ آنے والے دور کا دار و مدار بنیاد پر ہے اور جب بنیاد ہی کمزور ہو تو اچھے مستقبل کے لیے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ابھی حال ہی میں بورڈ آف سکول ایجوکیشن نے جو نتائج شایع کیے اُن میں بورڈ کی جانب سے بچوں کے تیس پنتیس نمبرات گریس کے مل گئے۔ حالانکہ مذکورہ ادارے پر ایسی کوئی قانونی پابندی نہیں تھی مگر اربابِ اختیار کیا کرتے، حالات ہی ایسے تھے۔ بہر حال افسوس اس بات کا ہے کہ ہم نے بچوں

کے ساتھ اُن کے تعلیمی کریئر کے ساتھ یا بہ الفاظ دیگر قوم کے مستقبل کے ساتھ ہمیشہ کھلواڑ کیا ہے۔ بچے نافہم یا کُند ذہن نہیں ہیں مگر ظالم ہم خود ہی ہیں۔ ہم نے پھولوں کو کانٹوں کی باڑھ لگا کر قید کیا ہوا ہے۔ اِس لیے یہ پھول نہ خوشبو پھیلا سکتے ہیں اور نہ کسی گھر یا محفل کی زیب و زینت ہی بننے کی پوزیشن میں ہیں۔

سوچیے کیا کرنا چاہیے، ساقی لکھنوی بھی کچھ کہتے ہیں اِسے بھی سنتے جایئے

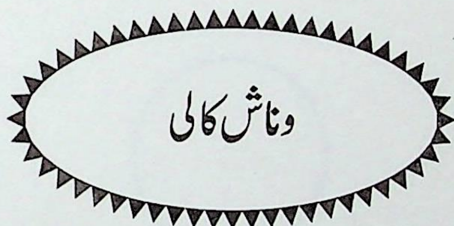
فلک کے چاند ستاروں کی بات کرتے ہو
زمین کے چاند ستاروں کا تذکرہ بھی کرو
رباب و چنگ کے نغموں سے گر ملے فرصت
کبھی نصیب کے ماروں کا تذکرہ بھی کرو
جفائے غیر پر ماتم تو کرتے رہتے ہو
خود اپنے تیر کے ماروں کا تذکرہ بھی کرو

☆☆☆



وناش کالی

بنایا اُس کو ہے اشرف خدا نے
نہ سمجھا مرتبت انساں اپنی
(شاؔدشرقی)


وناش کالی

ایک شخص چین میں دوسرا ہندوستان میں رہتا ہے۔ ایک فرانس میں دوسرا روس میں سکونت پذیر ہے۔ ایک ایران میں تو دوسرا جرمنی میں رہائش رکھتا ہے۔ ایک دنیا کے گرم حصوں میں رہتا ہے دوسرا سرد علاقوں کا مکین ہے۔ ایک گورا ہے، ایک کالا ہے۔ ایک ٹھگنا ہے ایک قد آور ہے۔ دنیاوی اعتبار سے ہر ایک کے پاس ضروریاتِ زندگی ہیں۔ بیوی بچے ہیں بلکہ پورا خاندان ہے۔ رہنے کے لیے حسبِ حیثیت اور حسبِ ضرورت گھر ہے، زمین جائیداد ہے۔ جسمانی اعتبار سے بھی یہ اشخاص یا اُن میں سے کوئی تندرست ہے، ناک نقشے سے ٹھیک ہے۔ کوئی صاحبِ حیثیت ہے کوئی درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ نہ اُسے کوئی دنیاوی پریشانی ہے، نہ خاندانی تضاد ہے، نہ صحت کے بارے میں کوئی تشویش ہے اور نہ وہ منتشر ذہن یا حاجت مند ہے۔ مگر اُس کے باوجود بھی وہ چاہتا ہے کہ اُس جیسے دوسرے انسان اُس کے پاؤں پکڑیں، اُس کے غلام ہو جائیں، اُس کی تابعداری کریں اور اور اُس کی ماتحتی میں رہیں۔ دوسرے ملک اُس کے زیرِ نگین ہوں۔ دیگر ممالک کی املاک اُس کے تصرف میں ہو۔ اِس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ دیگر ضرورت مندوں، حاجت مندوں، بے کار یا لالچی لوگوں کو ساتھ ملا کر جنگ کے لیے مین پاور جٹاتا ہے جیسا پرانے وقتوں میں دستور تھا۔ سربراہِ ملک ہوا تو سرکاری عساکر اُس کے تصرف میں ہوتے ہی ہیں، وہ جنگ کے لیے نکلتا ہے، جنگ کرتا ہے، اپنے جیسے انگ و اعضاء والے انسانوں کو پاؤں تلے روندتا ہے۔ اُن کا خون بہاتا ہے، املاک کو تباہ کر دیتا ہے، بستیوں کو تاراج کر دیتا ہے اور تسکین پاتا ہے۔

یہ درست ہے کہ وہ خدا کی خوبصورت مخلوق کو تباہ و برباد کر کے جنگ جیت

جاتا ہے، مگر پھر آخر ہوتا کیا ہے۔ ٹھیک ہے اُس کا نام مورخ کتابوں میں درج کرتے ہیں اور برس ہا برس تک لوگ اُس کو کتابوں کے حوالے سے فاتح یا جنگجو کی حیثیت سے یاد رکھتے ہیں مگر پھر یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس کی اِس مبہم جوئی سے، جنگ و جدل سے، بے گناہ و بے قصور لوگوں کے خونِ ناحق سے اُسے کیا حاصل ہوتا ہے۔ کیا اُس کے سر پر ایک اور سر اُگ آتا ہے۔ کیا دیوی دیوتاؤں کی طرح اُس کی شکتی کے بے شمار دست و بازو معرضِ وجود میں آجاتے ہیں یا اُس کا قد لمبا ہو جاتا ہے۔ جب ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے تو اُس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک فاسد خیال کے لیے، ایک جذبے یا اپنی انا، بے جا غرور (Vainty) کی وجہ سے جو اُس کی انتشاری دماغ کی پیداوار ہوتی ہے، یا دوسرے ممالک کو اپنے زیرِ نگین کرنے کے لیے، وہاں کے مکینوں پر راج کرنے کے لیے یا فقط ہوس ملک گیری کے لیے وہ جنگ کرتا ہے، لوگوں کو مارتا ہے، بستیوں کو جلا ڈالتا ہے، امنِ عامہ کو تحس نحس کرتا ہے، قائم مقام بادشاہ یا انتظامیہ کو بے دخل کرتا ہے، مفتوح لوگوں کو لوٹتا ہے اور اپنی انا کو، اپنے بے جا غرور کو یا اپنے جذبات کو تسکین دیتا ہے۔

بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ کوئی بات نہیں ہوئی بلکہ اِسے عقل کا فقدان بلکہ دیوالیہ پن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انسان نے اس لیے اشرف المخلوقات کا لقب حاصل کر لیا ہے کیونکہ دیگر مخلوقات کے مقابلے میں اُس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔ اُس میں عقلی فیصلے کرنے کی استعداد ہے۔ اُس میں قرابت داری اور رشتے کی پاسداری ہے۔ اُس میں حیا اور پیار کا ورثہ ہے۔ اُس میں متمدن سماج بنانے اور اُس میں رہنے کی بھر پور صلاحیت ہے اور وہ علم و عمل، جرم و سزا، حدو قانون اور نظم و ضبط کی باتیں سمجھتا ہے۔ وہ اپنے سے کئی گنا بڑے قوی الجثہ حیوانوں اور خونخوار درندوں کو اپنی سوجھ بوجھ سے رام کر لیتا ہے، اور مطیع و تابعدار

بنا تا ہے۔مگر افسوس اِس کے باوجود یہ انسان، یہ آدم زاد عقلِ سلیم سے کورا ہے، تدبیر و ترکیب، فہم و ادراک سے تہی دست ہے کیونکہ وہ اپنی برادری کو، اپنے جیسے دوسرے انسان کو، اپنی جیسی دوسری مخلوق کو، جو بنیادی طور پر ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کے ناطے آپس میں بھائی بھائی ہیں ______ کو مارتا ہے، روند ڈالتا ہے، فنا کرتا ہے۔اُس کے مال و جائیداد اور املاک کو ہتھیا کر لے جاتا ہے، شیر بھوکا ہو کر بھی شیر کا شکار نہیں کرتا۔ یہ بات انسان نے ہی اپنائی ہے۔آخر یہ نامہ راہداری یہ قتل و غارت گری کا پرمٹ اور وناش کالی (Destructor) ہونے کا لائینس اُس کو کس نے دیا ہے۔ بنانے والا کوئی اور ہے، یہ بگاڑنے والا اُس کی تخلیق کو فنا کرتا ہے، آخر کیوں؟

شاید اس لیے کہ یہ انسان کبھی کبھی عقل کے جامے سے باہر آ جاتا ہے اور وہ کر گذرتا ہے جو اُسے کرنے کی اجازت نہیں ہے یا اُسے نہیں کرنا چاہیے۔وہ عقل کو پس پشت ڈال کر کبھی ابرہہ بنتا ہے اور ذوالکعبات بنا کر لوگوں کو زبردستی اُس کا طواف کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے اور اس کج فہمی میں اللہ کے گھر کو مسمار (نعوذ باللہ) کرنے کے لیے لاؤ لشکر لے کر نکلتا ہے اور اللہ کی دھتکار کا شکار ہو جاتا ہے۔کبھی یہ سکندر بن کر دنیا کو مطیع بنانے اور اُسے فتح کرنے کے خواب لے کر نکلتا ہے مگر انجام کار اُسے گھر لوٹنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔کبھی ہٹلر بن کر تسخیر ارض کے لیے دنیا کی سب سے بڑی، مسلح اور کثیر تعداد فوج جمع کر کے اپنے جیسے گوشت پوست کے انسانوں کو کچلنے کے لیے نکلتا ہے مگر آخرش اپنی کج فہمی کے ہاتھوں ہی خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔کبھی یہ امریکی ناگ بن کر جاپان کے دو شہروں کے لوگوں کو ڈس لیتا ہے اور سمِ قاتل سے اُن کی تین نسلوں کو اپاہج و ناکارہ بنا کر چھوڑتا ہے۔زمین کو بنجر بنا تا ہے جس سے خود رو گھاس نہیں اُگتی مگر ہم نے دیکھ لیا کہ جاپان آگے سے

زیادہ کروفر کے ساتھ ٹیکنالوجی کی دنیا میں انقلاب لاتا ہے اور پھر اُسی جوش و جذبے کے ساتھ پرانے غم بھول کر آنے والی خوشیوں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ کبھی یہ اسرائیل بن کر مسلم دنیا میں آگ لگا دیتا ہے، خون خراجہ کراتا ہے، اسلام کو بدنام اور مسلمان لیڈروں کو قتل کرا دیتا ہے اور خوف و دہشت پھیلاتا ہے مگر اُس کے باوجود ہر سال لگ بھگ زائد از چالیس لاکھ فرزندانِ توحید زیارت حج بیت اللہ سے مشرف ہو جاتے ہیں۔ اتنی ہی تعداد ماہِ رمضان کے دوران صوم وصلوٰۃ کے اعجاز سے مسرور مخمور ہو جاتی ہے اور پھر اتنی ہی تعداد سال بھر عمرہ کی سعادت سے بھی فیض یاب ہو جاتی ہے۔

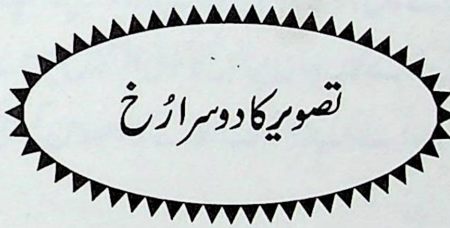
انسان خسارے میں ہمیشہ خود ہی رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کس ڈھنگ سے کس رنگ میں پیش کرے کارِ جہاں پر اُس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ دنیا کا کارواں چلتا رہتا ہے۔ ویسے اُسے اپنے اشرف ہونے کا احساس کم ہی ہوتا ہے۔ بقولِ پروفیسر شاذ شرقی ؎

بنایا اُس کو ہے اشرف خدا نے
نہ سمجھا مرتبت انسان اپنی



تصویر کا دوسرا رُخ

نا مکمل ہے ابھی وردی پولیس کی اے حضور
چوڑیوں کا بھی اضافہ اس میں ہونا چاہیے
(ظریف لکھنوی)


تصویر کا دوسرا رُخ

داستانوں یا لوک کہانیوں (Folk Tales) میں آیا ہے کہ اگلے وقتوں میں کسی ملک میں پہاڑوں سے آنے والے پینے کے پانی کے ساتھ کوتاہ فہمی شامل ہو گئی۔ لوگوں نے وہ پانی پیا اور الٹی سیدھی ہانکنے لگے۔ بادشاہ، اُس کے امراء و وزراء اور درباریوں نے کافی تعداد میں صاف پانی کا ذخیرہ کیا۔ عوام الناس ملوث پانی پینے سے کج فہمی میں مبتلا ہو گئے اور حکومتی ٹولہ شُدھ پانی پینے سے محفوظ رہا۔ مگر اثر الٹا ہوا، لوگ حکومتی ٹولے کو ہی پاگل کہنے لگے۔ بادشاہ نے فوراً کیبنٹ بلا کر مشورہ طلب کیا۔ وزیر اعظم جو عام طور پر کہانیوں اور داستانوں میں معاملہ فہم اور زیرک ہوتا ہے نے مشورہ دیا کہ حکومت کے ہر ایک فرد کو بھی وہی پانی پینا چاہیے جو عام لوگ پیتے آرہے ہیں۔ اُس سے کسی کو ایک دوسرے کے ساتھ کوئی شکایت اور نہ ہی کوئی تفاوت رہے گی۔ دیوانے اور فرزانے کا فرق مٹ جائے گا اور نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ وزیر کے مشورے پر عمل ہوا اور تمام لوگ بلا تخصیص ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔

ریاست جموں و کشمیر کے صوبہ کشمیر میں آئے دن ہڑتال ہوتی رہتی ہے جس سے سارا صوبائی نظام ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مجبوروں، محتاجوں، گھر سے اشد ضرورت کے تحت نکلنے والے لوگوں کو ٹرانسپورٹ نہیں ملتا۔ سڑکوں پر آہ و فغاں مچ جاتا ہے اور دردِ زہ میں مبتلا اکثر بچیاں اور بہنیں کھیتوں کے منڈیروں پر، گاؤں کے گلیاروں میں اور شہر کے فٹ پاتھوں پر درد و کرب سے تڑپ تڑپ کر بے موت مر جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ٹرانسپورٹر بزعم خویش الگ سے بھی ہڑتال کی کال دے دیتے ہیں۔ گاڑیاں بے کار ہو جاتی ہے اور سونی سڑکوں کی کھوئی کھوئی آنکھیں اپنے ماہیوں کے انتظار میں پتھرا جاتی ہیں اور لوگ بہ سبب مجبوری کتنا پیدل سفر کرتے

ہیں اُس کا جواب اُن کے پھپھولے والے پاؤں ہی دے سکتے ہیں۔

اب صورت حال زیادہ ہی تشویش ناک ہوگئی ہے۔اب سرکاری ملازمین بھی ہڑتال کرنے لگے ہیں۔اُن کی ہڑتال ایک دوروز میں اختتام پذیر نہیں ہو جاتی بلکہ وہ لمبی کال دے دیتے ہیں اور نتیجتاً ریاست کا سارا عمل درآمد، ترقیاتی منصوبوں، زیرِتعمیر پروجیکٹوں پر کام، تبادلے، تقرریاں، مقدمات کے فیصلے، راشن کی تقسیم کاری، ٹھیکیداروں، سپلائروں اور کامگاروں کے معاوضے میں تاخیر اور ایسے ہی بیسیوں کام رُک جاتے ہیں۔ان حالات میں ریاست خاص طور پر صوبے کی تعمیروترقی کیسے ہوگی، خوش حالی کیسے آئے گی۔بے روزگاروں کو روزگار، بے کاروں کو کام، بیماروں کو علاج اور محبوسوں کو رہائی کیسے ملے گی۔دردوتکلیف میں بے چینی و بے کل چیختے کراہتے مضطروں کے آپریشن کیسے ہوں گے۔لاکھوں زیرِتعلیم بچوں اور بچیوں کو تعلیم کیسے فراہم ہوگی۔کیا یہ قوم کو جاہل اور پسماندہ بنانے کی ایک دلیل نہیں ہے۔

میں یہ نہیں کہتا ایسی سابقہ یا موجودہ ہڑتال جائز ہے یا ناجائز۔میں صرف اپنے محسوسات اور اپنے تاثرات سے متعلق ایک بات کررہا ہوں۔ملازموں کو دیکھا دیکھی، ٹریڈرس فیڈریشن نے بھی ہڑتال کی کال دے دی۔ٹھیک ہے صاحب مالک ہیں آپ۔چلیے یک نہ شُد دو شُد۔آگے کچھ نون تیل خریدنے پر ملتا تھا اب اُس سے بھی گئے۔اب نہ تیل ہے نہ تیل کی دھار ہے بلکہ غریب جنتا کے لیے پھٹکار ہی پھٹکار ہے۔محکمہ صحت عامہ یا میڈیکل ڈیپارٹمنٹ ہڑتال پر، فوڈ اینڈ سپلائز محکمہ ہڑتال پر، چراغ ماموں یعنی محکمہ بجلی ہڑتال پر، پبلک ہیلتھ انجینئرنگ اور پی ڈبلیوڈی ہڑتال پر، میونسپل کارپوریشن ہڑتال پر، محکمہ امور عامہ، ڈی سی آفس، ڈی آئی سی آفس، محکمہ انڈسٹریز، یوتھ سروسز، آنگن واڑی، ریونیو، ایجوکیشن

اور دیگر بیسیوں ادارے اور محکمے ہڑتال پر ہیں تو پھر باقی کیا بچا ہے ــــــــ

ہاں! ایک محکمہ باقی بچتا ہے جس کے لیے ظریف لکھنوی کہتے ہیں

نا مکمل ہے ابھی وردی پولیس کی اے حضور

چوڑیوں کا بھی اضافہ اس میں ہونا چاہیے

اب اگر پولیس بھی ڈنڈے اور ہتھیار رکھ کر ہڑتال پر جاتی ہے تو مانو معاملے میں یکسانیت آگئی۔ گویا پہاڑ سے آنے والا پانی سب نے پیا اور حساب برابر ہو گیا۔ ذاتی طور پر مجھے حیرانگی ہڑتال کرنے والے ملازموں پر نہیں ہے بلکہ اُن صفائی کرمچاریوں پر ہے جو از خود پرائیوٹ طور سے آکر مختلف محلوں کے گھروں سے صرف ڈسٹ بِن لے کر جا میونسپلٹی کے ڈمپ میں ڈال آتے ہیں اور اس کے عوض وہ ہر گھر سے ماہانہ پچاس روپے وصول کرتے ہیں۔ وہ نہ کسی محکمہ سے وابستہ ہیں نہ اُن کی کہیں رجسٹریشن ہوئی ہے،۔ یہ ایک نجی طور سے کیا ہوا انتظام ہے، لیجیے وہ بھی ہڑتال پر تھے۔

سابقہ اکیس سال میں کارِ سرکار مشکل سے سات آٹھ سال چلا ہوگا اور باقی تمام ماہ وسال ہم نے اپنی ترقی کے، اپنی خوشحالی کے، تعلیم وتربیت کے حتیٰ کہ اپنی عمر کے بھی کھو دیے۔ اب اُن دنوں کے روشن آفتاب کبھی اس صوبے پر طلوع نہیں ہوں گے۔ بذت خود لوگوں نے بھی حالات کو قابو میں کرنے کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دے کر کافی کوششیں کیں تھیں مگر اُن کی کوئی کوشش بار آور ثابت نہیں ہوئی۔ وہ ہماری بدنصیبی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے جن پڑوسیوں نے گھر بار چھوڑ دیے، مال وجائیداد چھوڑ دیا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پردیس کو گلے لگا دیا۔ عطر بیز ہوائیں چھوڑ کر لو سے جھلستے رہے۔ پھولوں کی دوستی کو خیر باد کہہ کر کانٹوں سے یاری کی اور آرام دہ مسہریوں کو بھول کر ریت کا اوڑھنا بچھونا اپنایا وہ آج

(خاص کر تعلیمی میدان میں) کہاں ہیں، گویا____؟

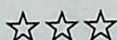
ہم تو بی اے میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

اس حقیقت میں ہر گز دو رائے نہیں ہو سکتی ہے کہ 'تنگ آمد بہ جنگ آمد'۔ مظلوم اولاً ظلم سہتا ہے۔ تکالیف کو برداشت کر لیتا ہے اور زیادتیوں پر صبر کرتا ہے۔ مگر جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر بھڑک اٹھتا ہے، بغاوت کرتا ہے اور آگے پیچھے دیکھے بغیر آگ میں کود پڑتا ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ مظلوم کا اسلحہ پتھر اور احتجاج ہڑتال کے روپ میں منظر عام پر آ جاتا ہے۔ تو عرض کر رہا تھا کہ ویسے بھی ملازمین میں اکثر زیرک، معاملہ فہم اور دانشور ہیں۔ وہ یونہی ساری ریاست کو کیسے بلیک میل کر سکتے ہیں۔ کس طرح تکلیف میں ڈال سکتے ہیں۔ ہاں! ایسا ضرور ہے کہ بقول ساحر____ے

مجبوریٔ حالات اِدھر بھی ہیں
مجبوریٔ حالات اُدھر بھی ہیں

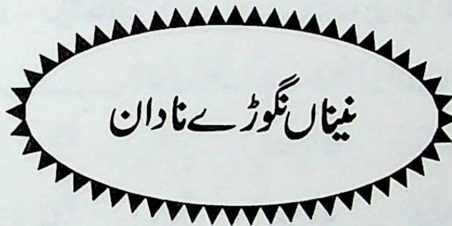
یہ گوش گذار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر جوش کے ساتھ ہوش بھی رکھا جائے اور پسند کرنے سے پہلے تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھا جائے تو کیا حرج ہے۔ جناب یوسف راز کا کہا ہے کہ ے

صحنِ چمن میں رکھیے قدم پھونک پھونک کر
ہر سمت اب تو کانٹوں کے انبار ہو گئے



نیناں نگوڑے نادان

لگائی اے صیاد تو نے کتنی پابندی
قفس میں طائرِ ناداں شکستہ پر کے لیے
(قمر رئیس بہرائچی)


نیناں نگوڑے نادان

آٹھویں صدی عیسوی کے ابتدائی برسوں میں ایک دن ____ بلخ کے پُر ہجوم، حسین اور شاندار بازار میں خوب گہما گہمی تھی۔ لوگوں کی چیخ وپکار، خرید وفروخت اور سودا کے لین دین یا طے کرنے کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لوگ آرہے تھے۔ لوگ جارہے تھے۔ کوئی اونٹ یا گھوڑے پر سامان بار کر کے لے جاتا تھا تو کوئی گدھے پر سامان لاد کر بیچنے کے لیے آرہا تھا۔ زیادہ تر سامان کا لین دین مبادلہ (Barter system) کے ذریعے سے ہورہا تھا۔ بازار میں ہر طرح کا سامان تھا۔ کمہاروں کے مٹی کے برتن کافی جاذب نظر تھے۔ بہشتیوں کے پیچھے پانی پینے کے لیے بچے لگے ہوئے تھے۔ کہیں حقے کے کش لگ رہے تھے اور کہیں قہوہ خانوں میں معطر مشروبات کی خوشبو فضا میں بکھر کر ہیجان بپا کر رہی تھی۔ اچھی خاصی بھیڑ بھاڑ اور ہنگامہ آرائی تھی۔ اسی بازار میں ادھم نامی ایک جوتے گانٹھنے والا نوجوان موچی بھی اپنے کام میں مصروف و مست تھا۔ اُس کا روشن ماتھا، نورانی چہرہ اور سرمئی آنکھیں ہر گذرنے والے کو ایک طائرانہ نظر اُس پر ڈالنے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ اتنے میں یکبارگی خاموشی چھا گئی۔ ساری گہما گہمی اور شور شرابہ تھم گیا۔ لوگ دوکانوں کے پاس سے ہٹ آئے اور سڑک پر دو جانب سر جھکائے قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔ ادھم بھی اُٹھا اور اپنی دوکان کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک اچٹتی سی نگاہ سے دیکھا کہ سونے سے جڑاؤ ایک تختِ رواں چار عمدہ گھوڑوں پر کسا ہوا چلا آرہا ہے۔ اُس پر ایک عماری رکھی ہوئی ہے جس کے مہین اور قیمتی پردوں پر مزین جواہر آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہے ہیں۔ جلو میں خوبصورت غلام اور کنیزیں۔ خوش جمال خادم اور باندیاں دائیں بائیں سواریوں پر بیٹھی تختِ رواں کے ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ اُن کی چال میں ایک

جمال، انداز میں ایک تمکنت اور پہرہ داری میں ایک انفرادیت جھلک رہی تھی۔ جلوس شانِ بے نیازی کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔

تخت رواں جونہی ادھم کی دوکان کے سامنے پہنچا تو عماری کے اندر سے نازک انگلیوں نے ایک آبی رنگ کی چلمن کو ذرا سا سرکایا۔ ایک پری رو دوشیزہ کا چہرہ نمایاں ہوا جو ماہتاب کی طرح روشن تھا۔ ادھم نے بھی غیر اختیاری طور پر نگاہ اٹھائی۔ اُس کی نگاہیں ادھم کی نگاہوں کے ساتھ لمحہ بھر کے لیے چار ہوئیں۔ بس پھر کیا تھا، ایک قیامت آ کر گذر گئی۔ چند لمحوں کے لیے دونوں کا رنگ اُڑ گیا۔ کیوپڈ نے بیک وقت و جنبش دو تیر چلائے اور دونوں جوان دلوں کو میٹھی دھڑکنیں سونپ دیں۔ تختِ رواں آگے بڑھا، چلمن برابر ہوگئی۔ بے تابیاں، بے چینیاں بڑھ گئی۔ دیدارِ شوق نے صبر و قرار پر بجلیاں گرادیں۔ شہزادی ریگا صحرا کی جانب چہل قدمی کی خاطر چل دی اور ادھم گذرتے ہوئے کارواں سے اٹھنے والے غبار میں اپنے دل کی لُٹی ہوئی دنیا کے خدوخال تلاش کرنے لگا۔

ادھم اپنی معمولی جھونپڑی میں تمام رات جاگتا رہا۔ وہ اکثر راتوں کو کام میں مشغول رہا کرتا تھا تا کہ عجلت پسند گاہکوں کو اُن کے جوتے صبح کو حوالہ کر سکے مگر اُس دن اُس کی نیندیں غائب اور صبر و قرار لٹ چکا تھا۔ وہ اس بات پر زیادہ پریشان و پشیمان تھا کہ اگر عاشق ہونا ہی تھا تو کیا عشق کرنے کے لیے شہزادی ہی رہ گئی تھی۔ رات بھر بے قراری میں جاگ کر صبح کے قریب اُس نے اپنے سر کو زمین پر رکھ دیا اور اشک بار آنکھوں سے خدا کے حضور دُعا کرنے لگا۔

''اے غریبوں اور بے کسوں کے مالک اگر میں اپنے محبوب کو دوبارہ نہیں دیکھ سکتا تو مجھے موت دے دے۔ مجھے اُسے پانے کی خواہش نہیں ہے صرف ایک بار پھر دیکھنے کی ہوس ہے۔ میں اِس کے سوا اور

کچھ نہیں چاہتا ہوں۔"

اُدھر دوسری طرف بھی وہی حال تھا۔شہزادی متاسف تھی کہ وہ کہاں دل لگا بیٹھی۔معمولی آدمی ہونے کے بجائے اگر اُس کا محبوب کوئی رئیس زادہ، وزیرزادہ ہوتا تو وہ اپنے والدین کو راضی کر سکتی تھی۔یہ امر کس قدر ناممکن ہے اور کس قدر نامناسب، ناروا اور احمقانہ قدم ہے۔میں اپنا یہ بھید کس پر ظاہر کروں ______ کر ہی نہیں سکتی۔وہ متاسف ہو کر سوچنے لگی کہ اگر وہ اپنا بھید ظاہر کرے بھی تو بدلے میں اُسے دُھتکار ہی ملے گی۔وہ اُس رات سو نہ سکی اور اُس کے بعد یہی معمول بنتا گیا۔اُس کی بھوک بھی اڑ گئی اور وہ کمزور ہوتے ہوتے کھاٹ سے لگ گئی۔پھر ایک دن ماتمی باجوں کی آواز بلند ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر سوگوار ہو گیا۔گل اندام ریگا کی حیات کا سلسلہ جواں مرگی اور اتنی جلدی منقطع ہونے پر سب افسوس کر رہے تھے۔تمام مملکت سوگوار تھی، غم اندوہ میں ڈوبی ہوئی تھی اور ماتم زدہ تھی۔

ادھم کو اگرچہ اپنے محبوب کے دیدار کی موہوم امیدیں تھی مگر اب وہ اُس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں تھیں۔اُس کے دل میں صرف افسوس تھا اور حسرت کی آگ دہک رہی تھی۔وہ لاکھ آنسو بہاتا مگر اُسے کسی پل چین نہیں آتا۔اُس کا صبر وقرار لُٹ چکا تھا۔اُسے اپنی زندگی بے معنی اور بے مقصد لگ رہی تھی۔وہ سوچنے لگا کہ اُس کے زندہ رہنے کا کیا فائدہ ہے جس میں اپنے محبوب کو صرف ایک بار دیکھنے کی آس بھی نہ ہو، کوئی موہوم سی اُمید بھی نہ ہو۔وہ بدحواسی کے عالم میں دن بھر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا اور پھر رات کو ریگا کی قبر پر جا کر جان دینے کے لیے پہنچ گیا۔رات کا وقت تھا ہر طرف تاریکی تھی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔عیسائیوں نے قبرستان کے لیے ایک الگ تھلگ جگہ منتخب کی تھی۔وہ سوچنے لگا کہ وہ اتنا روئے

گا تا کہ روتے روتے ہی اُس کی جان نکل جائے گی۔ ایکبارگی اُس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرف لپکا، سوچنے لگا کہ مرنے سے پہلے محبت کے نام پر اپنا خاتمہ کرنے سے پہلے وہ ریگا کو ایک بار صرف ایک بار دیکھے گا اور اُسے ایک بوسہ دے گا جو ایک لاثانی مگر ناکام محبت کی نشانی ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد اُس نے حیرت ناک توانائی کے ساتھ شہزادی کی قبر کو کھودا، تابوت کو کھولا، چہرے کے کپڑے کو ہٹایا ____ اور ذوق وشوق، سرومستی کے عالم میں اپنے چہرے کو ریگا کے چہرے کے ساتھ لگا لیا اور پھر ایک الوداعی بوسے کے لیے اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیے مگر ____ مگر یہ کیا۔ ریگا کا ماتھا گرم تھا۔ ہونٹوں میں ہلکی سی لرزش تھی جو صرف محسوس کی جاسکتی تھی کیونکہ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ادھم نے اُس کی نبض ٹٹولی، ابھی کچھ حرارت باقی تھی۔ اُس کی خوشی کا اور کیا مقام ہوسکتا تھا۔ اُس نے ریگا کو تابوت سے نکالا۔ قبر کو برابر کیا اور اُسے اُٹھا کر گھر لے آیا جہاں ریگا نے آنکھیں کھولیں۔ ادھم نے اُسے سارا واقعہ سُنایا، اپنے بارے میں، اپنی حالت کے بارے میں اور اپنے ارادے کے بارے میں ہر ایک تفصیل بتا دی۔ ریگا نے ممنونیت سے اُس کا ہاتھ چوما اور پھر اپنی بات، اُس کی جُدائی میں حالت اور اپنے دل کے داغ دکھائے۔ ریگا نے جھونپڑی میں رہنا قبول کرلیا۔ دونوں کے دلوں کی مراد بھر آئی۔ بعدازاں دونوں کی شادی ہوگئی۔ چند برس کے بعد لوگ اور بذاتِ خود شاہی خاندان کے افراد ریگا کی موت کو بھول گئے۔

ایک دن ریگا کی ماں حمام بھی تھی۔ ایک بھولا بھالا چھوٹا بچہ کھیلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ چونکہ بچہ ریگا کے ساتھ مشابہ تھا اس لیے ملکہ کو اُسے دیکھتے ہی اپنی بیٹی ریگا یاد آگئی۔ وہ زاروقطار رونے لگی۔ جب جی کچھ ہلکا ہوگیا تو اُس نے وہ بچہ گود لینے کا فیصلہ کرلیا.........

(۲)

ملکہ نے لوگ ہر طرف دوڑائے اور آخرش سرکاری کارندے تلاش کرتے کرتے ریگا کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے اسے پہچان لیا۔ اُسے حالات سے باخبر کر کے ماں کے پاس لایا گیا جو بیٹی کو زندہ دیکھ کر اُس کے ساتھ دیوانہ وار لپٹ گئی اور ملے جلے حیرت اور فرطِ خوشی کے اثرات سے بے ہوش ہوگئی۔ سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔

ادھم اور ریگا نے گرچہ محل میں رہنا قبول نہیں کیا مگر ظاہری طور پر اُن کے دن پھر گئے۔ عیش وعشرت کی فراوانی ہوگئی اور یوں دن گذرتے گئے۔ چونکہ بادشاہ کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے پھر ایک دن بڑا ہو کر وہی بچہ امیر شہر مقرر ہو کر اپنے نانا کے تخت پر بیٹھا اور بادشاہ بن گیا۔ لیکن اُس نے جلد ہی بادشاہت ترک کر کے فقیری اور درویشی اختیار کی۔ اُس کا شمار بہت مقدس اور بزرگ ترین صوفیوں اور مشائخ میں ہوتا ہے۔ درویشوں کے مشہور سلسلہ ''ادھمیہ'' کے بانی کی حیثیت سے ابراہیم ادھم کا نام آج بھی مشہور ہے۔ آج بھی اُنہیں عزت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت علی بن عثمان الہجویری عرف داتا گنج بخشؒ کی تصوف پر بنیادی کتاب کشف المحجوب میں وہ ابراہیم ادھمؒ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''آپ بلخ کے امیر تھے۔ ایک دن شکار کے لیے نکلے۔ ایک ہرن کے تعاقب میں گھوڑا ڈال دیا۔ اور لشکر سے بچھڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہرن کو قوت گویائی عطا فرمائی، اُس نے بزبان فصیح کہا: 'اے ابراہیم کیا تم اِسی کام کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔' یہ بات آپ کے توبہ کا سبب بنی

اور آپ نے اُسی وقت دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر کے زہد و ورع کی زندگی اپنالی۔ حضرت فضیل بن عیاضؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی صحبت اختیار کی۔ توبہ کے بعد اپنے ہاتھ کی کمائی کے سوا کچھ نہ کھایا۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے آپ کے بارے میں فرمایا کہ ابراہیم ادھمؒ معرفت کے علوم کی کنجیاں ہیں۔ بذاتِ خود آپ خالص توحید کے علمبردار تھے۔ آپ کا فرمانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صحبت اختیار کر کے لوگوں کو ایک طرف چھوڑ دو۔ مطلب یہ کہ حق تعالیٰ کے ساتھ جب بندے کا تعلق خاطر دُرست ہو اور اُس کی محبت میں اخلاص ہو تو حق تعالیٰ سے یہ صحیح تعلق، خلق سے کنارہ کشی کا مقتضیٰ ہوتا ہے''۔

آپ نے بکثرت قدمائے مشائخ کی صحبت پائی اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں حاضر ہو کر تحصیل علم کیا۔ آپ کا کہنا تھا کہ جس نے نفسانی خواہشات کو نکال پھینکا وہ رحمت الٰہی سے بہرہ ور ہو گیا۔

رنگ، مذہب، اعتقاد الگ الگ ہو سکتے ہیں مگر بنیادی طور پر بنی نوع انسان اولادِ آدم ہے۔ اُس میں چھوٹے بڑے اور اعلیٰ ادنیٰ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ذات برادری اور اونچ نیچ مطلب پرست اور خود غرض آدمی کی پیدا کردہ زنجیریں ہیں۔ وہی خود غرض آدمی 'جس کی لاٹھی اُس کی بھینس' کے مقولے کو جنم بھی دیتا ہے۔ اور اُس پر عمل پیرا بھی رہتا ہے۔ وہی ایک گھٹیا اور ایک کو بڑھیا بناتا ہے۔ ایک مالک بن کر دوسرے سے خدمت کرواتا ہے۔ فصل ایک اُگاتا ہے مگر دوسرا اُس پر قبضہ کر لیتا ہے اس لیے کہ اُگانے والا گھٹیا ذات سے ہے، بغیر تنخواہ کے ملازم ہے، خدمت پر مامور اور وہی خدمت اُس کی زندگی ہے۔ بغیر ہاتھ پیر

ہلائے مالک بننے والا اونچی ذات کا ہے۔ مالک ہے، گاؤں کا راجہ ہے۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے؟۔

دنیا کے تمام انسانوں کے قد، کاٹھ، رنگ نسل بے شک جداگانہ ہیں۔ ایک گورا ہے، ایک کالا ہے، ایک گندمی ہے ایک سانولا ہے مگر اعضاء سب کے ایک جیسے ہیں۔ خون سب کا سُرخ رنگ کا ہے۔ کسی انسان سے نیلے پیلے یا سبز رنگ کا خون نہیں نکلتا۔ پھر یہ بٹوارہ کیا ہے، کیوں ہے؟ جب ہر ایک چیز ایک جیسی ہے، سب کا خون سرخ رنگ کا ہے پھر ہریجن کم تر اور برہمن یا راجپوت برتر کیسے ہوگیا۔ شیخ اور سید سید میں تفاوت کیوں ہے۔ چھوت چھات انسانی سماج میں دراڑیں ڈال دیتا ہے جب کہ خالق کائنات کی تخلیق اور دین اِن حرف گیریوں سے پاک و صاف ہ، خالص ہے۔ ریگا اور ادھم اگر بھارت واسی ہوتے تو پھر یہ لازوال داستانِ عشق تاریخ کے صفحات پر ہرگز نہ جھلملاتی، کبھی نہ رقم ہوتی کیونکہ یہاں ذات پات ہے، چھوت چھات ہے، قدرت کی نعمت یعنی پانی کی تقسیم کاری ہے۔ ایک ہی گاؤں میں رہنے والے، ایک ہی دھرتی پر بسنے والے، ایک ہی کھیت کا اناج کھانے والے، ایک ہی گائے کا دودھ پینے والے اور ایک ہی ہوا میں سانس لینے والے، کے کنویں الگ الگ ہیں۔ پانی الگ الگ ہے، ایک کا برتن دوسرے کے برتن کے ساتھ ملنا نہیں چاہیے۔ ایک کا ہاتھ، پاؤں یا شریر کا کوئی انگ دوسرے کے شریر کے ساتھ مس نہیں کرنا چاہیے۔ بھگوان سب کا سانجھا ہے۔ ایک مندر میں ماتھا ٹیکنے جا سکتا ہے مگر دوسرے کو بھگوان کے درشنوں کی مناہی ہے۔ دھارمک گرنتھ ایک پڑھے تو واہ واہ، دوسرا پڑھے تو اُس کی زبان گُدی س کھینچ لی جاتی ہے۔ اور اگر کان سُنیں تو اُن میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا ہے۔ کیا ہے یہ؟ کتنی مضحکہ خیز اور چھچھوری بات ہے یہ۔ گائے، بیل، ہاتھی، گھوڑے کی خیر الگ بات ہے مگر

انسان کی اولاد کو انسان ہی ہونا چاہیے، انسان ہی رہنا چاہیے۔ اُسی میں شرفِ انسانیت ہے۔ اُسی میں بقائے آدمیت ہے۔

ذات برادری کی اِس تقسیم نے انسانی سماج پر بہت بُرے اور منفی اثرات ڈالے ہیں۔ جب چھوٹا بڑا، اعلیٰ ادنیٰ اور پاک ناپاک کا تصور قائم ہو جاتا ہے تو اُس صورت میں سماج میں یک زہر آلود استحصالی کشمکش کی شروعات ہو جاتی ہے اور انسانی وسماجی اقدار مجروح ہو جاتے ہیں۔ موجودوقتوں میں اس ذات برادری نے ایک طبقے پر حد سے زیادہ نقصان دہ اثرات مرتب کیے ہیں۔ اونچی ذات حکومت ساز اور حکمران ہونے کے سبب اپنا کوٹا لے جاتی ہے۔ پسماندہ ذات کے لوگ اپنا آئینی ریزرویشن کا کوٹا لے جاتی ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں ذات برادری یا اونچ نیچ کی طبقاتی تقسیم کاری نہیں ہے اس لیے بیچ میں وہی مارا جاتا ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کے تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہونے کا سبب بھی یہی ہے کیونکہ پڑھ لکھ کر جب اُسے روزی روٹی کی سبیل نہیں ہو پاتی تو وہ پیٹ پالنے کی خاطر راج مستری، ترکھان، رنگ ساز وغیرہ بن جاتا ہے۔ اس لیے جب اُسے معلوم ہی ہے کہ پڑھ لکھ کر کچھ ہونے والا نہیں ہے تو پھر وقت ضائع کرنے کی بجائے کیوں نہ شروع میں ہی اُس لائن میں مہارت حاصل کر لی جائے جو بعد میں بہرصورت اُس کی روزی روٹی کا ذریعہ بننے والا ہوتا ہے۔

اور قمر رئیس بہرائچی کے الفاظ میں

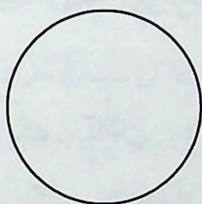
لگائی اے صیاد تو نے کتنی پابندی
قفس میں طایرِ ناداں شکستہ پر کے لیے

ریاست جموں و کشمیر میں بھی اب ضلع سطح کی ریزرویشن نے ایک شہری باشندے کے لیے تمام تر رکاوٹیں بیچ میں کھڑی کر کے اُسے سڑک پر لا کر اور

چھاپڑی لگا کر 'بنگلہ دیشی' مال بیچنے کے لیے بے بس و مجبور کر دیا ہے۔ کیونکہ اگر کبھی شہر میں دس پانچ نوکری اسامیاں نکل میں آئیں گی تو اُس میں جب ریزرویشن کا فارمولہ اپلائی کیا جائے گا تو ایک عام مسلمان شہری باشندے کے لیے چپراسی کا پوسٹ حاصل کرنا کارے دارد والا معاملہ بن جائے گا۔ ویسے بھی شہر میں گاؤں کی طرح کون سے نئے کالج اور اسکول کھلتے ہیں اور اسکول اپ گریڈ ہوتے ہیں۔ نئے دفتر بنتے ہیں، نئی وزارتیں مقرر ہوتیں ہیں، نئی ڈسپنسریاں قائم ہوتی ہیں، آشائیں جگتی ہیں اور پنچایتیں بنتی ہیں۔ مرکزی سرکار کی سکیمیں لاگو ہوتی ہیں۔ ہر گھر کو سال میں سو کام دن ملتے ہیں۔ مختلف اشیاء پر سبسیڈی ملتی ہے۔ شہر بس نام کا ہی شہر رہ گیا ہے جس میں ایک شریف شہری زندہ درگور ہو گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محبوب راہی۔

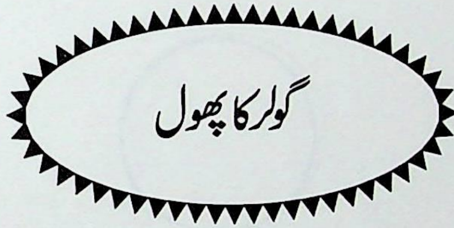
اُلٹ کے دیکھے قالین وضعداروں کے
شکستہ فرش پھٹے بوریے نکلتے ہیں

☆☆☆



گولر کا پھول

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک شب
ہنس کر گذار یا اُسے رو کر گذار دے
(ذوقؔ)


گولر کا پھول

یہ تب کی بات ہے ـــــــــــ

مغلیہ دور حکومت اگر چہ زوال پذیر ہو رہی تھی مگر ابھی مکمل طور سے کالے سایوں نے اِسے ڈھک نہیں لیا تھا۔ قلعہ معلیٰ کے شب و روز کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ محفلیں سجتی تھیں، مشاعرے ہوتے تھے۔ ہر طرح کے تہوار منائے جاتے تھے۔ انعام و اکرام کی سخاوت بھی جاری تھی اور شاہی فرمان بھی نافذ ہو رہے تھے۔ قلعے میں گنگا جمنی تہذیب کی بہار رنگِ یگانگت سے معمور گل بداماں تھی۔ پیشوازیں جھلملاتی تھیں اور گھونگٹ کی اوٹ سے مسرور و مخمور سحر آگیں نغمے پھوٹتے تھے۔ چاہتوں کے آشیانوں میں دلوں کے بسیرے تھے۔ عشق کی بے قراریاں بھی تھیں اور محبت کے رنگین عنوان بھی رقم ہو رہے تھے۔ حُسن کی عشوہ طرازیاں بھی تھیں اور عاشق کی بے تابیاں بھی دلوں کے نذرانے لیے راہِ شوق سجائے منتظر التفات تھے۔

اُنھی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر کے دربار میں یعنی قلعہ معلیٰ میں مشاعرہ تھا۔ بادشاہ نہ صرف شعر و سخن کے دلدادہ تھے بلکہ بذات خود بھی ایک اعلیٰ پائے کے سخنور تھے۔ مشاعرے میں ایک کہنہ سالہ اور زندہ دل شاعر آغا جان عیش نے یہ شعر پڑھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اِسے بھی گذار دے

اُسی مشاعرے میں تھوڑی دیر کے بعد اپنی باری پر اُستاد ذوقؔ نے اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا۔

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک شب
ہنس کر گذار اِسے یا رو کر گذار دے

اب تو یہ معلوم نہیں کہ استاد ذوقؔ کو ایک ہی محفل میں دوسرے شاعر کے شعر پر تضمین کرنے یا بذلہ سنجی کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی مگر یہ بہر صورت ایک حقیقت ہے کہ اُستادوں کے رنگ ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں۔ انہیں زبان وادب، الفاظ کی تراش خراش، تلمیحات وتراکیب، امثال وعلامات اور فی البدیہہ شعر داغنے کی صلاحیتیں نہ ہوتو وہ اساتذہ کی صف میں کیسے بیٹھنے کے حقدار ہوسکتے ہیں۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ننھی خانم کی ساس قلعہ معلیٰ کے باورچی خانے کے انتظام میں شامل تھی۔ ننھی خانم نے بھی اپنی ساس کی دیکھا دیکھی قلعہ معلیٰ میں جانے کی خواہش کی۔ اپنے میاں کی اجازت لے کروہ ساس کے ساتھ لال قلعہ جانے لگی۔ اس لیے اُنہیں وہاں کے اندرونی زندگی، مشاغل، شب وروز کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ سید ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم نے ننھی خانم کی زبانی سُنی ہوئی باتیں، حالات وواقعات اور لال قلعہ کے شب وروز سے متعلق اُس رنگین دور کی جھلکوں کو قلمبند کیا ہے۔ ننھی خانم کی بیان کردہ کچھ باتیں فراق دہلوی مرحوم کے الفاظ میں قارئین کے لیے پیش خدمت ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ انہیں پڑھ کر ضرور محظوظ ہوں گے:

”برسات کی رُت میں جہاں پناہ مہرولی تشریف رکھتے تھے۔ شمسی تالاب کے کنارے ڈیرے خیمے لگے ہوئے تھے۔ زنانہ باورچی خانہ بھی ساتھ گیا ہوا تھا۔ میری ساس اور اُس کے ساتھ میں بھی تھی۔ ایک چھوٹا سا خیمہ ہمیں بھی دیا گیا تھا۔ ایک روز جب حضور والا اور خاص بیگمیں دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرنے لگیں تو میں خیمہ کی اگنائی میں کچھ سنیا پرونا لے کر بیٹھ گئی۔ بقچی کھولی تو دیکھا کہ قینچی کو زنگ لگ گیا ہے۔ سوئیاں بھی سب زنگ کھائی ہورہی ہیں۔ ایک سوئی کو لے کر

پتھر کی کنل سے جو اگنائی میں ہزاروں پتھروں اور اینٹوں میں پڑی ہوئی تھی گھِسنا شروع کیا۔ سوئی آناً فاناً میں صاف ہو کر چمکنے لگی۔ میں نے اُس میں دھاگا پرو کر سِنیا چاہا تو سوئی کپڑے میں جا کر ٹیڑھی ہو گئی۔ میں نے اُسے سیدھا کیا اور پھر ٹانکا بھرا تو اب کے وہ دوہری ہو گئی۔ تنگ آ کر میں نے اُس سوئی کو رکھ دیا اور دوسری سوئی سے سینے لگی۔ اتنے میں میری ساس ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے خیمہ سے باہر آئیں تو میں نے اُس سے کہا:

''اماں جان یہ کیا تماشہ ہے۔ سوئی پتھر پر رگڑنے سے پیتل کی ہوگئی''

میری ساس نے سوئی کو ہاتھ میں لے کر کہا:

''رکھ لو جہاں پناہ قیلولہ سے اُٹھیں گے تو حضور میں پیش کریں گے''۔

تین بجے اُٹھ کر حضور نے ظہر کی نماز ادا کی۔ میری ساس تسبیح خانہ میں گئی اور جہاں پناہ کے سامنے سوئی رکھ کر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوگئیں۔ جہاں پناہ کے اشارے پر میری ساس نے سوئی کا قصہ بیان کیا۔ جہاں پناہ بولے ______ ''اماں یہ سوئی سونے کی ہوگئی ہے اور وہ پارس پتھر تھا جس نے اِسے سونا بنا دیا۔ اچھا بتاؤ تمہارا ڈیرہ کتنی دور ہے''۔

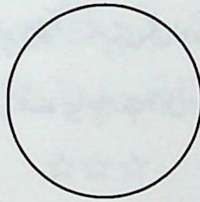
حضور والا اور زینت محل بیگم قنات قنات میری ساس کے ساتھ ہوئیں۔ خبردار کی صدا سُن کر میں نے دوپٹہ اوڑھ لپیٹ لیا اور سر جھکا کر ادب سے کھڑی ہوگئی۔ میں نے دیکھا کہ حضور کے سر پر چار گوشہ کا مغلیہ تاج ہے اور ہاتھ میں زمرد کی تسبیح ہے۔ ہماری قنات میں حضور آ گئے تو میں نے آداب بجا لیا۔ میری ساس نے کہا'' یہ لونڈی کی بہو ہے اور

اُسی کے ہاتھ میں لوہے کی سوئی سونے کی ہوگئی۔ جہاں پناہ نے پوچھا:
''بہووہ کنل تُو نے کہاں سے اٹھائی تھی''۔
میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آخر جی مضبوط کر کے میں نے ساری بات بتا دی۔ حضور کے پیچھے سے زینت محل بیگم کھڑی تھیں جن کے ڈھیلے پائچوں کو چھ خواصیں سنبھال رہی تھیں۔ ایک لونڈی کے ہاتھ میں حقہ تھا اور ایک لونڈی پیچوان کے چولہ کو تھام رہی تھی۔ یاقوت کی منہال ملکہ بیگم کے مُنہ سے لگی ہوئی تھی۔ بیگم نے حقے کے دو تین ہی گھونٹ (کش) لیے ہوں گے کہ خوشبو سے تمام خیمہ اور قنات معطر ہوگئی۔ خواجوں نے حضور والا کے حکم سے ایک ایک کنل، ایک ایک بٹیہ، ایک ایک سنگ ریزہ اُٹھا کر لوہے پر رگڑا مگر پارس پتھر نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ جب حضور والا خیر سے لال قلعہ پلٹ آئے تو وہ سوئی فرنگیوں کو دکھا کر کہتے تھے:
''آپ صاحبان پارس پتھر اور کیمیاء کے قائل نہیں ہیں مگر تجربہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں دنیا میں موجود ہیں مگر کسی نہ ملیں۔''
زنانہ بھنڈار خانہ کی داروغہ کے پاس ایک غریب عورت نوکر تھی جو کوئیلوں کا تھیلہ اور تمباکو کا ڈبہ داروغہ کے ساتھ ساتھ لیے پھرتی تھی۔ ایک دن لال قلعہ کی بارہ دری میں بیٹھ کر جہاں پناہ نے حقہ طلب کیا۔ داروغہ نے تھیلی والی کو غائب پایا اور اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ ایک طرف جہاں پناہ کا حکم عدولی کا خوف، دوسری جانب نوکرانی غائب۔ داروغہ روہانسی ہوگئی کہ اتنے میں وہ عورت ہانپتی کانپتی حاضر ہوئی اور اُس نے بتاتا کہ ''میں نے باغ میں گولر کے درختوں کی جانب یونہی

دیکھا تو مجھے گولر کی پھنگ پر چکی کے پاٹ کے برابر ایک چیز گول مول انگارہ کی طرح دہکتی نظر آئی ۔ میرا کلیجہ دھڑ کنے لگا اور میں بھاگم بھاگ آئی‘‘ ۔ داروغہ نے حقہ تازہ دم کر کے جہاں پناہ کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد اُسے بتایا کہ آج دیوالی کی رات ہے اور گولر کا پھول اسی رات کو کھلتا ہے ۔ مگر نظر بہت کم آتا ہے ۔ اگر وہ مرد کو نظر آجائے تو وہ بادشاہ ہو جاتا ہے اور عورت کو نظر آجائے تو وہ رانی بنتی ہے ۔ سچ مان تیری قسمت بدلنے والی ہے نوج ، موٹی لپاٹن ۔

بہر حال گولر کا پھول اصل میں پھولتا ہے یا نہیں اور اثر رکھتا ہے یا نہیں ، مگر اتفاق دیکھیے کہ چند روز میں وہ عورت جہاں پناہ کی منظور نظر ٹھہری اور فرش سے اُٹھ کر عرش پر بیٹھ کر بیگم بن گئی اور قلعہ معلّٰی کی ملکاؤں میں شامل ہو گئی ۔ سچ کہتے ہیں جسے پیا چاہے وہی سُہاگن ....

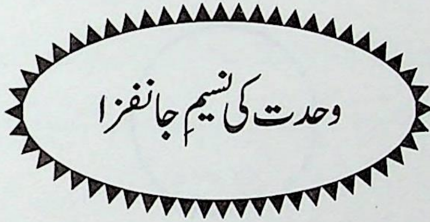




وحدت کی نسیمِ جانفزا

وحدت کی لے سُنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عربؐ کو آئی تھی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

(اقبال)


وحدت کی نسیم جانفزا

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر سن ۶۲۲ء میں عمل میں آئی اور اُس کی تعمیر کے صرف سات سال کے بعد جنوبی ہندوستان میں کیرالہ کے مقام پر بھی ایک مسجد کی تعمیر ہوئی جس کو جامع مسجد چیرامن پیرومل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ مسجد کوڈنگلور کے قصبہ میتھلا میں کوچین کی بندرگاہ سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر شمال کی جانب نیشنل ہائی وے نمبر ۱۷ پر واقع ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کے اختتام اور ساتویں صدی کے آغاز میں کیرالہ کے کوڈنگلور علاقہ پر چیرا خاندان کی حکومت تھی۔ اُسی خاندان سے ایک مشہور راجہ چیرامن پیرومل بھاسکر روی ورما گذرا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بڑا انصاف پسند، رعایا پرور اور خدا ترس تھا۔ اُس کے راج میں امن وامان اور خوشحالی تھی۔ رعایا کو سماجی آزادی کے ساتھ ساتھ مذہبی آزادی بھی حاصل تھی۔ بوجہ عوامی بہبود و بھلائی اور رواداری بذات خود راجہ کی زندگی بھی بڑی آسودہ اور پُرسکون تھی۔ راجہ پیرامن پیرومل کیرالہ کے اعلیٰ شاہی خانوادے سمُدری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ راجہ اپنی رانی کے ہمراہ محل کی چھت پر ٹہل رہا تھا تو اُس نے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ دیکھا۔ ایک دوسری روایت ہے کہ ایک رات راجہ نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا کہ چاند دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ وہ نیند سے بیدار ہو گیا اور اُس کی بقیہ رات جاگتے اور بے چینی کے عالم میں ٹہلتے ہوئی گذری۔ نجومیوں سے اِس انوکھے خواب کی تعبیر دریافت کی مگر وہ کسی کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

کیرالہ کی قدیم بندرگاہ پر چینی، رومی، یونانی تاجروں کے علاوہ عرب تاجر طلوعِ اسلام سے قبل بھی آیا کرتے تھے۔ انہی دنوں راجہ کے دربار میں پیش ہونے

والے عرب مسلمان تاجروں میں سری لنکا سے واپس آنے والے تجار کے امیر شیخ سیقو الدین بھی تھے۔ راجہ کے استفسار پر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، تعلیمات اور وجہ شقِ القمر کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو وہ بہت متاثر ہوا اور خواب میں ہی سہی معجزے کو دیکھنا اُس نے اپنی خوش بختی اور سعادت سے تعبیر کیا۔ کچھ عرصہ تک وہ سُنے ہوئے حالات و واقعات سے متعلق بہت تذبذب میں رہا مگر اس دوران اسلام کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتا رہا۔

بادشاہ پیرامن پیرومل نے دل سے اسلام قبول کر کے اپنا نام تاج الدین رکھا اور مشرف بہ اسلام ہونے اور اپنی روانگی کو راز میں رکھ کر اپنے چند خاص معتمدین کو اعتماد میں لے کر، اپنے بھتیجے کو تخت و تاج سونپ کر ایک عربی جہاز میں اپنی نشست مخصوص کروا کر وہ مکہ معظّمہ کے لیے عازم سفر ہوئے اور تاج الدین کی جگہ خود کو عبداللہ سمُدری کہلانا ہی پسند کیا۔ مکہ مکرمہ میں عبداللہ سمُدری کے پہنچنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرفِ ملاقات کا تذکرہ صحابی رسول ابو سعید خُدریؓ نے بھی کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک ہندوستانی راجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بوتل پیش کی جس میں ادرک کا اچار تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے قبول کرتے ہوئے اُس وقت وہاں موجود سارے اصحاب میں تقسیم کیا جس میں س ایک ٹکڑا انہوں نے (ابو سعید خدریؓ) بھی حاصل کیا۔ موصوف عبداللہ سمُدری مکہ معظّمہ میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ کی موجودگی میں اسلام قبول کرنے کے بعد ساحلی علاقہ جدہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ جدہ کی ہمعصر بادشاہ کی بہن کے ساتھ نکاح کر لیا اور سعادتِ حج و زیارت حرمین شریفین کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایما پر ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ اور تعمیر مساجد کے سلسلہ میں تیرہ اصحابِ رسولؓ بشمول حضرت مالک بن دینارؓ کے ہمراہ اپنے وطن کیرالہ کا سفر اختیار کیا، لیکن قدرت کو کچھ

اور ہی منظور تھا۔ دورانِ سفر وہ ایک مختصر سی مدت کے لیے بیمار پڑ گئے اور آگے بڑھنے سے پہلے ہی عمان میں صلالہ کے مقام پر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ عزت واحترام کے ساتھ تجہیز و تکفین ہوئی اور وہاں پر آج بھی اُن کا مقبرہ باقی ہے اور ایک تاریخی مقدس مقام کی حیثیت سے سیاحوں کے لیے قابل کشش ہے۔

عبداللہ سمدری نے بستر مرگ پر تمام ساتھیوں کو سفر جاری رکھنے کی ہدایت کی اور اپنے بھتیجے یعنی کوڈنگلور کے راجہ کے نام ایک خط حضرت مالک بن دینارؒ کے حوالے کیا جس میں اُن اصحابِ محترم کی خاطر تواضع کرنا اور تعمیر مسجد کے لیے زمین کی فراہمی یقینی بنانا اور تبلیغ اسلام کے لیے اُن کی ہر طرح کی مدد واعانت کرنے کا تذکرہ تھا۔ یہ قافلہ کیرالہ کے کوڈنگلور علاقہ میں وارد ہوا اور وہاں پر انہوں نے ہندوستان کی پہلی مسجد تعمیر کی جو تب سے آج تک چیرامن پیرومل جامع مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کی تعمیر سن ۶۲۹ عیسوی مطابق ۸ ہجری میں عمل میں آئی ہے جسے ہندوستان میں سب سے پہلے تعمیر شدہ مسجد کا اور حضرت مالک بن دینارؒ کو اس مسجد کے اولین امام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت موصوف بعد میں منگلور منتقل ہو گئے اور کوڈنگلور سے منگلور تک انہوں نے اسی طرز تعمیر کی اور بھی کئی مساجد کی تعمیر کی جو ضرورت کے مطابق ترمیم و تنسیخ کے باوجود آج بھی موجود ہیں۔

مسجد چیرامن پیرومل ہندوستان میں تعمیر ہونے والی پہلی مسجد ہے۔ اس لیے اُس پر روایتی ہندو طرز تعمیر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ مسجد نبویؐ کی طرح اِس مسجد کی چھت اور دوسری ضروریات کے لیے ابتداء میں ناریل کی لکڑی اور پتے استعمال کیے گئے تھے۔ مدت تک مسجد کے قدیم حصے کو جوں کا توں رکھا گیا تھا مگر بعد میں اسے ضروری مرمت اور موجودہ وقتی تقاضوں کے مطابق ڈھالا گیا۔ مگر مسجد میں ابھی بھی کوئی گنبد یا مینار نہیں ہے۔ موجودہ وقت میں اس مسجد میں پانچ ہزار

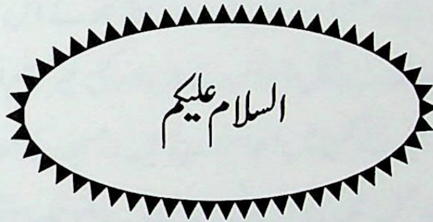
نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد میں پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی ہوتی ہیں۔ جمعہ کی نماز لگ بھگ تعمیر مسجد کے وقت سے برابر جاری ہے۔ اس مسجد کا باب الداخلہ اپنی سادہ طرز تعمیر کی وجہ سے بڑا ہی دیدہ زیب اور پُرکشش نظر آتا ہے۔ مسجد کی انتظامیہ کمیٹی رمضان المبارک میں اجتماعی افطار کا انتظام کرتی ہے جس میں اکثر و بیشتر غیر مسلم حضرات بھی حصہ لیتے ہیں۔

مسجد کا منبر سُرخ خوشبودار لکڑی (شیشم) کا بنا ہوا ہے۔ جس کی اونچائی لگ بھگ تین میٹر ہے۔ مسجد کی چھت سے لٹکتا ہوا ایک پیتل کا چراغ ہے جس کا وزن چوبیس کلوگرام اور اونچائی ایک میٹر ہے۔ اس چراغ کو تقریباً ۱۳۸۰ سالوں سے روشن رکھا جاتا ہے۔ ایک مضبوط آہنی زنجیر سے لٹکتے ہوئے اس چراغ میں تمام مذاہب کے لوگ عقیدت سے تیل ڈالا کرتے ہیں اور کئی غیر مسلم اپنے بچوں کے رسم منڈھن بھی اسی مسجد کے صحن میں انجام دیتے ہیں۔ مسجد کے احاطے میں قدیم طرز کا ایک حوض ہے جس میں ہمیشہ پانی رہتا ہے۔ پانی تک پہنچنے کے لیے کئی سیڑھیاں اُترنی پڑتی ہیں جو پُرانی طرز تعمیر کی ہیں۔ حضرت مالک بن دینارؒ کے جانشین اور صحابی حضرت حبیب بن مالکؓ اور اُن کی اہلیہ قماریہ بھی مسجد سے متصل ہی آسودہ خاک ہیں۔ یہ مسجد ایک طویل عرصہ تک دیگر قدیم اور تاریخی مسجدوں کی طرح اپنی اصلی حالت میں تھی مگر نمازیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اس میں وقتاً فوقتاً توسیع کی جاتی رہی ہے۔ حالانکہ مسجد کا صحن بہت وسیع اور کشادہ ہے مگر پھر بھی وہ عیدین کے موقعہ پر نمازیوں سے بھر جاتا ہے اور اُس وقت اپنی تنگ دامنی کی شکایت کرتا ہے۔ مسجد کی ایک ویب سائٹ بھی ہے اور رابطے کے لیے اس کے علاوہ ایک فون نمبر 0480-280317 بھی ہے۔ ویب سائٹ اس طرح سے ہے www,cheramanmosque.com

السلام علیکم

اگر چہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا اِلٰہ اِلا اللہ

(اقبالؒ)


السلام علیکم

حدیث حق قرآن کریم کے سورہ نور کی آیت نمبر۶۱ کے ایک حصے میں حکمِ ربانی ہے:

ترجمہ: پس جب تم اپنے گھروں میں داخل ہوتو اپنے گھر والوں کو سلام کہا کرو۔ یہ پاکیزہ اور خیر و برکت والی دُعا منجانب رب رحیم ہے۔

اِس سے قبل اِسی سورہ شریف کی آیت نمبر۲۷ میں ارشاد عالی ہے:

ترجمہ: دوسروں کے گھروں میں داخل ہونے سے قبل اجازت طلب کرو اور گھر والوں کو سلام کہا کرو۔

اسلامی عمارات کا ایک خاص اور مضبوط ستون اخلاق ہے اور اخلاقی سبق کا ایک خاص رُکن بلا شک وشبہ سلام ہے۔ سلام قرآن مجید کے حکم ربانی کے مطابق فرض ہے اور حدیث پاک کی دُرفشانی کے بموجب سُنت ہے، گویا سلام کی اہمیت اس قدر محترم اور افضل ہے کہ رب کائنات نے بھی تاکید کی ہے بلکہ حکم فرمایا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زبردست تاکید فرمائی ہے۔ تو پھر غور کرنے کا مقام اور توجہ طلب امر ہے کہ یہ عمل کتنا فائدہ مند اور ثواب کا حامل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کو بکثرت سلام کیا کریں۔ جن کو جانتے ہوں اُن کو تو خیر کیا ہی جاتا ہے مگر فرمایا جن سے نہ جان پہچان ہو اور نہ معاملات ہو اُن کو بھی سلام کیا کریں۔ آپ ﷺ نے جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو سارا مدینہ آپ کے دیدار کے لیے اُمڈ پڑا بلکہ لوگوں کا ایک جمِ غفیر کئی دن پہلے سے باہر میدانوں میں آپ ﷺ کے دیدارِ شوق میں آپ ﷺ کی راہ میں آنکھیں بچھائے انتظار میں بیٹھا رہا۔ عبداللہ بن سلام جو ایک بہت بڑے یہودی عالم تھے وہ بھی دربار رسالت ﷺ میں جا

پہنچے، روئے نازنین کو دیکھا۔ توراۃ میں بیان شمائل شریف کے عین مطابق پایا اور فوراً پہچان گئے کہ آپ ﷺ ہی پیغمبر آخرلزمان ہیں۔ پھر پروانہ بن کر شمع رسالت کے گرد گھومنے لگے اور آخرش مشرف بہ اسلام ہو کر جماعت انصار میں شامل ہو گئے۔ وہی عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ اُس وقت سب سے پہلے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دہانِ مبارک سے جو الفاظ سُنے وہ یہ تھے

یا ایھا الناس افشُو سلام

ترجمہ: آپس میں ایک دوسرے کے لیے سلام کو عام کرو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ آپ نے سلام بولنے، سلام پڑھنے یا سلام بجانے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ 'افشو سلام' فرمایا ہے یعنی سلام کو پھیلاؤ، سلام کو عام کرو۔ اس حکم کے تحت آشنا کو بھی، بیگانہ کو بھی، واقف کو بھی اور ناواقف کو بھی لایا جاسکتا ہے۔

السلام علیکم جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایک خیر و برکت کی دعا ہے جو ملاقات کے وقت ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو خلوصِ نیت سے دیتا ہے۔ سلام کہتے وقت بُخل کرنا یا تنگ دلی کا ثبوت دینا یا اپنے سے کمتر کے لیے اِسے ہیٹی سمجھنا روحِ اسلام کے منافی ہے۔ السلام علیکم کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر یا تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہو۔ سلام اللہ جل شانہ' کا ایک وصفی نام ہے۔ جس کا مطلب ہوا مطلقاً سلامتی، حفاظت اور امن و امان۔ چنانچہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو سلام سے دُعا دیتا ہے تو اُس کا یہی مطلب نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو سلامتی ہے، بزرگ و برتر ہے، شانِ عالی ہے، حفاظت کرنے والا ہے، امن و چین عطا کرنے والا ہے، تمہیں ہر قسم کی تکلیف، دُکھ درد، رنج و بلا، آفت اور مصیبت سے مامون و محفوظ رکھے اور سلامتی کے ساتھ تیرے سر پر ہمیشہ اپنا سایہ

کرتا رہے۔

سلام کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تو اے میری بہن، میرے بھائی، میرے ہمدم میری طرف سے ہر قسم کی دشمنی، حسد، شرارت، کینہ، فریب و دھوکہ، تکلیف و ایذا رسانی سے مامون و محفوظ ہے۔ میری ذات سے تو ہمیشہ امن و امان میں اور محفوظ و سلامت رہے گا۔ اب جو شخص خلوصِ دل سے سلام کرتا ہے اور معنی و مفہوم پر بھی غور کرتا ہے وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی، رفیق سے خیر خواہی کرتا ہے اور اس عمل سے اللہ تعالیٰ کو بھی راضی کرتا ہے۔ یہ صرف اسلام ہی ہے یا اسلامی سلام ہی ہے جو اپنے اندر ایک عالمگیر پیغام، افادیت اور معنی پوشیدہ رکھتا ہے۔ سارے جہاں میں کوئی مذہب، قوم، جماعت یا ملک ایسا خوبیوں اور رحمتوں بھرا اسلام آج تک پیش نہیں کر سکا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ سلام میں پہل کرنی چاہیے اور سلام خندہ پیشانی سے کہنا چاہیے۔ اسلامی سلام سے متعلق سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے۔ مشکواۃ شریف کی حدیث ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مسلمان پر چھ حق ہیں:

۱۔ جب وہ بیمار ہو تو عیادت کرے

۲۔ اگر فوت ہو تو نماز جنازہ پڑھے

۳۔ اگر وہ کھانے کی دعوت کرے تو قبول کرے

۴۔ جب ملے تو سلام کرے

۵۔ جب اُسے چھینک آئے تو الحمد اللہ سن کر یرحمک اللہ کہے

۶۔ اور اُس کی خیر خواہی کرے۔ حاضری میں بھی اور غیر حاضری میں بھی

چھ کے چھ احکام صاف اور عام فہم ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی دعوتوں کی رغبت دلائی ہے۔ مصلحت یہ ہے کہ اس طرح سے آپسی محبت اور الفت

پائیدار ہوتا ہے۔ مگر یہاں یہ بات یاد رکھنا لازمی ہے کہ اگر مردے کے ایصال ثواب کے لیے کھانا ہو تو اُس کے مستحق مساکین ہوتے ہیں۔ ایسا کھانا کھانا جائز نہیں۔ اگر کوئی اپنی بڑائی اور امیری دکھانے کے لیے دعوت کرے تو وہ قبول نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں پتہ ہو دولت حرام کی ہے، کمائی ناجائز ہے، سمگلنگ یا چرس کا پیسہ ہے یا اور کوئی غیر شرعی سادھن سے کمائی ہوئی آمدنی ہے تو وہاں پر بھی احتیاط بلکہ انکار لازمی ہے۔ بہر حال سلام سے متعلق مسلم کی ایک اور حدیث پیش ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

ترجمہ: تب تک کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا جب تک وہ ایمان نہ لائے اور ایمان تب تک مکمل نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کے لیے دوستی نہیں کرے گا اور کیا نہ بتاؤں وہ عمل جس پر چلنے سے آپس میں محبت اور دوستی پیدا ہو جائے گی۔ سنو، اپنے درمیان سلام کو خوب پھیلاؤ۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ سلام پھیلانے کا مطلب ہوا کہ ہر واقف، ناواقف، دیہاتی شہری، کہتر مہتر، خورد وکلاں، اپنا پرایا، امیر و غریب، مقیم و مسافر جو بھی ملے اُسے بڑے پیار اور خندہ پیشانی کے ساتھ السلام علیک یا علیکم کہیے۔ یہ حکیم الامت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حکیمانہ گُر ہے جو کافی اہمیت رکھنے کی باعث اپنی اُمت کو سکھایا ہے۔ آپ ﷺ اپنی اُمت کو کنویں کا مینڈک اور سوسائٹی، محلے، شہر یا ملک کا ایک غیر معروف فرد رہنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے جو شخص اس طرح ہر ملنے والے خواہ اُسے پہچانتا ہو یا نہیں سلام کرنا شروع کر دے تو ایک مہینے میں اُس کا میل ملاپ اور جان پہچان کا حلقہ کتنا وسیع ہو جائے گا۔ اور ایک سال میں اُس کے آشناؤں، ملاقاتیوں اور واقفوں کی تعداد کہاں تک جا پہنچے گی اور پھر

چند سال کے عرصہ میں اُس کے کتنے دوست بن جائیں گے اور یقیناً اُن میں سے چند بے حد قریب اور مخلص ہو جائیں گے جو وقت ضرورت اُس کی مدد میں پیش پیش ہوں گے اور یہ سارا بغیر کسی خرچے یا محنت ک فقط ایک سلام کہنے کی باعث عمل میں آجائے گا۔ تو پھر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کیوں نہ قربان جائے جنہوں نے گھر بیٹھے ہی بین الاقوامی جان پہچان اور حلقہ احباب وسیع تر کرنے کا ایک سُنہری گُر سکھایا ہے۔

ترمذی اور ابوداوٗد کی ایک مشترکہ حدیث کے راوی حضرت ابی امامہؓ ہیں، وہ فرماتے ہیں:

> ترجمہ: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یعنی اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا مقرب بندہ وہ ہے جو سلام میں پہل کرے اور اس طرح کی ایک اور حدیث صاحب مشکواۃ نے لائی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شخص سلام کرنے میں پہل کرتا ہے وہ غرور و تکبر سے پاک ہو جاتا ہے۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ سلام میں پہل کرنے سے نفس کشی لازمی امر ہے۔ غرور، تکبر اور خود داری مٹتی ہے اور اُس کی جگہ تواضع، انکساری اور نرم دلی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نرمی اور انکساری کے بدلے ایسے شخص کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔ سلام کی اہمیت اس نقطے سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حکم ہے کہ اگر دو اشخاص کے بیچ میں کوئی رخنہ آجائے تو وہ پھر ایک دوسرے پر سلام کو دہرائیں۔ ابوداوٗد کی ایک حدیث پاک ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ حضرت نبیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے

ہوئے کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم سے کوئی اپنے مسلمان بھائی سے ملے تو اُس پر سلام کہے۔ پھر اگر دونوں کے درمیان کوئی درخت، دیوار یا بڑا پتھر حائل ہو تو دوبارہ ملنے پر پھر سلام کو دہرائیں۔

مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کی اہمیت اِس طرح سے بھی واضح فرمائی ہے اگر دو مسلمان آپس میں ملیں تو ایک دوسرے کو سلام کریں۔ پھر اگر بات چیت کرتے ہوئے ساتھ ساتھ جا رہے ہوں تو راستے میں درخت، دیوار، کوئی رخنہ یا ایک بڑا پتھر آ جاتا ہے تو لازماً ایک شخص ایک طرف اور دوسرا دوسرے پہلو سے نکلے گا۔ مگر حکم ہے کہ جب یہ رخنہ عبور کر کے دونوں دوبارہ ملیں تو پھر ایک دوسرے کو سلام کریں۔

(۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں پر بھی سلام کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ حضرت اُنسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''بیٹا جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو انہیں سلام کرنا۔ ایسا کرنے سے تجھ پر برکت ہوگی اور تیرے گھر والوں کو بھی''۔

ہر شخص پر اس حکم کے تحت لازم آتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہونے پر موجود افراد کو سلام کرے۔ ایسا کرنے سے اول تو گھر والوں کے درمیان پیار و محبت اور یگانگت زیادہ بڑھے گی اور سلام خیر و برکت کا باعث بنے گا۔ رزق میں وسعت ہوگی اور گھر کے لوگوں میں اعمال صالح پیدا ہونے کے ساتھ باعثِ ثواب اور باعثِ خوشنودی اللہ عزوجل اور پیغمبر کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوگا۔

ابن ماجہ نے دو حدیث شریف لائے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں اور بچوں پر بھی سلام کرنے میں پہل کرنی چاہیے۔ پہلی حدیث شریف ہے:

ترجمہ: اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گذرے کہ عورتوں کی ایک جماعت بیٹھی تھی تو آپ نے ہم سب عورتوں پر سلام فرمایا۔

اور دوسری حدیث شریف ہے:

ترجمہ: حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے جب کہ ابھی ہم لڑکے ہی تھے تو آپ نے ہمیں سلام کہا۔

اس سلسلے کی ایک اور حدیث شریف ہے اور یہ بھی ترمذی نے لائی ہے جس کی روایت حضرت جابرؓ نے کی ہے۔ کہتے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کلام سے پہلے سلام ہے۔ مطلب یہ کہ جب ہمارا باہمی اتصال ہو، ملاقات ہو یا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا ہو چاہیے اتفاقاً ملاقات ہو جائے یا باقاعدہ طے شدہ پروگرام کے تحت میٹنگ مقرر ہو تو بات کرنے اور خیریت وغیرہ پوچھنے سے قبل سلام کر لینا چاہیے۔ سلام ہر حال میں کلام سے بہتر ہے اور سلام سے پہلے کلام کرنا اچھا نہیں بلکہ حکم عدولی ہے۔

اِس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہوگا کہ جب ہم اکثر گھروں میں جاتے ہیں تو گھستے ہی چلے جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پوچھتے ہیں کہ صاحب خانہ یا جس سے ملاقات کی غرض ہو گھر پر موجود ہے کہ نہیں اور اگر کچھ اخلاق سے بھی گھر آنے والا متصف ہوا تو گھر میں آنے کی اجازت طلب کی جاتی ہے اور صاحب خانہ کے پاس پہنچ کر یا گھر کے اندر جا کر ہی سلام کیا جاتا ہے جو مناسب نہیں ہے۔ دروازے

کے باہر سے ہی زور سے سلام کہنا چاہیے اگر جواب ملا تو گویا گھر میں داخلے کی اجازت مل گئی اور حدیث پاک میں دیے گئے حکم کی بھی تعمیل ہوگئی۔ اگر تین بار سلام کہنے پر جواب نہیں آیا تو ایک دم بغیر ناراض ہوئے یا کوئی رنجش لیے واپس مڑنا چاہیے۔ اس کے برعکس ہمارا جو طور طریقہ ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے کئی ملاقاتیوں یا ملنے والوں کو اس طرح اپنے سامنے پایا کہ میں ہر بار خود ہی شرمندہ ہوگیا ہوں۔ سیڑھیوں پر بغیر آواز کے چڑھنا (اگر اوپری منزل ہو) سُن گُن لینا اور ایک دم (Abruptly) سامنے پہنچ جانا، بڑی بیہودہ اور گھناونی حرکتیں ہیں اور ایسی بیہودہ حرکتوں سے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوجاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلام میں برکت اور رحمت ہے۔ اِس سلسلے کی ایک اور حدیث شریف ہے جس کے راوی حضرت عمران بن حُصینؓ ہیں۔ یہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے کہا السلام علیکم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو دس نیکیوں کا ثواب مل گیا۔ پھر ایک اور آدمی آیا اُس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور وہ بھی بیٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اس کو بیس نیکیاں یا بیس نیکیوں کا ثواب مل گیا۔ اُس کے بعد ایک تیسرا شخص بھی آگیا۔ اُس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو بھی سلام کا جواب دیا اور وہ بھی بیٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو تیس نیکیوں کا ثواب مل گیا۔

تو گویا معلوم ہوا کہ سلام کے تین جُز ہیں اور ہر جُز ادا کرنے پر دس دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ معمولی سی زبان ہلانے سے تیس نیکیاں کمائی جاسکتی ہیں اور یہ کوئی

معمولی بات نہیں ہے۔ اِس طرح اگر ایک دن میں حکم کے مطابق (افشو سلام) سلام پھیلاتا رہے تو اُس کے نامۂ اعمال میں کتنی نیکیاں درج ہوں گی خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر چہ سلام کے پہل کرنے میں بڑی تاکید آئی ہے مگر پھر بھی مراتب اور عزتِ نفس کو ملحوظ رکھنے کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ چھوٹا، بڑے کو سلام کرنے میں پہل کرے۔ بخاری شریف کی حدیث پاک ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹا بڑے کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو، چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرنے میں پہل کرے۔

کہتے ہیں ایک بار ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا، اَیُّ الاسلامَ خیرٌ ـــــــ اسلام کی کون سی صفت بہتر ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا:

تُطِمُ الطعام وَ تُقرئ السلام علیٰ مَن مرفت و من لم تصرف 0

(لوگوں کو کھانا کھلانا اور ہر آشنا و نا آشنا، واقف و ناواقف کو سلام کہنا)

سلام کرنے کا طریقہ جو ابتدا سے ہی مقرر ہے اور جس کی تربیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اُسی طریقے سے سلام کرنا بہتر ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا اور اُن میں روح پھونکی تو وہ چھینکے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے انہوں نے الحمد اللہ کہا۔ اس کے جواب میں خالق کائنات نے یرحمک اللہ فرمایا اور حکم دیا رب العالمین نے حضرت آدمؑ کو: اے آدم جا اُن فرشتوں کی جماعت کی طرف اور کہہ اُن کو السلام علیکم۔ حضرت آدمؑ نے ایسا ہی کیا۔ فرشتوں نے جواب میں کہا، علیک السلام ورحمۃ اللہ۔ حضرت آدمؑ لوٹ کر آئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم سُن سلام تیری اور تیری اولاد کے لیے آپس میں دُعا ہے۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ سلام کہنے کی دُعا اور تعلیم حضرت آدمؑ کی پیدائش کے وقت سے ہے اور باقی جو طریقے دوسروں قوموں میں مروج ہیں وہ خودساختہ ہیں۔ چنانچہ اگر غور کریں تو اُن میں کئی نقص نظر آئیں گی۔ اس لیے وہ ہمہ گیر یا عالمگیر نہیں ہو سکتے۔ روایت ہے حضرت عمرو بن شعیبؓ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم سے وہ شخص نہیں جو غیر کے ساتھ مشابہت کرے۔ سنو مشابہت کرو تم یہودیوں کے ساتھ اور نہ عیسائیوں کے ساتھ۔ بیشک یہودی انگلیوں کے اشارے سے سلام کرتے ہیں اور عیسائی ہتھلیوں کے اشارے سے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہاتھ یا انگلی کے اشارے سے، سر یا گردن کے اشارے سے، خم ہو کر یا آنکھوں کی گردش سے، دو ہاتھ جوڑ کر، ڈھنڈوت کر کے یا بندگی، آداب، تسلیم وغیرہ جیسے الفاظ دُہرا کر 'سلام' کی توہین ہوتی ہے اور ایسا اسلامی آداب کے منافی بھی ہو جاتا ہے۔ یورپ میں نئے فیشن کے ساتھ نئے طرز کے سلام بھی مروج ہیں جیسے گڈ مارننگ، گڈ ایوننگ۔ وقت کی بھاگ دوڑ 'والعصر' کہنے والے ذاتِ حق کے ہی دست قدرت میں ہے۔ ایک خاکی اور فانی انسان کے لیے نہ مارننگ ہی گُڈ ہے اور نہ ایوننگ ہی گُڈ یا بیڈ ہے۔ صبح بخیر یا صبح مبارک ہم بھلا کیسے کہہ سکتے ہیں جب کہ ہادیٔ اعظم نے بذریعہ قرآن ہم کو بتایا ہے:

فَاذِاَ نَذَلَ لبا حَتهم فَساءَ صَباحُ المُنذِینَ (سورہ صٰفٰت)

ترجمہ: پھر جب عذاب الٰہی اُن کے گھروں میں آیا جن لوگوں کو پہلے ہی ڈرایا جا چکا تھا اُن کی صبح عذاب آنے کی وجہ سے بڑی منحوس ثابت ہوئی۔

ایک قوم پر ہواؤں کے ریلے صبح کے وقت ہی چلے۔ ایک قوم پر پتھروں اور آگ کی بارش صبح کے وقت ہی ہوئی۔ پومپیائی شہر دن کے وقت ہی صفحہ ہستی سے

نابود ہو گیا۔ راتوں کو بڑے بڑے قلعے فتح ہوئے اور فوجی بیڑے حملہ آور ہوئے۔ شاموں کو سلطنتوں میں انقلاب آئے اور قوموں کی تقدیر کے فیصلے ہوئے۔ عصر کے موقعہ پر جوالا مکھی پھٹے، بھونچال آئے اور بستیاں تباہ ہو گئیں اور شہر ملیا میٹ ہو گئے۔ دراصل وقت کا یہ سارا کاروبار مالکِ اراض وسماوات کے ہی دائرۂ اختیار میں ہے۔ ہم صبح کو نہ شام کو اور نہ ہی عصر کو یا رات کو اچھا، بُرا، مبارک یا منحوس کہہ سکتے ہیں۔

بہر حال سلام کے سلسلہ میں یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ اگر دور سے کوئی سلام بھیجے تو وہ پہنچ جاتا ہے اور اُس کا جواب بھی پہنچانے والے کو دینا چاہیے۔ چنانچہ اس ضمن میں ابوداؤد کی ایک حدیث ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا: 'میرے باپ نے آپ کو سلام عرض کیا ہے'۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سے جواب دیا,

عليك و على ابيك السلام۔ یعنی تجھ پر اور تیرے باپ پر سلام ہو۔

حدیث کی رو سے اگر کوئی دوسرے غیر حاضر کا سلام پہنچائے تو اُسے جواب میں کہنا چاہیے: عليك و عليه السلام

اور اگر سلام عورت کی جانب س ہو تو سلام پہنچانے والے کو کہنا چاہیے

عليك و عليها السلام

آخر میں رخصت کے وقت یا محفل ومجلس برخاست کرنے کے وقت کا سلام پر ایک حدیث پاک عرض کرنا چاہوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے:

ترجمہ: پھر جب چلنے کے لیے اُٹھو تو پھر سلام کرو کہ پہلا ملاقات کا سلام دوسرے رخصتی سلام سے لائق تر نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جیسا پہلا ملاقات کے وقت کا سلام اہمیت والا ہے اُسی طرح دوسرا رخصتی کا سلام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

وماعلینا الا البلاغ

اللہ رب العزت سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں تکبر وغرور سے نجات دے کر سلام کو قاعدے سے اپنانے، سلام کو عملانے، سلام کو برتنے اور سلام کو پھیلانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



غمگساری کا تہوار

زہے قسمت ہلالِ عید کی صورت نظر آئی
جو تھے رمضان کے بیمار اُن سب نے شفا پائی

(مجیدؔ لاہوری)

غمگساری کا تہوار

عید خوشیوں کا دن، مسرتوں کے لمحات، شاہ خرچی کی ساعتیں اور باہمی یگانگت، اُخوت، پیار و محبت، ہمدرد و غمگساری کے موقعے ہیں۔ مختلف طبقہ خیال کے لوگ مختلف انداز سے اس دن خوشی پاتے ہیں۔ مجید لاہوری کا کہنا ہے ؎

زہے قسمت ہلالِ عید کی صورت نظر آئی
جو تھے رمضان کے بیمار اُن سب نے شفا پائی

بہر حال حقیقی زندگی میں دیکھا جائے تو روزہ خوار اِس لیے خوش ہو جاتا ہے کہ ہوٹلوں اور چائے خانوں میں آنے جانے میں اُسے کوئی دِقت نہیں ہوتی البتہ بے محابا سڑکوں پر سگریٹ پھونکنے میں اُسے ضرور تنگی ہوتی تھی۔ اس لیے عید کا چاند اُس کے لیے خرمستی کا اجازت نامہ لے کر آتا ہے۔ روزہ دار بھی خوش ہو جاتا ہے کہ اُسے بھوک کی صبر آزما تکلیف اور صبح صبح مُنہ اندھیرے اُٹھ کر سحری کھانے کے جھنجھٹ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ یہ ہمارا یا عام لوگوں کا حال ہے اِلا ماشاء اللہ ایسے بھی خدا کے بزرگ بندے مومنین ہیں جنہیں رمضان کا مہینہ دنیا کی ہر متاع اور ہر خوشی سے عزیز تر ہے اور اس مہینے کے گذرنے کا افسوس بے حد لگتا ہے کیونکہ دیگر فیوض و برکات کے علاوہ یہ رحمتوں کا بھی مہینہ ہے۔ ثواب کمانے اور اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کرنے کا اِس مہینے میں کافی موقعہ میسر ہوتا ہے۔

عید پر بچوں، لڑکوں، بالیوں کے نئے کپڑے اور دیگر پہناوے سِل کر آتے ہیں۔ نئے جوتے چپل بھی اکثر بچوں کو اِسی موقعہ پر مل جاتے ہیں۔ عیدی پانے اور نئے ملبوسات زیب تن کرنے کی خوشی میں اُن کی عرفے والی رات کی نیند اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ غرباء یا کم استداد کے لوگوں کی بھی خوشی ہوتی ہے کہ گھر میں عید کے طفیل دو تین پکوان معمول سے ہٹ کر پکیں گے اور مساکین و معذور کی بھی

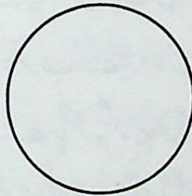
خوشی ہوتی ہے کہ انہیں صاحبِ ثروت اور روزہ داروں سے زکوٰۃ اور فطر کا صدقہ وصول ہوگا اور چند دن اُن کے گھر میں بھی خوشی رہے گی ۔ غرضیکہ اپنے اپنے طور طریقے اور سوچ و سمجھ کے مطابق بلاتفریق عید خوشی کا دن اور مسرتوں کا تہوار ہوتا ہے۔

آج سے چند سال قبل حالات مختلف تھے ۔ امیر، غریب کو اور صاحبِ استعداد مفلوک الحال کو مقدور بھر اعانت کر کے عید کرواتا تھا یا سامان بہم پہنچا کر عید کی خوشیوں میں شامل کرواتا تھا۔ مگر آج حالات بالکل مختلف ہیں۔ مسلسل کرب و بلا کی پاداش میں آج ان گنت یتیم اور بیوائیں ہیں ۔ آج لاتعداد ناخیز اور سینکڑوں معذور افراد اس سماج یں اپنی چند صیائی آنکھوں ، خشک زبانوں اور پپڑی جمے ہونٹوں سے ایک خاموش گریہ زاری میں مصروف ہیں ۔ وہ چیخ نہیں سکتے کیونکہ اُن کے گلے خشک ہو چکے ہیں ۔ وہ آہ و فغان نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کی زبانیں گنگ ہو چکی ہیں ۔ اُن کے لبوں پر نالے اور فریاد نہیں آسکتے کیونکہ اُن کے ہونٹ بے آب و گیاہ بنجر زمین کی طرح ہو چکے ہیں ۔ فریاد وہ کر چکے ہیں، آنسو وہ بہا چکے ہیں، اب وہاں صرف بنجر صحراؤں کی خاموشی اور ویرانی کے سِوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر مظلومیت میں بہائے گئے خون کے آنسو ایک دن ضرور انقلاب لا کر رکھ دیں گے ۔ دربار ایزدی میں دیر ہے اندھیر نہیں ۔ ظالم ، مظلوم کی آہوں کی آگ میں بھسم ہو کر تنکا تنکا بکھر جائے گا اور وہ دن اب زیادہ دور نہیں ۔ کیونکہ یہی قانونِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے ۔ یہی چرخِ کہن کی للکار ہے، یہی صفحۂ گیتی کی پکار ہے مگر اجرائے حکمِ یزدانی تک ہم کو بھی اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ اپنی مسرتوں میں اور اپنی خوشیوں میں حتی المقدور اُن تمام بچوں ، بوڑھوں ، بیواؤں اور اپاہجوں کو شامل کرنا ہے جو تعصب و تنگ نظری کی چکی میں پس کر ریزہ ریزہ بکھر چکے ہیں ۔ جو جرم بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں ۔ جو نام نہاد محافظوں کی

خرمستیوں کا ثمر کاٹ رہے ہیں۔ بچوں کے سر سے سایۂ پدری چھن گیا۔ دُلہنوں اور سہاگنوں کے سُہاگ لٹ گئے۔ کنواریوں کی چُنریاں تار تار ہوگئیں۔ ماؤں کی گودیں خالی ہوگئیں، بوڑھوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئیں اور معذوروں، اپاہجوں کے ارمان خاک میں مل گئے۔ دوروٹی جٹانے اور کھلانے والے سہارے بے نام و نشان قبرستانوں کی زینت بن گئے اور ٹیوشن پر گئے چیونگم چباتے ہوئے چھوٹے چھوٹے فرشتہ صورت، والدین کے دُلارے ننھے مُنے بچے واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ اُن کی مائیں ناشتہ لے کر اُن کی بس راہ ہی دیکھا کرتی رہیں۔ تباہ کُن آندھیوں نے بستیوں کو تاراج کردیا، مکینوں کو موت کی نیند سُلا دیا اور ارمانوں، آرزوؤں، خواہشوں کو خس وخاشاک کی طرح ایک ہی ریلے میں بہا کر مٹی میں ملا دیا۔

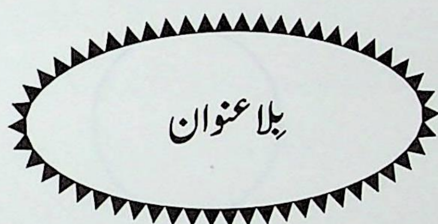
ایسے ہی ٹوٹے بکھرے، غم وکرب سے نڈھال، بے سہارا، بے آسرا، کسمپرسی میں زندہ رہنے والے 'تارِ دامن سے چاکِ گریباں' پر ٹانکے لگانے والوں کی بے لوث دلجوئی و دلبری اور غمگساری کرنے میں ہی عید کی سچی خوشی ہے۔ جی ہاں! عید ہی عید ہے۔





بلا عنوان

میرے قلم سے خدا جانتا ہے کیوں راہیؔ
قصیدے لکھتا ہوں تو مرثیے نکلتے ہیں
(محبوب راہیؔ)


بلا عنوان

آج کل ایک مخصوص مسئلے 'برننگ ایشو' یا 'بریکنگ نیوز' پر بہت کچھ لکھا، پڑھا اور کہا جا رہا ہے۔ میں اپنی جانب سے اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہوں گا بلکہ ہندوستان کے چند دانشوروں اور مؤرخوں کے رشحات قلم آپ کے سامنے رکھوں گا۔ ایسے قارئین کرام جو اس بارے میں کچھ یا کوئی بھی جانکاری نہیں رکھتے ہوں وہ بذات خود ان تاثرات اور اطلاعات کو ملاحظہ فرما کر حقیقت حال جان جائیں گے۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ ؎

خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زبان میری

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر جناب کے این پانیکر اپنے مضمون A Historical overview میں ایودھیا میں اُبھرنے والے بابری مسجد سے متعلق اختلافات اور مسجد کی کہانی تواریخی ثبوت وشواہد کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایودھیا کی بابری مسجد سن ۱۵۲۸ عیسوی میں بابر کے ایک معتمد درباری میر بقی نے تعمیر کی تھی۔ اِس مسجد کی تعمیر سے قبل مندر گرائے جانے کا ذکر کہیں پر بھی نہیں ملتا۔ نہ تو بابر نامہ میں ہی اور نہ ہی مابعد کے دیگر مسلم دستاویزات خصوصاً آئین اکبری میں جو سترھویں صدی میں تحریر کی گئی تھی۔ ہندو تواریخ بھی ایسے کسی بھی واقعے کے ذکر سے بالکل خالی ہیں جن میں خاص طور پر مشہور رام بھگت تُلسی داس کی رام چرت مانس سرفہرست ہے۔

انیسویں صدی میں جب انگریز سرکار مقامی تاریخ کی ترتیب وتدوین میں لگی تھی یہ گمان کر لیا گیا کہ بابری مسجد ______ مندر کی بنیادوں میں کھڑی کر دی گئی ہے۔ یہ ایک تجاہل عارفانہ تھا۔ حقیقت کا اِس میں دور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایک انگریز خاتون بیوج جس نے بابر نامہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا تھا،

نے اس مفروضے کا دعویٰ کیا کہ شاید بابر نے مسجد ______ مندر کی بنیادوں پر تعمیر کرائی ہوگی ۔ حالانکہ اس بات کا کوئی ذکر بابر نامہ میں بھی نہیں ملتا۔ اگر چہ مذکورہ مترجم خاتون نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ اُس نے کبھی ایودھیا کا سفر کیا ہے اور بذات خود بابری مسجد کو دیکھا ہے۔ اُس کا مشاہدہ کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی بعد کے مؤرخوں نے اُس کے بیان کو بغیر کسی حیل حجت اور تحقیق کے تسلیم کر لیا۔ حالانکہ انہیں اس بات کی واقفیت لازمی طور ہونی چاہیے تھی کہ نہ تو مذکورہ خاتون ہی وارد ایودھیا ہوئی ہے اور نہ ہی اُس نے یہ دعویٰ کسی ٹھوس بنیاد، حقیقت، ثبوت یا شہادت پر کیا ہے۔ دراصل سن ۱۸۵۵ء میں ایک معمولی سا ہندو مسلم فساد ہنومان گڈھی مندر جو مسجد کے قریب ہی ہے (نہ کہ رام مندر پر) ہوا تھا جب کہ اس دوران ایودھیا، رام پوجن کا مرکز بن چکا تھا۔ لیکن پھر بھی کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ایودھیا رام کی جنم بھومی ہے یا یہ کہ میر بقی نے مندر کی باقیات پر مسجد کو کھڑا کر دیا تھا۔

واقعات یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتے گئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسجد کے صحن کا کچھ حصہ ہنومان گڈھی مندر کے منہت نے زبردستی اپنے قبضے میں کر لیا اور اُس پر ناجائز طریقے سے ایک چبوترہ تعمیر کر دیا۔ اس بات پر احتجاج ہوا اور مسجد کے انتظامیہ نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حالانکہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں میں سے کسی کو فوری طور کوئی بھی راحت یا سہولت تو نہ ملی مگر جگہ کو متنازعہ ہونے کے خیال نے جڑ پکڑ لی۔

ماضی قریب میں معرضِ وجود میں آئی ایک مقامی روایت، آستھا یا دیو مالائی من گھڑت داستان نے قومی وقار کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ معلوم تاریخی مواد اس بات کا شاہد ہے کہ ایودھیا نہ ہی رام کی جنم بھومی رہی ہے اور نہ رام نام کا کوئی مندر، مسجد کی

جگہ پر کھڑا تھا۔

الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر شری سوشیل سری واستو فرماتے ہیں:

برطانوی مؤرخین نے مقامی فرضی داستان اور تاریخی دستاویزات میں کوئی فرق نہیں کیا کیونکہ وہ منصوبہ بندی کر کے اس بات کا تاثر قائم کرانا چاہتے تھے کہ سابقہ مغلیہ سلطان (بابر) ظالم وجابر اور متعصب تھا۔ بعدازاں کے حالات وواقعات اور خاص طور قانونی چارہ جویوں نے اندر ہی اندر دبی چنگاریوں پر تیل کا کام کیا اور آخر بائیس اور تیئس دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات کو رام کا ایک پُتلا خفیہ طور لا کر مسجد کے اندر نصب کر دیا گیا۔ اور اس طرح سے حکومت اتر پردیش کے ہاتھ ایک ٹرمپ کارڈ آیا جس سے اُس نے ساری جگہ کو Disputed Territory قرار دے کر مسجد کے دروازوں پر تالے ڈلوائے۔

توجہ طلب مسئلے سے دونوں پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل سنگینی صورت حال کے پیش نظر متفکر و پریشان ہو گئے۔ سردار پٹیل جسے ہندومت کے احیاءِ نو کا ایک پُر جوش حامی اور مددگار سمجھا جاتا تھا نے حکومت اتر پردیش کے وزیراعلی گوند بلبھ پنت کو لکھا کہ موجودہ حالات کے بڑھتے ہوئے اقدام پر فوری روک لگا دی جائے۔ جب محسوس کیا گیا کہ وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے مرکزی سرکار کے احکامات پر کوئی توجہ نہیں کی تو جواہر لال نہرو نے وزیر داخلہ لال بہادر شاستری کو لکھا کہ وہ سخت ترین اقدام کریں۔ پنڈت نہرو نے اپنے خط میں لکھا:

”مجھے لگتا ہے کہ ہم تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہمارا فخر وغرور مٹی میں مل چکا ہے اور ہم نے اپنے آپ کو جاہل ثابت کر دیا ہے۔ جو کچھ کہا جارہا ہے اس طرح کی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں تہذیب

چھو کر بھی نہیں گئی ہے''۔

سول جج کے مدعی اور مدعا علیہ دونوں کی سماعت کے بعد فیصلہ صادر کیا کہ بت جہاں پر ہیں وہیں رکھے جائیں۔ اس حکم پر ہائی کورٹ نے بھی مہر ثبت کر دی۔ اگرچہ مرکزی وقف بورڈ نے مسجد کو مسلمانوں کے لیے واگذار کرانے کی خاطر ایک دعویٰ بھی دائر کر دیا مگر دوبارہ ڈسٹرکٹ جج نے حکم صادر کر دیا کہ ہندوؤں کو پوجا پاٹ کی اجازت دی جائے جب کہ مسلمانوں کو نماز ادا کرنے سے باز رکھا جائے۔ (واہ کیا انصاف ہے)۔ کئی نظر ثانی کے دعوے اور جوابِ دعوے بغرض سماعت الہ آباد ہائی کورٹ میں بڑی دیر کے پڑے ہیں۔ مگر انہیں آج تک نہیں اٹھایا گیا۔ ججوں میں سے ایک جج ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کا ایم پی بن گیا اور اُس کی شخصیت ظاہر ہے الاوپر، جو اُس نے خود بڑھکایا تھا شُدھ گھی ہی ڈالتا ہوگا۔

اس المیہ پر بات کرتے ہوئے پروفیسر سری واستوا آگے فرماتے ہیں:

شیلانیاس یا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب کانگریس آئی حکومت کی مرضی کے مطابق انجام دی گئی۔ یہ بنیاد مسجد سے صرف ۱۹۲ فٹ کی دوری پر رکھی گئی لیکن منصوبہ بند سازش کے تحت مسجد کی موجودہ پوزیشن (جس میں بُت ڈالے گئے تھے) جوں کی توں رہنے دی گئی۔

اِسی کتاب میں اپنے مضمون میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر نیلا دھری بھٹاچاریہ رام جنم بھومی کی تاریخ اور سیاست پر اشتعال بھرے انداز سے لکھتے ہوئے اُسے ہندو شناخت کی از سرِ نو تجدیدی تحریک بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک ہندو شناخت کی ایک جارحیت پسند کی مردانہ شناخت کے روپ میں اُبھر آنا چاہتی ہے جو انتقامی بولی بولتی ہے اور انصاف کا خون کرنے پر آمادہ ہے۔

نیلا دھری بھٹاچاریہ کے متعصّبانہ خیال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ کچھ ہندو کٹر پنتھی تنظیمیں ایک نئی شناخت کی متلاشی ہیں کو پروفیسر رومیلا تھاپر نے اپنے مضمون ''رام کی کہانی کا تاریخی پس منظر'' میں اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

سامی یا غیر آریائی مذاہب جیسے یہودیت، نصرانیت اور اسلام میں سرمایہ دارانہ نظام کو پھلنے پھولنے یا پنپنے کا موقعہ نہیں ملا کیونکہ اِن مذاہب کا ڈھانچہ ہمہ گیر ہونے کے ساتھ ساتھ پیغمبروں، مقدس کتابوں اور حقانی احکامات سے لیس ہیں۔ موجودہ دور میں رام بھگتی کا ازسرنو آغاز سیاسی چال بازی کے سیدھے اور صاف محرکات ہیں جو جنگجویانہ سرگرمیوں، جارحیت پسند اور مذہبی جنونی جہاد والا ہندومت ہے ـــــ ایک تعاونی انجمن (Syndicated) جیسا ہندومت۔ مطلب یہ کہ صرف مذہبی اعتقادات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر یا انہیں غلط رنگ میں پیش کر کے ایک جدید قسم کا سیاسی ماحول تیار کرنا ہے۔ ویسے اینٹ گارے کی پوجن ہندو دھرم کے لیے ایک نئی بات ہے۔

نو آبادتی اور فرقہ دارانہ گٹھ جوڑ کی گرہیں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر آدتیہ مکرجی نے کھولی ہیں اور جناب اصغر علی انجینئر ۱۹۴۷ کے قبل ہندو مسلم اتحاد پر روشنی ڈالی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ موجودہ لہولعب کے دور میں ہم میں سے اکثر اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مغلیہ دور حکومت یا اُن سے قبل کے مسلم حکمرانوں کے وقت میں فرقہ دارانہ فساد کی کوئی سوچ، نہج یا خیال کا کوئی وجود سرے سے تھا ہی نہیں۔ ممکن ہے کہ چند زروجواہر رکھنے والے مندروں کی تباہی کچھ حریص ولالچی حکمرانوں یا حملہ آوروں جن کا دین وایمان ہی لوٹ مار ہو ـــــ کے ذریعہ سے عمل میں آئی۔ لیکن اس کے باوجود مذہب کے نام پر دو بڑے فرقوں

میں تضاد یا فساد کا وجود کم از کم اُس وقت تک بالکل ہی نہ تھا جب تک فرقہ دارانہ ذہنیت رکھنے والے ہمارے سابقہ نو آبادیاتی نظام کے دلدادہ حکمرانوں نے برصغیر کی زمامِ حکومت صرف اپنی شاطرانہ چالوں سے حاصل کی۔ انہوں نے ملک میں پھوٹ ڈالی، ڈنڈے کے زور پر حکومت کی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ 'بہتی گنگا میں ہاتھ دھولو' والے مقولے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انتشار پیدا کیا، غلط فہمیاں پیدا کر کے مختلف مذاہب ماننے والوں میں پھوٹ ڈالی اور چلتے بنے______



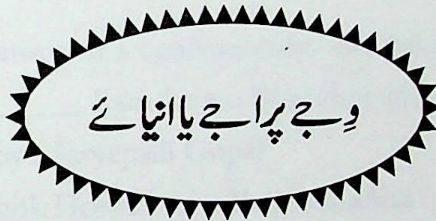
حوالہ:

The Anatony of a confrontation; the Babri Masjid______ Ram Janam Bhooomi issue
Edited by : Sarvepalli Gopal
India Book House c-in-c Roaed Madras

وِجے پراجے یا انیائے

ہم ہی بسمل ہم ہی قاتل ہم ہی مجرم ٹھہرے
یہ تماشہ نہ کبھی آپ نے دیکھا ہوگا

(رازؔ الہ آبادی)


وِجے پراجے یا انیائے

قانون دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک الہامی، آفاقی یا آسمانی قانون اور دوسرا انسانوں کا بنایا ہوا ملکی یا زمینی قانون۔ آسمانی قانون ربِ کائنات کی طرف سے مقرر کردہ ہوتا ہے اور یہ انسانی زندگی کے ہر پہلو بشمول عبادت، حقوق، معاشرت، سماجیات کا احاطہ کرتا ہے۔ اِسی لیے موجودہ وقتوں میں اسلامی قانون کو جو بغیر کسی تحریف و تنسیخ کے من و عن موجود ہے کے لیے کہا جاتا ہے کہ انسانی زندگی کے لیے مہد سے لحد تک کے لیے ایک مربوط اور جامعہ لائحہ عمل اور لائحہ حیات ہے۔
دوسرا قانون ملکی یا انسانی قانون کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ قانون انسان نے وحشی پن سے نکل کر معتمدن زندگی میں آ کر سماجی، معاشی اور معاشرتی نظام کو درست طریقے سے رواں دواں رکھنے کے لیے بنایا ہے۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ہر نظام اور ہر ملک کے لیے یہ الگ الگ ہوتا ہے اور اپنے جغرافیائی حالات، سماجی سوچ و نہج اور ضرورت کے مطابق اس قانون کی وضع قطع اور تراش خراش ہوتی رہتی ہے۔ (آئینِ ہند کی ترامیم ہی دیکھیے، سینکڑوں بار ہو چکی ہیں)۔
بہ الفاظ دیگر اس قانون میں سُقم بھی ہے، کمزوری بھی ہے اور اس پر حرف گیری بھی آ سکتی ہے جبکہ الہامی آفاقی قانون اٹل ہے۔ اُس میں کوئی سُقم ہے اور نہ اِس میں تبدیلی آ سکتی ہے۔ تبدیلی کا حق خود ذاتِ باری اللہ جل شانہٗ کو ہے اور وہ اپنے قانون میں بذریعہ پیغمبر تبدیلی یا تحریف و تنسیخ کروا سکتا ہے۔ مگر اب وہ بھی ممکن نہیں کیونکہ قیامت تک پیغمبروں کے معبوث ہونے کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔
آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مشتہر کرائی ہوئی آخری شریعت یا خدائی قانون کا جہاں تک تعلق ہے وہ موجودہ دور میں چند ملکوں تک ہی محدود ہے

کیونکہ مغربی طاقتیں اور مسلم دشمن عناصر اس قانون کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ اگر کہیں اسلامی قانون نافذ ہے بھی تو اُس میں کچھ حصہ ملکی قانون کا بھی ہے شامل ہے لیکن جہاں یہ قانون (مثلاً سعودی عربیہ) من وعن نافذ ہے وہاں دیکھیے کتنا امن وامان ہے اور جرائم کی تعداد کتنی قلیل ہے۔

جہاں تک ملکی قانون کا تعلق ہے ہر ملک میں وہاں کے باشندے اپنے اپنے طور سے اسے معتبر، قابلِ احترام اور سب امورات پر مقدم تصور کرتے ہیں۔ قانون کی بالادستی بہر صورت ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ قانون کے اوپر کچھ نہیں، کوئی چیز نہیں مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ قانون سے بڑھ کر قانون کے نفاذ کی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر قانون کو غلط طریقے سے نافذ (implement) کیا جائے یا قانون کی غلط طریقے سے توضیح وتشریح (interpretation) کی جائے تو وہی قانون پھر ناانصافی بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قانون بنانے والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور انسان سے غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ پھر چاہے وہ تدوین وترتیب میں ہوں چاہے نفاذ ونفوذ میں ہوں، چاہے فہم وادراک میں۔

قانون کی بڑائی، برتری اور عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے اس جمہوری ملک میں جہاں تحریر وتقریر کی آزادی ہے کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس ملک میں قانون کو چند خود غرض عناصر نے لونڈی بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس پر اجارہ داری قائم کر رکھی ہے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں، فیکٹری، کارخانے، بڑے منصوبے، غیر ملکی ٹھیکے اور پروجیکٹ صرف اپنے لوگوں کو ملتے ہیں۔ نوکریوں میں ایک چھوٹا سا آرکشن (Reservation) دلت کو ملتا ہے اور مادری زبان اُردو رکھنے والے مسلمان بچوں کو سکولوں میں جب نہ اُردو ٹیچر کی تقرری ہوتی ہے اور نہ کتاب ہی فراہم ہوتی ہے

تو وہ بچے پڑھائی کو خیر باد کہہ کر اُن کے ان پڑھ والدین اُن کو معمار، ترکھان، درزی، میکینک اور نائی وغیرہ کے کام پر لگا دیتے ہیں اور اس طرح سے ان پڑھ جہلا کی آبادی بڑھتی ہی جا رہی ہے اور وہ گنے چُنے اجارہ دار لوگ اپنی مرضی کی حکومت چلا کر اور انتظامیہ میں مداخلت کر کے مسلمانوں کو جان بوجھ کر ایک سوچے سمجھے پلان کے تحت قعرِ مذلت کے عمیق گڈھوں میں پہنچا رہے ہیں۔ اسی پر بس ہوتا تو افسوس کی بات نہ تھی، مگر حکام بست وکشاد اور مخصوص لاڈلے 'فرزندانِ ہند' جنہوں نے برابر سن ۱۸۵۷ء سے مسلمانوں کے خلاف کمر کس لی تھی اس کو جھوٹے مقدموں میں پھنسا کر اور آتنک وادی، اُگر وادی بنا کر اس کی شناخت کو بھی کالعدم کر دیا ہے۔ گویا بقول راز الہ آبادی

ہم ہی بسمل ہم ہی قاتل ہم ہی مجرم ٹھہرے
یہ تماشہ نہ کبھی آپ نے دیکھا ہوگا

اسے پانچویں ذات مان کر اسے بھگوان کی تخلیق ماننے سے انکار کیا جاتا ہے کیونکہ وہ تین ذاتوں کو بھگوان کے جسم سے اور دلت کو پاؤں سے پیدا ہونے کی بات کرتے ہیں۔ (برہمن، کھتری، ویش اور شودر) اس لیے پانچویں ذات شاید کیڑے مکوڑوں کی طرح خود ہی گندگی سے پیدا ہوئی ہوگی۔ ایسی ہی اُن کی وچار دھارا ہے۔

سنسکرت زبان سے ہندی میں اور ہندی سے لوگوں کی زبانوں پر ایک لفظ آستھا آیا ہے۔ آستھا کا مطلب ہے وشواش، یقین، عقیدہ، اعتقاد، عقیدت یا بلیف (Blief)۔ اب ذرا اس لفظ کی ویا کھنا کر کے دیکھتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر میں خانیار سرینگر میں ایک بہت پرانا مقبرہ ہے جو کسی نصرانی بزرگ یوزا آصف کا مدفن ہے۔ تقریباً بیس مختلف ممالک کے لگ بھگ ڈھائی سو

افراد، قلمکاروں، ادیبوں اور دانشوروں نے اس مدفن کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام دفن ہیں۔ دعویداروں کے دعوے کا گرچہ جواب دعویٰ لکھا گیا ہے، مباحث ہوئے ہیں مگر مسلمان علماء اور دانشور، قرآن شریف کے ارشادات مدنظر رکھتے ہوئے، ایسے لوگوں کے پیچھے سی آر پی ایف کی طرح غُلیل اور پیلٹ گن لے کر نہیں دوڑ پڑے اور نہ ہی اُن کی آنکھیں ہی پھوڑ ڈالیں اور نہ اُن کے جسم چھلنی کر دیے کیونکہ یہ اُن چند لوگوں کی آستھا تھی، وشواس اور یقین تھا جو بلا شبہ اُن کی ذات تک ہی محدود تھا مگر اُسے آفاقی قانون نہیں بنایا جا سکتا یا مانا جا سکتا۔ چونکہ یہ اُن کی اپنی عقیدت تھی ت ہوا کرے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ چند لوگوں کے اس مفروضے کو یا دعوے کو عالمگیر قانون (universal law) تو نہیں مانا جا سکتا۔ ہاں اگر اس عقیدت و اعتقاد یا آستھا کو دھارمک شیلا نیاس (Relegious foundation stone) بنایا یا مانا گیا ہوتا تو آج دنیا بھر کے عیسائیوں نے خانیار سرینگر کو مقدس ویٹیکن سٹی بنایا ہوتا اور وادیٔ کشمیر کا نقشہ ہی بدل چکا ہوتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشہور ''پہاڑی وعظ'' کے بارے میں کہا جاتا کہ وہ وعظ اُس نے شنکر آچاریہ پہاڑی کے اوپر سے دیا تھا اور شہر سرینگر بھی ایک ''جنم بھومی'' بنا ہوتا۔

مجید لاہوری مرحوم کا کہنا تھا کہ اُن کا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ تھا اس لیے انہیں یقین تھا کہ اُن میں منسٹر بننے کی خوب صلاحیت تھی۔ انہوں نے اپنے وشواس اور آستھا کے انوسار کہا............

خدا کے واسطے مجھ کو منسٹری دے دو
میرا مزاج لڑکپن سے لیڈرانہ ہے

وہ منسٹر بنے کہ نہیں وہ مجھے معلوم نہیں مگر میری بھی آستھا، میرا وشواس اور

یقین تھا کہ مجھ میں گورنر بننے کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے۔اس لیے ایک دن میں نے سول سکریٹریٹ کے باہر ایک بھیڑ جمع کر کے دہائی دینی شروع کی۔

میں چراغِ رہگذر ہوں مجھے شوق سے جلاؤ

مجھے گورنر بنا دو۔باہر سے گورنر درآمد کرنے کی کیا حاجت ہے۔مجھ میں گورنر بننے کی پوری پوری صلاحیت ہے۔پلیز مجھے گورنر بنا دو______۔

مجھے گورنری تو کیا گورنر کے درشن بھی نصیب نہ ہو سکے، برعکس اس کے مجھے پولیس کے ڈنڈے کھانے پڑے۔لوگوں پھبتیاں اور استہزا سوا لگ۔اسی طرح تلکا دھاری ''باباجیوں'' (سادھوؤں) ترشولی پلٹن اور گورو (فخر و غرور) رتھ یاترا والے مہارتھیوں کی آستھا تھی کہ رام جی نے بابری مسجد کے عینِ منبر کے پاس جنم لیا ہے۔اس نظریے کے پیچھے ہٹ دھرمی سیاست کے بجز اور کچھ بھی نہیں تھا۔اس لیے پانچ سو سالہ پرانی مسجد جس کے لیے آرکائیوز محکمہ نے سروے کی تھی کہ اُس سر زمین پر دور و نزدیک یا تہہ زمین کوئی ہندو مت کے آثار و باقیات نہ تھا اور نہ ہیں کو گرایا جائے اور رام مندر بنایا جائے______۔

بہت محترم اور معظم کرسی پر بیٹھنے والے جج صاحب نے ایک نظر قانون کی دیوی کے مجسمے جس کی آنکھوں پر کالی پٹی بندھی ہوئی تھی، کی طرف ڈالی اور بیک جنبش قلم آستھا کو قانون کا درجہ دے کر قانون کا خون کر ڈالا۔لوگوں کی ایک مفروضہ اور من گھڑت روایت اور ذاتی خیال یا آستھا کو مان کر بیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں اور مجموعی طور پر دنیا کے تمام مسلمانوں کے دل چھلنی کر دیے۔یہ قرآن کو سینے سے لگانے والا مسلمان ہی ہے جس نے اللہ رب العزت کے فرمان کو اُس کربناک وقت پر بھی، اذیت ناک لمحوں میں بھی، جب ہندو وکلاء مسرت سے دو انگلیوں سے وی کا نشان بنا رہے تھے، سینے سے لگایا جب اُس کے کانوں میں

آکاش وانی بلکہ بھوشیہ وانی ہو رہی تھی کہ ان اللہ مع الصابرین ـــــ ہم نے صبر کرلیا اور سچے جمہوری ہونے کا ثبوت فراہم کر کے غیر جمہوری اور متعصب لوگوں کے منہ پر کالک پوت دی۔ شاعر کا فرمانا بروقت ہے.......

منصف کے آستین میں ہے خنجر چھپا ہوا
انصاف کرنے والا ہی قاتل ہے آج کل

آئین ہند جس نے اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت اور مذہبی آزادی کا ذمہ لیا ہے آج شرمندہ ہو رہا ہے۔ آج قانون اپنے قانون ہونے پر آنسو بہا رہا ہے۔ پر کیا کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور بڑے انصاف کے دروازے پر جانے سے اور ساٹھ سال لگیں گے اور اُس کے بعد ـــــ ع

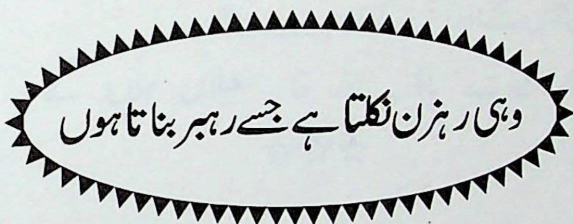
پھر میرے پاؤں اور خارِ مغیلاں ہوں گے



وہی رہزن نکلتا ہے جسے رہبر بناتا ہوں

مری بُربادیوں کا اک سبب یہ بھی ہے طاؔہر
وہی رہزن نکلتا ہے جسے رہبر بناتا ہوں

(طاؔہر تلہری)


وہی رہزن نکلتا ہے جسے رہبر بناتا ہوں

موجودہ وقتوں میں آپ دہلی یا امرتسر سے بذریعہ بس، میٹاڈار یا موٹر کار سفر کریئے تو مادھو پور یا لکھن پور چنگی پوسٹ پار کرتے ہی آپ کو احساس ہو جائے گا کہ آپ ایک خوبصورت جگمگاتے شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ شمال کی یہ ''عروس البلاد'' اور کوئی نہیں ریاست جموں و کشمیر کا صوبہ جموں ہے۔ آپ کو ہر طرف ہرے بھرے کھیت ، دوڑتی بھاگتی آبپاشی کی نہریں بھرے بھرے کھلیان ، اُچھلتے کودتے ، مست ہاتھوں کی طرح جھومتے ، شور کرتے لال نیلے ٹریکٹر، اونچی اونچی خوبصورت عمارتیں اور ٹاور، شفاف سڑکیں اور رات کو جگمگاتی روشنیاں، لبھانے والے نیوین سائن اور نہ جانے کیا کیا دیکھنے کو ملے گا۔ طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور جموں سٹی کی بات ہی کیا ہے۔ کنٹھ مالا میں جگمگاتے ہیرے کی طرح تاباں حسنِ مجسم۔ ہر طرف مالی، مادی اور خوشحالی کی جھلکیاں، کام دھندوں میں مصروف لوگ ۔اس کے برعکس رام سُو کے بعد خاص کر اور لور منڈا قاضی گنڈ کے بعد عام طور پر صاف جھلکتا ہے کہ یہ ''جنت کا نظارہ'' والی وادیٔ کشمیر نہیں ہے بلکہ ایک شہر آشوب ہے۔ ماضی کے کھنڈرات ہیں، جنگ عظیم دوم کے اختتام کے بعد کا برلن ہے یا یورپ کا کوئی شہر ہے جس کو نازیوں نے یا اتحادیوں نے روند ڈالا تھا۔ یا موجودہ وقتوں کا فلسطین ہے جس کو یہودی غاصبوں نے کھنڈرات میں تبدیل کر دیا ہے۔ یقین مانیے محاورتاً اس دیس پر الو بولتے نظر آتے ہیں اور وہ بھی خاص کر کرفیو یا ہڑتال میں۔

حیرانگی کی بات ہے کہ اس کے باوجود بھی جموں نواسی شور شرابہ کرتے رہتے ہیں کہ جموں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ سارے تعمیر و ترقی کے سادھن کشمیر کے لیے جٹائے جا رہے ہیں اور جموں کو ہر انداز سے پسِ پُشت ڈالا جا رہا ہے۔ مگر یہ بات

بھی ذہن نشین کرنی ضروری بن جاتی ہے کہ ایسا جموں کے عام باشندے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ایک مخصوص طبقہ ہے جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کاسۂ گدائی لے کر نکلنے کے عادی ہیں تاکہ دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جائے کہ واقعی جموں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ اُن لوگوں کا دوسروں کے لیے اور خاص طور پر صوبہ کشمیر کے لیے انتہائی بغض وعناد اور نفرت رکھنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

ہر سال دربار مُو کے ساتھ جانے والے سرکاری ملازمین میں سے ایک بڑی تعداد آج بھی جب اپریل، مئی میں جموں سے واپس لوٹتے ہیں تو اپنے ساتھ چائے، مصالحے، کپڑا اور فرش روفروش جموں کے دوکانداروں سے اُدھار میں اٹھا لاتے ہیں اور جموں کے وہ ڈیلر، وہ دوکاندار اتنا سارا اُدھار کا سامان اس لیے نہیں دیتے ہیں کہ یہ ملازم ہیں، جائیں گے کہاں، پھر لوٹ کے آئیں گے، نہیں بلکہ وہ بھروسہ کرتے ہیں اور بھروسہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں سادہ اور شریف لوگ ہیں۔ میں ذاتی طور کافی عرصہ جموں میں رہا ہوں۔ سارے جموں، ہر کونے کھدرے سے واقف ہوں اور جموں شہر کی وہ کون سی تنگ و تاریک ٹائل پوش گلی ہے جو میری رہگذر نہیں رہی ہے۔ میری یاری دوستی بھی کشمیر سے زیادہ جموں میں ہی ہے۔ ڈوگروں کے بارے میں جو کہا گیا ہے کہ ''کھنڈ مٹھے ڈوگرے' یہ بات بلاتر دید سوفی صد درست ہے۔

بُرے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ دنیا کے اجارہ دار واحد پولیس مین امریکہ کو ہی دیکھیے وہاں پر ہر تین سیکنڈ کے بعد ایک قتل ہوتا ہے، ہر چودہ سیکنڈ کے بعد ایک بڑا ڈاکہ پڑتا ہے جس میں انسانی جانیں بھی تلف ہو جاتی ہیں اور ہر ایک گھنٹے میں ۸۷ ریپ ہوتے ہیں۔ اچھے بُرے لوگ ہر جگہ اور ہر پرانت میں ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ تھوڑے ہوتے ہیں، اس لیے ہمیں اُن کو نظر انداز کر کے اچھے لوگوں پر ہی

ہمیشہ نظر رکھنی چاہیے۔

ہندو دھارمک آستھا کے اُنوسار دیوی ماتائیں نو ہیں جن میں سے چھ ماتاؤں کا نواس جموں کی مختلف تاراؤں (پہاڑی چوٹیوں) پر ہے۔ جموں کے باسیوں نے اپنے دانشوروں کی مدد و اعانت کے ساتھ ان میں سے سب سے بڑی بہن گوروَوان اور شکتی شالی تصور ہونے والی ماتا وشنو دیوی کی عقیدت اور احترام کے پیشِ نظر اُن کے نام پر ایک یونیورسٹی قائم کی جس کی انتظامیہ میں حکومت بذاتِ خود بلکہ آنریبل گورنر صاحب تک شامل ہیں۔ بڑی اچھی بات ہے، اُس دانشگاہ میں اکثر کشمیر کے بچوں کے لیے داخلہ ممکن نہیں ہے مگر تب بھی کیا ہوا۔ جو بھی بچے وہاں زیرِ تعلیم ہیں وہ بھی تو اپنے ہی بچے ہیں۔ کوئی تو لکھے پڑھے، ہمیں پڑھنے والے بچے ہی پسند ہیں وہ چاہیے کسی قوم کے ہوں۔

اس بات کو نظر میں رکھ کر بلکہ اس سے بہت آگے سوچ کر وادیٔ کشمیر کے چند علم دوستوں، مخیرّ اور مخلص محبِّ وطن انسانوں نے ایک ایسی دانشگاہ کو قائم کرنا چاہا جس کے دروازے بلاتفریق مذہب وملت، رنگ ونسل، اعتقاد و آستھا سب کے لیے کھلے رہیں۔ جس میں افریقی ایشائی، چینی جاپانی، عربی عجمی اور ہندی افغانی میں کوئی امتیاز نہ ہو۔ ٹرانس ورلڈ یونیورسٹی ہونے کے ناطے ہر ایک کو ہر طرح اور حسبِ منشاء تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی سہولت و آزادی ہو۔ اس کا منشور ہی سیکولر روایات پر قائم کیا گیا تھا۔ اس یونیورسٹی کے محرک اور پلانر گرچہ توحید وسنت کے متوالے تھے مگر منشور کا کردار بہرحال سیکولر رکھا گیا تھا، تاکہ دنیا کے کسی بھی ملک کے کسی بھی اعتقاد سے تعلق رکھنے والے بچے کو یہاں علم وعمل سے بہرہ ور ہونے کے مواقع دستیاب ہوں۔ مگر افسوس اس منصوبے کی مخالفت کرنے والوں نے ذرا بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، ذرا بھی تاریخ ہند کے اُن پنوں پر نظر نہیں ڈالی

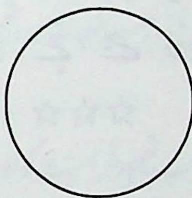
جن میں سُنہری حروف سے مرقوم ہے کہ جب جنگ آزادی کے دوران کالونی سازوں، انگریز غاصبوں کے لیے سوتنتر سیلانیوں کی مخبری ہندوستان کے اپنے لوگ کر رہے تھے اُس وقت بھی اور اُس سے قبل سن ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی میں یہی متوالے، یہی توحید وسنت کے دیوانے اپنا سر کٹا رہے تھے، سولیوں پر لٹک رہے تھے اور اپنے جسم کے خون کا ایک ایک قطرہ ملک کی آزادی، عزت اور سالمیت کے لیے بہا رہے تھے۔ آج اگر ماتا ویشنو دیوی یونیورسٹی سے ترشولی پلٹن پیدا نہیں ہوگی تو کیا ٹرانس ورلڈ یونیورسٹی سے اُگرواد یوں کی جماعتیں نکلے گی۔ ایسا سوچنے اور سوچ رکھنے والوں پر افسوس ہوتا ہے۔ یہ فقط ہٹ دھرمی، ہٹ دھرم سیاست اور منافرت پھیلانے کی ایک سازش ہے تاکہ ملک میں ایک انتشار پھیلایا جائے جس سے غیر جمہوری ملک دشمن عناصر کو اپنا گھناونا مطلب و مقصد پورا ہو سکے۔

مرکزی حکومت کے صاحب فہم وفراست کو اور ریاستی حکومت کی انتظامیہ میں برسرِ اقتدار حکام کو اس بارے میں ایک سیکولر سوچ ونہج کو اپنانے کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی ملک وملت کے علماء کو، دانشوروں کو، صاحبِ فہم وفراست کو اور تعلیم وتعلم کے دلدادہ اصحابِ شوق کو آگے بڑھ کر دیکھنا چاہیے کہ آخر اِس ریاست میں یہ کیا ہو رہا ہے۔ اچھے اور قابل فخر کاموں کی حوصلہ شکنی کیوں ہو رہی ہے۔ آج لوگ چاند اور مریخ پر بسنے کے لیے پلاٹ ریزو کرا رہے ہیں اور لوگوں کو اس نگری میں ایک دانشگاہ کھولنے کی اجازت نہیں مل رہی ہے۔ آخر ہم کب تک متوں، جماعتوں، فرقوں اور اِزموں کا تعصب پال کر اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر بچوں کی حق تلفی کرتے رہیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس ایک واحد مجوزہ یونیورسٹی سے عقل ودانش کے سُوتے نہیں پھوٹ پڑیں گے لیکن فہم وفراست کی چند کرنیں

بھی اگر اس پس ماندہ ریاست کی کسی دانشگاہ سے باہر آئیں گی تب بھی لاکھوں چراغ روشن ہو سکتے ہیں۔ جس میں سب سے بڑا فائدہ اولاً اپنی ریاست کو مل سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شیخ العالمؒ ریسرچ سینٹر کے علاوہ اگر اور بھی علم وادب اور اخلاق و کردار ساز اداروں کو کھولنے کی اجازت مل سکتی ہے تو بہت بہتر ہے کیونکہ جتنے چراغ ہوں گے اتنی روشنی پھیلی گی اور اتنے ہی اندھیارے مٹ جائیں گے۔ اس بارے میں منفی طرزِ عمل اختیار کرنے سے بہتر ایک صحت مند سوچ اپنانے کی حاجت ہے۔ ویسے اِس بات میں بھی کیا کلام ہے۔ بقول طاہرؔ تلہری

مری بُربادیوں کا اک سبب یہ بھی ہے طاہرؔ
وہی رہزن نکلتا ہے جسے رہبر بناتا ہوں

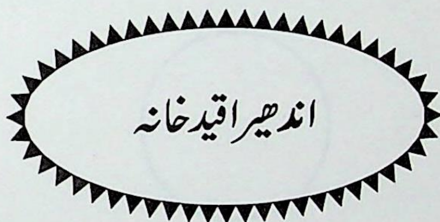




اندھیرا قید خانہ

میں نے بخشی ہے تاریکیوں کو ضیا
اور خود ایک تجلی کا محتاج ہوں
روشنی دینے والے کو ہی کم سے کم
ایک دِیا چاہیے اپنے گھر کے لیے

(شکیلؔ)


اندھیرا قید خانہ

کہتے ہیں صدیوں پہلے کسی ملک کا بادشاہ عام کپڑے پہن کر رعایا کا حال جاننے کے لیے کبھی کبھی محل سے چوری چھپے نکل آیا کرتا تھا۔ اُسی معائنے کے دوران ایک دن اُس نے سڑک پر ایک بھکارن کو بھیک کے لیے سوال کرتے ہوئے دیکھا۔ بھکارن بے حد خوبصورت تھی اور اُس کے بُشرے سے اُس کا بھکارن ہونا ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ بادشاہ اُسے دیکھتے ہی ٹھٹھکا اور سوچنے لگا کہ اس عورت کو تو محل میں ہونا چاہیے۔ یہ یہاں پر کیا کر رہی ہے۔ اُسی روز کچھ وقت کے بعد محل سے کچھ شرفاء چند سپاہیوں کی معیت میں آکر بھکارن کو باعزت اٹھا کر محل میں لے آئے اور بادشاہ نے اُس کے ساتھ جائز حدود میں شادی کر کے اُسے رانی بنالیا۔

چند روز کے بعد رات کو بادشاہ کی اچانک جاگ کُھل گئی، اُس نے رانی کو موجود نہیں پایا۔ سوچا حاجت سے گئی ہوگی ابھی لوٹ کر آجائے گی۔ ایسا ہی ہوا چند ثانیوں کے بعد ہی رانی واپس آگئی۔ کچھ دن کے بعد پھر ایسا ہی ہوا اور پھر بار بار ایسا ہی ہوتا رہا۔ اب کے بادشاہ کو تشویش لاحق ہوگئی اور پھر ایک رات کو اُس نے سونے کا بہانہ کیا اور جونہی رانی بستر سے اُٹھ کر گئی تو بادشاہ بھی دبے پاؤں حقیقت حال جاننے کے لیے اُس کے پیچھے چل دیا۔ بادشاہ کی خواب گاہ سے ملحق ایک شاہی توشہ خانہ تھا، جس میں ہر وقت مختلف قسم کی نعمتوں اور ضیافتوں کے قاب اور طشتریاں لگی رہتی تھیں کہ کیا پتہ کب مزاجِ شاہی کی اشتہا جاگ پڑے، کب بھوک لگے، کب جی کچھ کھانے کو کرے تو توشہ خانہ میں رکھے پکوانوں سے استفسادہ کیا جاسکتا ہے۔ بادشاہ نے نئی رانی کو اُسی توشہ خانہ میں پایا______

اس حالت میں کہ اُس نے اپنی اوڑھنی کا پلو بھیک کے انداز میں پھیلایا ہوا تھا اور

وہ مختلف طشتریوں کے پاس جا کر سوال کرتی ______
''دے اللہ کے نام پر کچھ'' ______ سامنے کی طشتری میں سے ایک لقمہ اُٹھا کر اپنے پلو میں ڈال کر اور آگے بڑھ کر پھر دوسری طشتری کے سامنے بھی یہی عمل دہراتی ۔ اور اِس طرح مختلف طشتریوں سے چند لقمے لے کر نیچے بیٹھ کر کھاتی ۔ بادشاہ یہ صورت حال دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

اگلے روز بادشاہ نے دربار میں رانی کو بھی حاضر رہنے کے لیے کہا اور اُس کے بعد گذشتہ ایام کی روداد دُہرا کر اپنے اُمراء کو حکم دیا کہ اس عورت کو اُسی جگہ پر چھوڑ کے آو جہاں سے اسے رانی بنانے کے لیے لے آئے تھے۔ چونکہ عادت فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے اس لیے مانگنا اور مانگ کر کھانا اس کی فطرت بن چکی ہے۔ اِن حالات میں یہ دوسری طرز زندگی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر سکے گی۔ اگر چہ اس میں ایک عبرت کا پہلو بھی ہے کہ اسے اپنی چیز کو بھی بھیک میں حاصل کرنا پڑتا تھا۔ وہ اِس کی اپنی کمزوری، کم مائیگی اور ذہنی تنزل کی نشانی ہے۔

ایک وقت تھا جب ایک آدمی کی بنیادی ضروریات میں خاص کر روٹی، کپڑا، مکان اور طبی سہولیات تھیں ۔ مگر موجودہ ترقی یافتہ دور میں کسی حد تک دوسری ضروریات اور سہولیات میں مکلّف ہو گیا ہے اور دیکھا جائے تو آج کل کی بنیادی سہولت اور ضرورت بجلی بن گئی ہے۔ یورپی اور بیشتر ایشائی ممالک میں گرچہ نیچرل، تھرمل اور ہائیڈل پاور پروجیکٹوں کے علاوہ نیوکلیر توانائی سے بھی بجلی حاصل کی جاتی ہے مگر اپنی ریاست میں قدرتی آبی وسائل بہت زیادہ ہیں اور پانی اس طریقے سے پہاڑوں پر سے گر آتا ہے جو ہائیڈل پاور پلانٹس کے لیے مفید و موزوں ہے۔ ایسی بات نہیں کہ ہم اُن قدرتی وسائل سے کوئی استفادہ نہیں کرتے، کرتے ہیں اور بخوبی کرتے ہیں ۔ مرکزی حکومت کی مدد و اعانت سے کئی بجلی گھر

تعمیر ہوئے ہیں اور کچھ زیرِ تعمیر بھی ہیں۔ ہمارے یہاں کافی مقدار میں بجلی پیدا ہوتی ہے۔ جو بجلی گھر مرکزی حکومت کی مدد واعانت سے بنتے ہیں اُن کی پیداوار کا نوے فی صد حصہ مرکزی حکومت کو چلا جاتا ہے اور اُس پیداوار کا بہت قلیل حصہ ہم کو ملتا ہے۔ اپنے خرچ کے لیے اپنے ہی پانی سے اپنی ہی سرزمین میں پیدا ہونے والی بجلی کو ہمیں مرکزی سرکار یا این ایچ پی سی (نیشنل ہائیڈل پاور کارپوریشن) سے پیسہ دے کر خریدنا پڑتا ہے۔ اگر ایسا بھی نہ کریں تو جو یہ کبھی کبھی برقی دیدار نصیب ہو جاتا ہے، اُس سے بھی ہم محروم ہی رہ جائیں گے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم بجلی پیدا کرتے ہیں بلکہ دوسروں کے گھر بھی روشن کرتے ہیں، اُن کی فیکٹریاں اور کارخانے چلاتے ہیں اور خود اندھیروں میں ڈوبے رہتے ہیں اور وہ بھی خاص کر سردیوں میں۔

ہماچل پردیش، پنجاب، اُترا کھنڈ وغیرہ ریاستوں میں آبی وسائل ہیں اور بجلی پیدا کرنے کے امکانات بھی ہیں بلکہ بجلی پیدا ہوتی بھی ہے، مگر جہاں تک ممبئ نگری کا تعلق ہے اُس میں بجلی پیدا کرنے کے کم از کم آبی وسائل دستیاب نہیں ہیں۔ یہ نگری گرچہ سمندر کے کنارے پر آباد ہے مگر وہ جو کہا جاتا ہے کہ Water, water every where not a drop to drink یعنی پانی ہی پانی ہر جگہ دستیاب ہے مگر ایک بوند بھی قابل استعمال نہیں۔

چلیے مان لیتے ہیں یہ ریاست خود سے بھی بجلی پیدا کرتی ہے اور دوسروں سے بھی خریدتی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہاں بجلی کتنی اور کس قدر ضرورت پڑتی ہے۔ اُس کی ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ وہاں لگ بھگ چار سو لوکل ٹرینز بھی صرف بجلی کے دم پر ہی چلتی ہیں۔ وہاں مسلسل ومتواتر بجلی چوبیس گھنٹے دستیاب رہتی ہے جس سے ہزاروں کارخانے اور فیکٹریاں بھی دن رات ہزار طرح کی اشیاء پروڈیوس کرتی ہیں۔

اپنے بازار میں جا کر دیکھیے ادویات اور الیکٹرانک گڈس کے علاوہ معمولی سا چپس، دال موٹھ، ٹافی اور تھوم پیسٹ (Garlic Paste) بھی ممبئی سے آتا ہے۔ وہاں کارخانے بجلی کی برکت سے چلتے ہیں جو بلاناغہ اُن کو ملتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں دن رات میں تین شفٹوں میں کام ہوتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں یہاں کے یونٹ ہولڈر کو ٹارچ سے اپنی فیکٹری کے دروازے کا تالا تلاش کرنا پڑتا ہے۔

اس ریاست کی یہ کتنی بڑی بپتا ہے کہ یہاں دستور کے مطابق یہاں کے عوام کو حکومت کی جانب سے بنیادی سہولیات اور ضروریات کی چیزیں خود سے واگذار نہیں ہوتیں۔ عوام کو راشن، پانی، نہر، کنواں، سڑک، ملازمت، انصاف، تعلیم اور خاص کر بجلی بلکہ ہر ایک چیز کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ گویا عوام کو جان بوجھ کر تنگ طلب کیا جاتا ہے۔ اُس پر کسی نے ''پیکرِ تصویر'' بن کر ''کاغذی پیرہن'' زیب تن کر کے ''نقش فریادی'' ہو کر اگر ''شوخیٔ تحریر جتانے کے لیے مُنہ کھولا یا دہائی دی تو ریاست کا حاکمِ اعلیٰ یعنی پولیس مین چمکدار پلیٹ گن لے کر انسانی شکار کے لیے حاضر ہو جاتا ہے۔ کیا عوام یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہے کہ چاروں طرف پہاڑوں سے گرے ہوئے اس قید خانہ نما وادیٔ آہ و افسوس میں انہیں محبوس کر کے بھیک مانگنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے تاکہ بنیادی ضروریات کے لیے جدوجہد ہمہ وقت جاری رہے اور اس قیدی کو موجودہ دنیا کے باشعور اور آزاد انسانوں کی طرح اپنی بھلائی، بہبودی اور تعمیر و ترقی کے لیے متوجہ ہونے کا موقعہ نہ ملے۔

ہماری تقدیر کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ہم آہ بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے سیاسی قیدیوں کو عدالت میں پیش کیا جاتا ہے تو وہاں اُن پر ''کیسری سینا'' کا حملہ ہوتا ہے۔ ہمارے معززین شہر جلسہ سیمینار میں بولنے لگیں تو اُن پر قاتلانہ حملہ ہوتا

ہے۔ ہمارے بچے جو ریاست سے باہر تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے لیے گئے ہیں اُن کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک ہوتا ہے۔ دینی اجتماعوں میں جانے والے نوجوانوں کو مختلف بہانوں سے جیلوں میں ٹھونسا جاتا ہے اور دیگر کاروبار، مزدوری، ملازمت، خرید وفروخت کے لیے کشمیری نوجوانوں کو ہانکا لگا کر پکڑا جاتا ہے اور عقوبت خانوں میں زیرِ عتاب لایا جاتا ہے۔ کتنی کلیاں شاخوں پر اپنی بہار دکھانے سے قبل ہی گلچیں کے نخچیر میں تبدیل ہو گئے۔ اُس ماں کے تار تار دل وجگر کو ذرا دیکھیے جس کی آنکھیں ٹیوشن پر گئے اپنے گلعذار لختِ جگر کی راہ دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں مگر جو کبھی اپنی ٹانگوں پر چل کر لوٹ کر نہیں آیا۔ آیا مگر لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر آیا۔ آخر ہم کیا کریں۔ اپنے دل کے پھپھولے اور سینے میں لگے آلام و آزمائش کے داغ کسے دکھائیں۔ بقول محسن انصاری

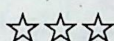
فصلِ بہار میں بھی کلیجے پہ داغ ہے
اپنے چمن کے سنبل و ریحان کدھر گئے
وحشت یہ آج پوچھتی پھرتی ہے شہر میں
دامن وہ کیا ہوئے وہ گریباں کدھر گئے

بہر حال عرض کر رہا تھا کہ اپنی ریاست میں پیدا ہونے والی اور دوسروں کے گھر روشن کرنے والی بجلی کے لیے ہمیں ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ اپنی چیز کے لیے بھی بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ مگر یہ تو انصاف نہیں ہوا۔ یہ گویا مذکورہ بھکارن کی بات ہو گئی کہ اپنے تصرف میں مختلف نعمتیں اور ضیافتیں ہو کر بھی وہ طشتریوں کے آگے ہاتھ پھیلا کر اور بھیک مانگ کر اپنے کھانے کا نوالہ حاصل کرتی تھی۔ سرکار اگر دوسروں کے گھر روشن کرتی ہے۔ اُن کے تعمیر وترقی کا ذریعہ بنتی ہے تو بنے ہمیں بھلا کیا

اعتراض ہوسکتا ہے۔ جو مزاجِ یار میں آئے ______ مگراس کے ساتھ ہی اگر اپنے گھر کی طرف بھی ایک نگاہِ غلط انداز اُٹھے، ہمارے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ہاں! یہ بات بہر حال خیالِ ناز میں رکھنا از حد ضروری ہے کہ۔

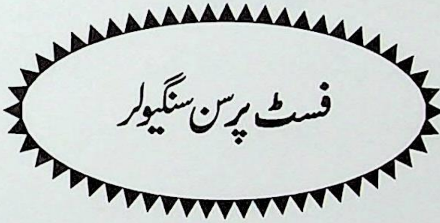
میں نے بخشی ہے تاریکیوں کو ضیا
اور خود اک تجلی کا محتاج ہوں
روشنی دینے والے کو ہی کم سے کم
اِک دِیا چاہیے اپنے گھر کے لیے

(شکیلؔ)



فسٹ پرسن سنگیولر

سب ٹاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارا
(نظیر)


فسٹ پرسن سنگیولر

جب کوئی اپنا پرایا، یار دوست، رشتہ دار، واقف یا ہمسایہ تکلیف میں ہوتا ہے، حاجت ضرورت یا مدد کا طلب گار ہوتا ہے تو میں آگے بڑھ کر جھٹ سے بولتا ہوں:

''ارے میاں گھبرانے کی کیا بات ہے میں ہوں نا''

میں کون ہوں، جاننا چاہیں گے آپ؟

میں بڑا حوصلہ مند، اولوالعزم، باجرأت، جری اور قوت و طاقت کا سر چشمہ ہوں۔ میرے آگے پہاڑ، سرنگوں، بحر مطیع اور سرکش دریا پاؤں چومتے گذر جاتے ہیں۔ میں نے کلی من جارو، الپس، کے ٹو، کن چن چنگا تو کیا ایورسٹ پر بھی جشنِ بہاراں کیے ہیں۔ میرے آگے ہاتھی، ہپو، مگرمچھ اور ریچھ کی کیا بات ہے میں شیر کی مونچھ پر بوسہ دینے کا دل گردہ بھی رکھتا ہوں۔ میں نے ہی جنگل بوئے ہیں، میں نے ہی جنگل اُجاڑے ہیں۔ میں چند پیسوں کی خاطر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا خوب جانتا ہوں۔

میں حاکم اور بادشاہ بھی رہا ہوں۔ میں نے لاکھوں لوگوں کو بیک وقت اپنے قلمرو میں اپنے زیر نگیں رکھا ہے۔ لوگوں پر راج کیا ہے۔ دوسروں کو مطیع و تابعدار بنایا ہے۔ بستیوں کو اُجاڑا ہے، ملکوں کو تباہ کیا ہے، خاندانوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔ ایک ملک پر ایٹم بم گرا کر میں نے لاکھوں لوگوں کی گلی سڑی ہڈیوں پر ''چیرس'' کیا ہے۔ میں سکندر، چنگیز، ہلاکو، ہنی بال، تیمور اور ہٹلر بھی ہوں۔ میں نے ہی ساری دنیا و مسخر کرنے کی بات کی تھی مگر پھر بھی میں نے بخت نصر، نمرود، سلیمانؑ اور ذوالقرنینؑ (cyress) بن کر چار بار ساری دنیا پر حکومت کی ہے۔ میں جارج، جیمز، رونالڈ، رچرڈ اور جولیس سیزر بھی ہوں۔ میں نے ملک فتح کیے اور لاشوں کے مینار بنائے۔ مصر کی ناگن (Serpent of Nile) قلوپطرہ مجھے بس

میں نہ کر سکی، میں نے ہی اُسے اپنے مکرِ مردسے اپنے بس میں کرلیا اور اپنا مطیع و تابعدار بنا دیا۔ میں نے محمد بن قاسم بن کر ایک بچی کی عزت کی خاطر بغداد سے آکر سندھ کو مسخر کرلیا۔ میں نے اعلائے کلمۃ الحق کی حرمت کی خاطر جبرالٹر کے تٹ پر آتے ہی اپنے پیچھے تمام کشتیوں کو جلا ڈالا۔ کیونکہ پیچھے بحرِ زخار میں ڈوب کر موت اور آگے بڑھ کا شاندار فتح کا مژدہ جانفزا تھا۔ اور میں نے ہی اپنی اسلاف کی وراثت بچانے کے لیے صلاح الدین ایوبی بن کر اپنی تلوار جوہر آبدار کے جوہر دکھائے اور یہ بھی میں ہی تھا جس نے اپنے اوپر حملہ ہونے کے انتقام میں نادر شاہ بن کر دہلی میں صرف پانچ گھنٹوں کے اندر تین لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ برسات کے پانی کی طرح دہلی کی گلیوں میں خون بہایا۔

حیران رہ جاؤ گے مگر بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے فرعون ہکسوس کی عہدِ حکومت میں سِفنکس (sphinx) ابوالہول بُت تراشا تھا جو آج بھی ریگزار مصر میں میری ترقی کی معراج کو دیکھتا آرہا ہے۔ گرچہ اُس کی ناک بھی گھس چکی ہے مگر وہ میری طرف مسلسل گھورے جا رہا ہے۔ بابل کے لٹکتے باغ، اہرام مصر و پیرو رہوڈس (Rhodes) میں ساحل کے داخلی مقام پر عظیم لوہے کا بُت کولوسِس (Colossus)، زیوس (Zeus) دیوتا کا مجسمہ اور آرٹیمس (Artemis) دیوی کا مندر جو سابقہ سات عجائباتِ عالم میں سے تھے۔ میرے ہی ہاتھوں کی اختراع ہیں۔ دیوار چین ابھی ڈھے نہیں گئی، اُسے پھر سے موجودہ سات عجائبات میں شامل کیا گیا ہے۔ اُسے بنانے کے لیے لوگ مریخ سے نہیں آگئے تھے۔ ماچوں پیچوں کا مندر بھی میری ہی تعمیر کا ایک نمونہ ہے۔ کیا میری طرزِ تعمیر حیران کن نہیں ہے۔

سقراط اور افلاطون بھی میں ہی تھا۔ میرے فلسفے کی گتھیاں کیا آج تک سُلجھ سکی ہیں۔ میں فہم و فراست کی ایک کتاب ہوں۔ دانائی و حکمت مجھ پر فخر کرتی

ہے۔ بو علی سینا، عمر خیام، الز ہردی، الخوارزمی، ابن حاتم اور رازی وغیرہ میرا ہی نام تھا۔ گلیلیو، ایڈیسن، مارکونی اور گراہم بیل بھی میں ہی تھا۔ اس حکمت اور دانائی کی دنیا سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف اگر دیکھیں تو آج فہم و فراست بھی میری ترقی پر انگشت بدنداں ہے۔ اپنی سائنسی اور ٹیکنالوجی پیش رفت کے بموجب میں نے کمپیوٹر کے ذریعے دنیا کو ایک کمرے میں مقید کر رکھا ہے۔ اپنی عقل و دانش کو بروئے کار لا کر میں اب جانوروں اور انسانوں کے ڈپلی کیٹ (Clone) بنانے اور مصنوعی تولید بھی کرنے لگا ہوں۔ میں خدا تو نہیں ہوں مگر خدایت کا دعویٰ کرنے سے بھی میں پیچھے نہیں رہا ہوں۔ میں نے نمرود اور فرعون بن کر خدایت کا دعویٰ کر کے اپنے آپ کو لوگوں سے پجوایا ہے۔

میں نے سمندروں کو کھنگالا۔ نئے نئے بحر اور براعظم دریافت کیے۔ میں نے دور دراز جزیزوں کو آباد کیا۔ کچھ جزائر میں بدنام ترین قید خانے قائم کیے۔ ابو غریب جیل اُن کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ میں نے کشتیاں اور جہاز بنائے اور موجودہ وقتوں میں ایسے جُنگی بیڑوں کا نرمان کیا جو اپنے اندر خود ایک دنیا ہیں۔ میں نے فضا کی وسعتوں میں اپنے اُڑن کھٹولے دوڑائے۔ چندر ما پر چہل قدمی کی اور مریخ پر اپنے واہن اتار دیے۔ میری نظریں اُس سے بھی آگے کی طرف لگی ہوئی ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

میں بین الاقوامی پولیس مین بھی ہوں اور ساری دنیا کو اپنے ڈنڈے کے زور پر مطیع و تابعدار رہنے کے لیے مجبور کرتا ہوں۔ میں اپنی تفنن طبع کی خاطر دوسرے ملکوں پر حملہ کرتا ہوں اور بے دریغ مستورزن، نہتے مردوں اور شیر خوار بچوں کا قتل

عام کرتا ہوں۔ خود ایوان امن سفید گھر میں رہتا ہوں، اُجالوں اور روشنیوں میں نہاتا ہوں مگر دوسروں کے گھر سیاہ کر کے اُن پر اندھیروں کی چادر تان دیتا ہوں۔ میں نے حرامی بچے بھی جمنے ہیں جو خاموش رہنے والوں کو دھمکیاں اور مطالبہ حقوق بشر کرنے والوں کا خون بہاتے ہیں اور شیر خوار بچوں، معصوم جانوں پر نیپام بموں کی بارش کرتے ہیں۔

میرا ذوقِ جمال حد سے زیادہ ہے۔ اگرچہ میں بہاروں، ہواؤں اور دلفریب نظاروں کا عاشق ہوں مگر ساتھ ہی میں بے حیائی کا بھی شیدائی ہوں۔ میں اُس عورت کو محجوب و مستور رہنے نہیں دینا چاہتا ہوں جو ایسا کرنا چاہتی ہے۔ میں اُس کا نقاب اور سر چادر نوچ کر پھینکتا ہوں اور اُس کو اخلاقی ترقی مانتا ہوں۔ میں عبادت گذاروں اور اپنے اعتقاد کے مطابق مذہبی ہدایات پوری کرنے کے لیے سر پر ٹوپی اور چہرے پر داڑھی اُگانے کی اجازت نہیں دیتا ہوں۔ میں ایسی تمام چیزوں پر قدغن لگاتا ہوں۔

میں نے سمندر کے ایک حصے میں پتھر اور کنکر وغیرہ ڈال کر اُسے زمین میں تبدیل کر کے اُس کو ایک ایسی مثالی رہائش اور سیاحتی قطعۂ اراضی میں تبدیل کر دیا ہے جس کی دنیا میں دوسری مثال ہی نہیں ہے۔ میں نے امریکہ، انڈونیشیا، سعودی عرب اور دوبئی وغیرہ میں اتنی اونچی تعمیرات کھڑی کر دیں ہیں جو انسانی تصورات سے باہر ہیں۔ بڑے دل گردے والا بھی نیچے نظر ڈالے تو خوف سے اُس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ میں اتھاہ سمندر میں ٹیوب ڈال کر ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک ٹرین لے جاتا ہوں اور فلک بوس دیوانی موجوں کے اوپر سے پُل بناتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میں دوبارہ جنم نہیں لیتا، میں جاتا ہوں مگر پھر واپس آتا ہوں۔ میرا اُدھورا چھوڑا ہوا کام میں ہی پورا کرتا

ہوں۔ کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

ہونے کو تو میں بہت کچھ ہوں، پر اپنے بارے میں، میں کتنا اور کیا کیا بتاؤں۔ اُس کو بتانے کے لیے وقت درکار ہے اور اتنا وقت تو میرے پاس ہے ہی نہیں۔ میرے پاس سنانے اور آپ کے پاس سُننے کے لیے وقت ہونا لازمی امر ہے۔

بہر حال میں کون ہوں یہ میں نے بتا دیا۔ میں کیا ہوں اِس کے بارے میں بھی بتا چکا ہوں۔ میں کیسے ہوں، میرا وجود کیا ہے، ذرا بات ہو جائے۔ خالقِ کائنات جس نے اور مخلوق کے ساتھ مجھے بھی تخلیق کیا ہے، نے اپنے دستور جو بنی نوع انسان کے لیے ضابطہ حیات ہے، میں بیشتر مقامات پر میرے بارے میں کہا ہے کہ اُس ذاتِ باری نے مجھے ایک گندے غلیظ، ناپاک اور بدبودار پانی سے پیدا کیا ہے۔ گویا میری حیثیت ایک پانی کے بُلبلے سے بھی گئی گذری ہے۔ یہ بات جب مجھے معلوم ہو جاتی ہے تو میں ڈھیر ہو جاتا ہوں۔ میں نہ فرعون رہ جاتا ہوں، نہ ہٹلر، میں ابدالی رہ جاتا ہوں نہ نیوٹن۔ میرے سارکیے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ میں انسانی ترقی کے معراج سے نکل کر یا بہ الفاظ دیگر سراب (illussion) سے نکل کر حقیقی دنیا میں آجاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جب یہ سب کچھ دھرے کا دھرا ہی رہنے والا ہے تو پھر کیوں نہ کچھ ایسا حاصل کیا جائے، کچھ ایسا مال اندوختہ کیا جائے جو اُس دن کارآمد ثابت ہو سکے گا جس دن انبیاؑء اور اولیاء اللہؒ کو بھی دبدبہ مالکِ یوم دین سے پسینے چھوٹ رہے ہوں گے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے اور وقت نکل جائے رجوع کرنا ضروری ہے۔ یہ نہ صرف ضرورت ہے بلکہ اس کے بنا کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ”سوقیا نہ شاعر“ لقب پانے

والے شاعر نے بڑی فرزانگی کی بات کہی ہے........

کچھ کام نہ آوے گا تیرے ، یہ لعل زمرد ، سیم و زر
جب پونجی بات میں بکھرے گی پھر آن بنے گی جان اوپر
نقارے نوبت ، بان نشان ، دولت حشمت فوجیں لشکر کیا
مسند تکیہ ، ملک مکان ، کیا چوکی کرسی تخت چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارا

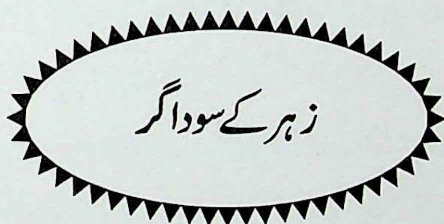
(نظیر اکبر آبادی)



زہر کے سوداگر

ظلم کی بات ہی کیا ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تک

(ساحرؔ لدھیانوی)


زہر کے سوداگر

اپنے مذہبی نظریات اور سیاسی خیالات بلکہ اپنے دل کی بات کے پرچار کے لیے راشٹریہ سیوم سیوک سنگھ بچوں کے سکولوں کو استعمال کرتی ہے۔اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک تنظیم قائم کی ہوئی ہے جس کا نام وِدیا بھارتی ہے اور یہ تنظیم جو سکول کھولتی ہے اُن کا نام سرسوتی شِشو مندر رکھا جاتا ہے۔اس طرز کا پہلا سکول سن ۱۹۵۶ء میں گورکھپور میں کھولا گیا جب کہ اس تنظیم کے تحت لگ بھگ پندراہ ہزار سکول سارے ہندوستان میں قائم ہیں۔ میزورم اور کشمیر کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ پر ایسے زہر کے کنویں موجود ہیں جن کے پانیوں میں ایسا زہر گھول دیا گیا ہے جس کی پھواریں خاص طور پر اقلیت پر ہی پڑتی رہتی ہیں اور وہی اس سمِ قاتل کے ہدف بنتے رہتے ہیں۔ساٹھ ستھر کالجوں اور اعلیٰ تعلیم کے دیگر تیس سے زائد اداروں کو بھی یہ تنظیم کنٹرول کرتی ہے۔ پندرہ ہزار سکولوں میں زائد از پانچ ہزار سکول سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن (CBSE) اور متعلقہ علاقوں کے بورڈ آف سکول ایجوکیشن (BOSE) سے ملحق اور منظور شدہ Affiliated and recognised ہیں۔

یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ایک بچے کا ذہن ایک سلیٹ کی طرح ہوتا ہے۔ آپ اُس پر جو چاہو لکھ لو تو بچہ اُس کو ذہن نشین کر کے تاعمر اُسے یاد رکھے گا۔آپ نے غور کیا ہوگا کہ پرائمری تعلیم کے لیے ابتدائی کلاسوں میں آپ نے جو کلمات، دعائیں، اشعار، پہاڑے رٹ رٹ کر ذہن نشین کر لیے ہوں گے وہ آپ کی یاداشت میں آج بھی محفوظ ہوں گے۔اور اسی فطری اور نفسیاتی پہلو کا ناجائزہ فائدہ اُٹھا کر یہ رجعت پسند طاقتیں بلکہ ملکی ایکتا، سالمیت، خوش حالی اور امن وامان کی دشمن جماعتیں اپنی مطلب برآری اور اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے شروعات بچوں

سے ہی کرتی ہیں تا کہ وہ ہر وقت اور ہر دور میں تو گڑیا اور پروہت جیسے لوگ پیدا کر کے ہندوستان میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کا جینا حرام کر دیں۔

ان سکولوں میں ریاستی حکومتوں یا متعلقہ ایجوکیشن بورڈوں سے منظور شدہ نصاب نہیں پڑھایا جاتا بلکہ وِدیا بھارتی کا اپنا خود ساختہ اور خود ترتیب دیا ہوا نصاب لاگو کیا جاتا ہے تا کہ آر ایس ایس کے جو دعوے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ملکی سیاست کے بارے میں ہیں اُن کو من و عن بچوں کے ذہنوں میں ڈال کر اُنہیں شروع سے ہی اس طرح تیار کیا جائے تا کہ بڑے ہو کر بچے وہ مسلم کُش پالیسی اپنائیں جس کے لیے اُن کو تیار کیا جاتا ہے۔ کلاس رومز کی دیواروں پر دیوی دیوتاؤں اور آر ایس ایس کے لیڈروں کی تصویریں آویزاں کی جاتی ہیں اور اس طرح کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے جس میں بچے کا ذہن صرف ایک مخصوص روش پر چلتا جائے، ایک ہی ڈگر پر سوچتا جائے اور صرف مسلم دشمن خیالات کو ذہن نشین کرتا جائے۔

ٹیچرس ڈے ویدویاس کا یوم پیدائش اور بچوں کا دن کرشن جینتی کو منایا جاتا ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ ویدویاس کے تالیف کردہ گرنتھوں کے مخصوص مقامات پر انگوٹھا ہی رکھا جاتا ہے۔ کتابوں میں دیگر پروپیگنڈے کے ساتھ گول والکر اور ویر ساورکر کی سوانح حیات پڑھنا لازمی ہے۔ اساتذہ ہر ماہ بچوں کے والدین کے ساتھ اُن کے گھروں اور سکول میں ملتے ہیں اور اُن سے اپنے ایجنڈے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ مزید برآں ہدایتیں دیتے ہیں اور آر ایس ایس کا زہر آلود لٹریچر فراہم کرتے ہیں۔ تمام کلاسوں سے متعلق کتابوں کی حیثیت نصابی نہیں بلکہ پروپیگنڈے کے مواد سے زیادہ ہر گز نہیں ہے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ این سی ای آر ٹی (NCERT) ایک ایسا مرکزی

ادارہ ہے جو تمام ہندوستان کے سکولوں کے لیے مرکزی سطح پر کتابیں تیار کراتا ہے اور اُن کو شائع بھی کراتا ہے۔کوئی ریاست اُن کا تیار کردہ نصابی کورس مکمل طور سے لاگو (Adopt) کرتی ہے یا کوئی چند کتابیں یا بعض کتابیں پوری یا جزوی طور (Adapt) اپناتی ہیں ۔عرصہ ہوا اس ادارے کی جانب سے قائم کردہ ایک ہائی لیول کمیٹی جس میں ماہر تعلیم اور تعلیمی نشر و اشاعت سے وابستہ کئی معروف اشخاص شامل تھے، نے وِدیا بھارتی کی جانب سے مختلف جماعتوں کے لیے شایع شدہ کتابوں پر ایک مبسوط رپورٹ تیار کر کے مرکزی حکومت کے سامنے پیش کی تھی جس میں اور باتوں کے علاوہ اس بات کی واضح طور سے نشاندہی کی گئی تھی کہ یہ کتابیں اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں سکولوں میں پڑھایا جائے۔انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ایسی فرقہ پرست تنظیمیں جو مذہب اور تہذیب کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتی ہیں_____ کو ریاستی امداد کے سکول قائم کرنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں دی جانی چاہیے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ مرکزی حکومت میں ایسی سفارشات پر کان نہیں دھرے جاتے نہ اُن کو قابل اعتنا سمجھا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات ایسی سفارشات کو پڑھے بغیر ہی داخل دفتر کیا جاتا ہے۔

بچوں کو تعلیم کے نام پر اُن کے ذہنوں کو کس طرح سے زہر آلود کیا جا رہا ہے اُس کی چند مثالیں دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔اُن کی تیار کردہ ابتدائی کلاسوں کی کتابں میں کچھ اس طرح کی عبارتیں ملتی ہیں۔

☆ ہمارے دیش کو لیٹرے اور ظالم لوگ (مسلمان) ہمیشہ لالچ کی نظر سے دیکھتے رہے، اس لیے وہ بار بار حملے کرتے تھے۔حملہ آوروں سے لڑنے کی ہماری یہی کہانی گوروگاتھا (فخر ومباہات کی داستان) کہلاتی ہے

☆ عرب وحشی تھے جو دوسروں کو اپنا مذہب اختیار کرانے کے لیے آئے تھے۔

اُن کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے ہاتھ میں قرآن ۔ اُن کے راستے میں جو بھی ملک پڑا انہوں نے اُسے برباد کر دیا۔ ماؤں، بہنوں کی بے حرمتی کی ۔ اُن کے پاس شرم اور انصاف نام کی کوئی چیز نہیں تھی ۔ وہ لیٹرے اور ظالم تھے۔

☆ دہلی کا قطب مینار سمراٹھ سمدر گُپت نے بنوایا تھا۔

☆ بدیسی بادشاہ محمد تغلق نے اپنی راجدھانی اس لیے بدل دی کہ وہ ہندو راجاؤں سے ڈرتا تھا۔ اُسی کے ڈر کے کارن وہ راج دھانیاں تبدیل کرتا رہتا تھا۔

☆ ہندوستان اُس وقت آزاد ہوا جب پیشوا مادھو راؤ نے مسلمان ریاستوں کو ہرایا اور بادشاہوں کو شکست دے کر اُن کو قید کر لیا۔

☆ مسلمانوں نے بے شمار ہندوؤں کو بہ نوک شمشیر مسلمان کیا۔ ایسا بہت دیر تک ہوتا رہا۔

☆ مسلمان بُت پرست نہیں ہیں مگر اُن کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ مکہ جا کر شولنگ کے درشن کریں۔ مکہ میں شولنگ ستھاپت ہے۔

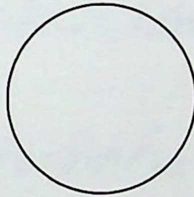
☆ سن ۱۵۲۶ء سے سن ۲۰۱۴ء تک رام جنم بھومی پر ۷۷ حملے ہوئے۔

☆ بابری مسجد کو آزاد کرانے کے دوران ملائم سنگھ یادو نے ساڑھے تین لاکھ ہندو اور کارسیوک قتل کیے۔

کہتے ہیں جھوٹ کے پاؤں کہاں ۔ وقتی طور جھوٹ ایک ہتھیار کے بطور استعمال کیا جاسکتا ہے مگر جلد یا بدیر آخر کار دونوں جہانوں کی رسوائی ہی اُن کا مقدر ہوتی ہے۔ ہندوتوا کے نام پر زہر کے یہ سوداگر آخر ایک دن ہندوستان کا بیڑہ ہی غرق کر کے رہیں گے اور امید تو یہی ہے وہ دن دور نہیں ہے ۔ کیونکہ ظلم بہت ہی زیادہ بڑھ چکا ہے اور ظلم جب بڑھتا ہے تو بقول ساحر لدھیانوی

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
خون دیوانہ ہے دامن پہ ٹپک سکتا ہے
شعلۂ تُند ہے دامن پہ لپک سکتا ہے
خون چلتا ہے تو رُکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آینوں سے
ظلم کی بات ہی کیا ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تک

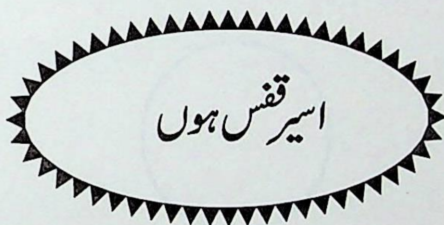
☆☆☆



اسیرِ قفس ہوں

بر مزارِ ما غریباں نن چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبلے

(نور جہاں)


اسیر قفس ہوں

جب میں دنیا کے کسی بھی جگہ کی رہنے والی کسی لڑکی یا خاتون سے متعلق دست درازی یا بے عزتی کے بارے میں سُنتا ہوں تو میرا خون کھول اُٹھتا ہے۔ مجھے نہ صرف بے حد رنج ہوتا ہے بلکہ بے حد غصہ بھی آجاتا ہے۔ اُس وقت مجھے اپنی کم طاقتی، کم مائیگی، کم اختیاری اور بے دست و پا ہونے پر بے حد افسوس بھی ہوتا ہے۔ یقین مانیے ایسے موقعوں پر میں اپنے آپ کو بے حد کمزور اور لُٹا لُٹا محسوس کرتا ہوں۔ سوچتا ہوں اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں کیا کر گذرتا ____ شاید بہت کچھ ____ اب یہ میری نرم دِلی ہے یا حساس طبیعت کہ میں ایسے موقعوں پر اپنے آپ کو بھی مجرم ٹھہراتا ہوں۔ کیونکہ ایک مرد ہونے کے ناطے میں سوچتا ہوں کہ ایک مرد کو مضبوط قوی جسم اور اپنے اہل خانہ پر سرداری کیا ملی کہ اُس نے بے تحاشا ناجائز پر بھی مُنہ مارنے کو اپنا شعار و دستور بنا لیا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن کی مظلومہ لڑکی اولاد ہوتی ہے، جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے، اُن والدین پر اور اُن بہن بھائیوں جن کی وہ بچی یا خاتون دل کی دھڑکن ہوتی ہے، پر کیا بیتتی ہوگی۔ وہ کیسے اُس اندوہناک صدمے کو برداشت کر پاتے ہوں گے، سوچنے سے رونگٹھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اسلامی ٹرمونولوجی (Ternonology) میں اپنی اہلیہ یا اپنی گھریلو مستورات کی عزت کی محافظت کو غیرت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس آبگینے کو اسلام نے اس باریک بینی اور سنجیدگی سے لیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنی زوجہ، کسی گھریلو خاتون یا مستورات کی عزت بچاتے ہوئے مارا بھی جائے گا تو اُسے شہادت کا درجہ عطا ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل دہلی میں دن دہاڑے رواں دواں بس میں جو شرمناک واقعہ رونما ہوا۔ میرے خیال سے برصغیر ہندو پاک اور آدھی دنیا کے سارے ذی ہوش

انسانوں کے کانوں میں اُس کی بھنک ضرور پڑی ہوگی اور جنہوں نے اس واقعے کو پوری سنجیدگی کے ساتھ لیا انہوں نے تو کئی دن رات تک سڑکوں پر اُتر کر اُس کا احتجاج کیا اور حکومت وقت کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اس بارے میں کچھ زیادہ سخت قوانین نافذ کرے۔ ایسے گھناؤنے جرائم پر جتنا بھی ممکن ہو احتجاج ہونا چاہیے۔ جب احتجاج ہونے لگا تو اُس میں حال ہی میں اپنی تفویض شدہ ڈیوٹی سے سبکدوش ہوئے ایک بڑے فوجی سربراہ نے بھی شمولیت کی۔ جو بہت اچھی بات تھی جس کی سراہنا عوام نے بڑے پیمانے پر کی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے احتجاج کرنے والوں کا حوصلہ بھی کافی بڑھ گیا اور احتجاج نے ایک بامعنی حیثیت اختیار کر لی۔

مذکورہ سابقہ فوجی افسر اُس وقت بھی مظلوم کشمیریوں کے قضاء وقدر کا مالک تھا جب ہزاروں کی تعداد میں لوگ گھر سے گئے مگر واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ بھرے پُرے گھرانوں کے چشم و چراغ، چھوٹے چھوٹے کمسن بچوں کے پاپا، دلہنوں کے دُلہے اور جھکی کمر میچی آنکھوں والے بوڑھوں کے سہارے اس طرح سے بساط حیات سے غائب ہو گئے جیسے وہ کبھی دنیا میں آئے ہی نہ تھے۔ درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں کو، ہواؤں اور فضاؤں کو، شجر و حجر اور تاریک کالی کالی راتوں کو اُن کا پتہ معلوم تھا۔ اُن پر کیا بیتی اُس کے بارے میں بھی وہ جانتے تھے۔ مگر کاش وہ زبان رکھتے تو ہم اُن سے اپنے زخموں، کھرنڈوں، ناسوروں کے لیے علاج و مداوائے غم پوچھتے۔ وہ اپنے تخلیقی جامے سے باہر نہ آ سکے لیکن دور دراز گمنام مقامات پر مزاروں، مدفنوں نے واویلا کیا، چیخ و پکار مچادی ـــــ دیکھو مجھے دیکھو ـــــ

مجھے دیکھو حسرت کی تصویر ہوں میں

دیکھو____ ہم معلوم لوگوں کے نامعلوم اور بے نام ونشان قبرستان ہیں۔ہم اُن لوگوں کی کھوکھلی تہذیب، جمہوریت اور انسان دوستی کے دعوے کی ایک مُنہ بولتی تصویر ہیں جنہوں نے دوستی کی آڑ میں پاسبان بن کر ہماری پاسبانی مزاروں کی جانب کی۔مزاروں، مدفنوں اور مرقدوں پر عام طور پر نشان لگتے ہیں۔دیوار بندی یا حد بندی ہوتی ہے مگر ہمارے یہ مزار اتفاقی دریافت ہیں کیونکہ یہاں ؎

ہر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بُلبلے

(یہ ہم غریبوں کی گمنام قبریں ہیں۔کسی نے چراغ جلا کر بالین پر نہیں رکھا اور نہ کسی نے چند پھول ہی نچھاور کیے۔نہ پروانہ ہی آ کر جلتے چراغ پر نثار ہوا اور نہ ہی کوئی بُلبل یہاں نغمہ سرا ہوئی)

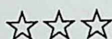
ہم اِن مرقدوں میں کافی دیر سے پڑے ہیں اور ہمارے لواحقین ہمیں پانے کی آس میں آئے دن سڑکوں پر خاموش احتجاج پر بیٹھتے ہیں۔اب اُس ماں کو کون سمجھائے جو اپنے اکلوتے بیٹے کے انتظار میں خاک ہو چکی ہے۔اُس باپ کو کیا بتایا جائے کہ ایک جھوٹی اُمید کے سہارے کب تک تڑپتے رہو گے۔دلہنوں کی افشاں نالیوں میں بہہ چکی ہے اور بہنوں کی چُنریاں تار تار ہو چکی ہیں۔بھائی ____ بھائی کی جدائی میں آہ وفغاں کرتا ہے اور چھوٹے بچے یتیم خانوں میں پل رہے ہیں۔خاک بسر بیواؤں کی آس ابھی تک باقی ہے جیسے ؎

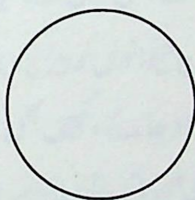
یہ میری سادہ دلی ہے کہ میرا حُسنِ یقین
نا اُمیدی میں بھی اک آس بندی رہتی ہے
جانتا ہوں یہاں کوئی نہیں آئے گا
پھر بھی دروازے پر آنکھ لگی رہتی ہے

وہ فروری کے دن تھے اور مذکورہ فوجی سربراہ ہی پورے کروفر کے ساتھ اپنے وطن کی الفت کے لیے ہم غریبوں کی محبت کا مذاق اڑاتا پھر رہا تھا۔ دہلی میں دامنی کا شرمناک واقعہ سامنے آیا تو پورے ہندوستان کے ایک ارب تیس کروڑ لوگ تلملا اُٹھے۔ کنن پوشہ پورہ میں سولہ سالہ ذرینہ کو چار درندوں نے پکڑ کر اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، چونکہ لڑکی کمسن تھی، بہیمانہ درندگی سہن نہ کرسکی، شہید ہوگئی اور دوسرے دن اُن درندوں نے مرحومہ کی شلوار بندوق کی نال کے ساتھ باندھ کر گاؤں والوں کا مذاق اڑایا۔ اُس وحشیانہ پن پر بحرو بر نے رویا۔ اُس درندگی پر فضاؤں نے آنسو بہائے، ہواؤں نے بین کیے، پہاڑوں، ندی نالوں نے چیخیں ماریں، شجرو حجر نے واویلا کیا۔ مگر اُس وقت اُس فوجی نے کیا کیا۔ اگر اُس وقت وہ وردی پوش تھا، احتجاج نہیں کرسکتا تھا، اُن حیوانوں کو بیڑیوں میں جکڑ تو سکتا تھا۔

ہندوستان بھر میں کچھ بھی ہو جائے، کہیں بھی ہو جائے تو الیکٹرانک میڈیا کے بھونپو بردار مسلمانوں کو ملوث ٹھہرا کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ اُس وقت انہوں نے چُپ کیوں سادھ لی۔ اُس وقت یہودیوں کی چھتر چھایا میں پلنے والے اور وہ شور وغوغا کرنے والے اینکرس چنڈو خانے میں مست ومخمور بیٹھے تھے۔ یہاں میڈیا، سماجی، سیاسی اور فوجی پالیسیوں میں یہ دوہرا معیار کیوں پایا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں اس گھناؤنے جرم سے متعلق قانون کی سابقہ شقوں میں کچھ تبدیلی آئی اور کچھ نیا پن بھی آگیا۔ مگر انصاف کے مدعی جہاں تھے وہی رہے۔ افسپا کے علم برداروں نے اپنی بلوان سینا کو کشمیری مستورات کی عزت سے کھلواڑ کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی۔ آپ کو فریاد کرنے کا بھی یارا نہیں۔ آپ فریاد کس سے کریں گے۔ آپ کا اپنا کون ہے۔ ذرہ ذرہ آپ کا دشمن ہے۔ آپ جو سانس لے رہے ہیں اُسے ہی غنیمت جانیے۔ کیا پتہ کل آپ کو اپنے مسکن سے بھی بیگانہ نہ کر دیا

جائے۔ یہاں دوسرے اقلیتی فرقوں کے ساتھ جان بوجھ کر امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ اب اگر کشمیر میں یہیں ایک مذکور واقعہ ہو چکا ہوتا تو لوگ اُسے بھول چکے ہوتے مگر اُن سینکڑوں واقعات سے کیسے آنکھیں موندی جاسکتی ہیں جو خاص طور پر متعلقین کے دلوں پر کچوکے لگاتے رہتے ہیں۔ کیا کرالہ ٹینگ، کپوارہ، ہندوارہ، شوپیاں، بیج بہاڑہ، کولگام جیسے بیسوں واقعات کو بھلایا جا سکتا ہے۔ شاید کبھی نہیں ــــــ کبھی نہیں ــــــ ہرگز نہیں۔ اب وہ واقعات ــــــ واقعات نہیں رہے بلکہ رستے ناسُور بن چکے ہیں۔ وہ رستے ناسُور جو کبھی مندمل نہیں ہو سکتے۔ کبھی بھر نہیں سکتے۔





شور اتری مبارک ہو

گذرتی ہے مری کھڑکی سے وہ بادِ صبا جب بھی
نہ تیری کچھ خبر لائے یہ ہرگز ہو نہیں سکتا

(پرویز مانوسؔ)

شوراتری مبارک ہو

میں نے ایک سپنا دیکھا۔

سپنے میں ___ میں نے دیکھا کہ میں ایک سکول کا لڑکا ہوں اور پیٹھ پر کتابوں کا بیگ اٹھائے سکول سے گھر کی طرف آرہا ہوں۔ اپنے صحن کے باہر والے بڑے دروازے پر پہنچتے ہی میرے کانوں میں مجھے بلانے کی آواز آتی ہے۔ میں نظریں اوپر کی جانب اٹھاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ میری نیکسٹ ڈور نیبر (Next door Neighbour) کملاوتی جسے عرف عام میں اُس کے گھر والوں کے علاوہ ہم بھی جگری بلاتے تھے، مجھے اوپر آنے کا اشارہ کر رہی ہے۔ میں اُس کے گھر میں جاتا ہوں، وہ چھت کی شہتیر سے لٹکتی ہوئی ایک چھوٹی سی ٹوکری اتار لیتی ہے۔

''آج ہم نے روٹھ (میٹھی روٹی) بنائے تھے۔ تمہارا حصہ الگ سے رکھا ہے ___ یہ لو''۔ وہ میٹھی روٹی میری طرف بڑھا کر کہتی ہے۔

میں میٹھی روٹی لے کر واپس مڑتا ہوں۔ آدھا اُن کی سیڑھیوں پر اور باقی آدھا حصہ گھر تک پہنچتے پہنچتے چٹ کر جاتا ہوں۔ ایسے کتنے ہی موقعوں پر جگری نے مجھے وہ میٹھی روئیاں کھلا کر اپنائیت کا ثبوت دیا ہے اور میں نے بھی کبھی اُس ماں کو کوئی دوسری طرح کی ماں یا دوسرے دھرم کی ماں نہیں سمجھا۔ خواب کا منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔

بارات آرہی ہے۔ ایک خوبصورت دولہا موٹر سے اُترتا ہے۔ میں زور سے شنکھ بجاتا ہوں، کیونکہ باراتیوں کے استقبال میں ___ میں سب سے آگے تھا۔ ماسٹر تارک ناتھ یا کملاوتی کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔ مسلمان عورتیں ایک طرف پرے باندھ 'ونہ وُن' گا رہی تھیں اور پنڈتانیاں اپنے طریقے سے بارات کی آمد پر

خوشیوں کا اظہار کر رہی تھیں ۔ میں کام کاج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ پھر دُلہن اپنے سسرال کے لیے رخصت ہو جاتی ہے ۔ میں بھی اُس کے ساتھ اُس کی سسرال تک اُسے چھوڑنے جاتا ہوں ۔ اس بات کا کوئی بُرا نہیں مانتا۔ مجھے کوئی پرایا یا دوسرے فرقے سے تعلق رکھنے والا نہیں سمجھتا۔ ایک اپنائیت ، یگانگت اور رواداری کا ماحول تھا۔ تیرے اور میرے کا تصور نہیں تھا۔ ہاں کچھ مذہبی ، سماجی اور روایتی حد بندیاں بے شک تھیں مگر وہ ایک دوسرے پر بار ثابت نہیں ہو رہی تھیں ۔

خواب کا منظر پھر بدل جاتا ہے۔

میری شادی ہو رہی تھی ۔ میں دولہا بنا بیٹھا تھا۔ سب سے پہلے ماسٹر تارک ناتھ ہی میرے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال دیتے ہیں اور ہاتھ میں کچھ دست بوسہ بھی تھما دیتے ہیں ۔ میری ماں ایک بڑے تھال میں چاول ، چینی ، مصالحے ، گوشت اور کچھ روپے ماسٹر جی کے گھر میں دے آتی ہے اور جگری باداموں کا ایک لونگن (ڈیڑھ سیر کا پیمانہ) اُس تھال میں ڈال دیتی ہے۔ میں دلہن لے کر آتا ہوں تو جگری شیرینی اور ریز گاری کی ورشا کرتی ہے۔ ماسٹر جی کی بیٹی کانتا ہمارے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لیتی ہے اور مجھ سے روایتی انداز میں نیگ طلب کرتی ہے۔ چارہ کیا تھا مجھے کچھ رقم دینا پڑتی ہے۔

سپنے کا درشیہ پھر پلٹ جاتا ہے۔

ماسٹر جی کا دیہانت ہو جاتا ہے ۔ صفِ ماتم ہمارے گھر میں بھی بچھ جاتی ہے۔ شمشان گھاٹ تک ہم سب ساتھ جاتے ہیں۔ سردی کا موسم ہوتا ہے۔ گھر کا سب سامان تہس نہس ہو چکا ہوتا ہے اس لیے کانگڑیاں ہم اپنے گھر سے لا کر دیتے ہیں۔ ماسٹر جی کے گھر والے اگر دس دن تک سوگ مناتے ہیں ہم مہینہ بھر بے کل و پریشان رہتے ہیں کیونکہ ہمارا استاد ہم سے چھین گیا ہوتا ہے۔ روایتی انداز اور

مذہبی رسم کے مطابق اُن کے گھر والے مُنہ اندھیرے باری باری اپنے برآمدے میں ماسٹر جی کو پکارنے نکلتے ہیں اور میں سپنے میں دیکھتا ہوں کہ میں بھی اپنے استاد کو اپنے برآمدے میں نکل کر پکارتا ہوں۔ ماسٹر جی سردی تو نہیں لگی۔

ماسٹر جی کانگڑی تو نہیں چاہیے۔

پیاس تو نہیں لگی ماسٹر جی۔

پانی تو نہیں چاہیے ماسٹر جی۔

اُو ماسٹر جی میں آپ کے بنا کیا کروں۔

اور پھر میں زور زور سے رونے لگتا ہوں۔ اسی رونے کے دوران میری آنکھ کھُل جاتی ہے۔ میں جاگ پڑتا ہوں اور میرا سپنا ٹوٹ جاتا ہے۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھتا ہوں اور سب سے پہلے ماسٹر جی کے مکان کی جانب نظریں دوڑاتا ہوں۔ خصوصاً اُس کھڑکی کی طرف جو گلی میں کھلتی ہے اور جہاں سے جگری مجھے پکارا کرتی تھی۔ کبھی میٹھی روئی دینے کے لیے، کبھی حال چال پوچھنے کے لیے اور کبھی فقط دعائیں دینے کے لیے۔ بڑی مایوسی کے عالم میں ایک لمبی آہ بھر کر میں اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ارے یہ مکان تو آٹھ سال قبل کسی نے خریدا تھا مگر ابھی تک اس میں رہنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ مجھے لگا کہ مکان کے در و دیوار میری جانب حسرت بھری نگاہوں کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اُس کے بعد میری نظریں آنند جو کے مکان کی جانت جاتی ہیں۔ وہاں اوپر والی منزل سے ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے ایک کُتا سر نکال کر بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔ غالباً یہ وہی کمرہ تھا جہاں ڈاکٹر بھوشن کی علم حیوانات سے متعلق ڈھیر ساری کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ اب علم حیوانات کا مطالعہ کرنے وہاں حیوانات ہی جاتے ہیں۔ میری بسمل نگاہیں پلٹ کر آ گئیں اور میں سوچنے لگا کہ آخر یہ لوگ یہاں سے کیوں نکل گئے۔ اپنی

ماں کی آغوش کو چھوڑ کر بھلا کوئی جا سکتا ہے۔ آخر انہوں نے ماں کی گود کو کیوں سُونی کر دیا۔ اگر مرنے یا مارے جانے کے خوف سے ڈر کر بھاگے تو وہ فیصلہ عبث تھا۔ آندھی کی لپیٹ میں تو دس بیس لوگ آہی جاتے ہیں۔ جو نہیں بھاگے کیا انہوں نے دھرتی ماں کو زائد از ایک لاکھ نفوس کی قربانی بھینٹ نہیں کی۔

سن ۱۹۹۰ء میں فقط ایک صوبے میں آگ لگی تھی مگر اُس میں مذہبی منافرت یا فرقہ داریت نہیں تھی مگر سن ۱۹۴۷ء میں ایک بڑا وشال برصغیر آگ کی لپٹوں میں آ گیا تھا۔ جب اُس وقت اُن لوگوں کا بال بانکا نہ ہوا تو اب کے ایسا کون سا طوفان آیا تھا کہ وہ کھیتوں میں کھڑی فصلیں چھوڑ کر نکل گئے۔ سن سنتالیس میں بھی وہی وادی اور وہی لوگ تھے اور سن نوے میں بھی وہی پوزیشن تھی۔ پھر اتنی جلد بازی کرنے کی کیا وجہ تھی۔ کہیں وہ بہکاوے میں تو نہیں آئے۔ یقیناً وہ متعصب اور فرقہ پرست لوگوں کے بہکاوے میں آ کر سب کچھ بھول بھال کر بس صرف یہاں سے نکلنے کی فکر میں رہے۔

وہ یہ بھی سمجھتے رہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کو سُر کھشت کیا۔ ٹھیک ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا ہمارے بچے ان پڑھ رہے۔ کیا اُس طوفانِ بادو باراں اور آندھی واندھکار میں ہمارے بچے ڈاکٹریٹ، ایم بی بی ایس، ایم ڈی، کے اے ایس، آئی اے ایس اور آئی پی ایس وغیرہ نہیں ہوئے۔ ہمارے ایک سپوت نے عزت مآب مقابلتی آزمائش میں سارے برصغیر میں پہلا امتیاز حاصل کر کے اُن لوگوں کے دعوے کو نہیں جھٹلایا جب کہ وہ پہلے ہی ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر چکا تھا۔ باقی رہی طبعی موت اُس کے لیے اجل یعنی مقررہ وقت ہے۔ انسان کہیں پر بھی ہو، موت اپنے مقررہ وقت پر آ کر رہتی ہے۔

کاش یہ لوگ نہ چلے گئے ہوتے۔ اُس طرح سے کم از کم ہمیں اپنے اساتذہ

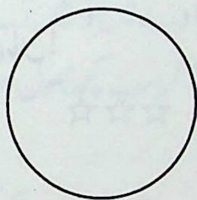
کے نورانی چہرے ہمارے آنکھوں کے سامنے ہی رہتے۔ اُن کے بعد اُن جیسی کوئی شبیہ، کوئی پرتو اور کوئی عکس یا کوئی ملتا جلتا چہرہ نظر آتا تو منتظر پُر شوق، پیاسی نگاہیں کچھ تو شانت ہو جاتیں۔

مجھے یقین ہے کہ جگری اب بھی میٹھی روٹی بنانے والے دن میرا حصہ ضرور الگ سے رکھتی ہوگی کہ مُنا جی اب آیا ______ آ رہا ہوگا ______ ابھی آئے گا اور پھر انتہائی مایوسی کے عالم میں آنسو بہاتی ہوگی جس طرح میں اس وقت اُس کی یاد میں رو رہا ہوں۔

روٹھ اور وٹک کے اخروٹوں کا میں اب بھی ویسا ہی شیدائی ہوں۔ میں تمہیں بھولا نہیں ہوں جگری۔

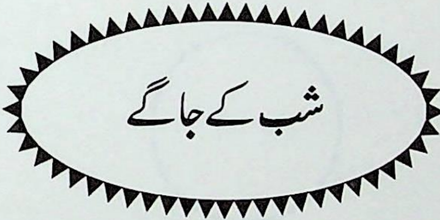
شو راتری مبارک ہو میری ماں!





شب کے جاگے

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
(مخدوم محی الدین)


شب کے جاگے

کبھی کبھی ایک انسان کا من کچھ کرنے کو نہیں چاہتا ہے۔ کھانا پاس ہو، کھانے کو جی نہیں کرتا۔ جیب میں پیسے ہوتے ہیں مگر کچھ خریدنے کو دل نہیں مانتا۔ اُس پر ایک مایوسی سی طاری رہتی ہے جس کو انگریزی میں ''موڈ'' نہ ہونا کہتے ہیں۔ یہ موڈ بگڑنے کی گرچہ کوئی خاص یا ظاہری وجہ نہیں ہوتی مگر آدمی اپنے آپ پر ایک بھاری بوجھ سا محسوس کرتا ہے۔ خواہ مخواہ کی ایک یاس یا نا اُمیدی سی اُس پر طاری ہو جاتی ہے اور ایک انجانا غم اُس کو گھیرے میں لے لیتا ہے۔ اس انجانے اور نا معلوم بن بلائے غم کو اسلام نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ محسوس کیا ہے اور اسے ''ھم وحُزن'' کا نام دیا ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیش بہا دُر فشانی میں جن دس فتنوں سے ہمیشہ پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے اُن میں سے دو فتنے ''ھم اور حُزن'' کو بتلایا گیا ہے۔ گویا یہ کیفیت یونہی پس پُشت (ignore) ڈالنے کی نہیں ہے جب کہ اِسے فتنہ سے تعبیر کرتے ہوئے اس سے پناہ مانگنے کی ہدایت دے دی گئی ہے۔

بیٹھے بٹھائے اچانک اور بغیر کسی پیشگی اطلاع کے آپ بے حد دُکھی اور رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ آپ پر مایوسی کی ایک دبیز تہہ چھا جاتی ہے۔ رنج، غم، الم کی کوئی وجہ نہیں ہوتی پھر بھی آپ پر ایک سنجیدہ اور متفکر (pensive) کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہتے اور لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ آپ کا موڑ اچھا نہیں ہے مگر خود آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ موڑ بگڑنے کی وجہ کیا ہے۔

جس شخص کا تذکرہ میں کرنے جا رہا ہوں اُس پر بھی ایک ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ مگر اُس کے موڑ بگڑنے کی وجہ بلکہ خاطر خواہ وجہ موجود تھی۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک اونچے سرکاری عہدے پر فائز رہنے کے بعد وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ اُس کے پاس کوٹھی تھی، کار تھی،

بیوی بچے تھے مگر اُس کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو تنہا تنہا سا محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ زندگی صرف کوٹھی، کار اور روپے پیسے کا نام نہیں ہے۔ زندگی کے کچھ اور بھی تقاضے ہیں۔ زندگی تنہا بسر نہیں ہوتی۔ جوانی میں بیوی بچے، ماں باپ اور بڑھاپے میں بچے، پوتے، پوتیاں ساتھ ہوں تو بڑھاپے کی گھڑیاں شاندار بن جاتی ہیں۔ زندگی قرب چاہتی ہے، ساتھ چاہتی ہے، اُنس و اُلفت اور پیار مانگتی ہے۔ اُس پیار کا بھوکا ہر ایک، ہر عمر اور ہر طرزِ حیات کا فرد ہوتا ہے۔ زندگی کی دیگر ضروریات میں بھلے سے کسی بیشی یا تنگ طلبی واقع ہو بھی جائے مگر پیار کے بغیر زندگی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ یہ پیار فقط ایک دکھاوے کی چیز نہیں ہوتا بلکہ پیار ایک جذبہ ہے، پیار ایک احساس ہے، پیار ایک آبگینہ ہے جس میں پیار کرنے والے اپنے چہرے دیکھتے ہیں، ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ پیار وہ شے ہے جو مانگنے سے نہیں ملتی اور دینے سے نہیں بٹتی۔ یہ پوتر احساس دلوں کی دنیا سے پھوٹتا ہے، دلوں کی دنیا میں پلتا ہے اور دلوں کی دنیا میں تقسیم بھی ہوتا ہے۔ پیار ایک ایسی شراب ہے جس کا نشہ آدمی مرنے کے بعد بھی محسوس کرتا ہے۔ پیار روح کا ایک اور روپ ہے۔ پیار نہ آگ سے جھلس سکتا ہے، نہ پانی سے بھیگ سکتا ہے، نہ ہتھیار سے کٹ سکتا ہے، نہ سردی سے ٹھٹھر سکتا ہے اور نہ ہوا ہی اُسے اُڑا کر لے جا سکتی ہے۔

پیار کا کوئی رنگ نہیں، اُس کا کوئی روپ نہیں، گرچہ اُس کے لاتعداد رنگ بھی ہیں اور لاتعداد روپ بھی ہیں۔ کئی رنگ، کئی روپ، کئی شکلیں اور صورتیں ظاہر ہیں پر دکھائی نہیں دیتی۔ ایسی ساری چیزیں صرف محسوس کی جا سکتی ہیں پر چھو نہیں جا سکتی۔ پیار ایک ایسا نازک شیشہ ہے بس ذرا سی ٹھیس لگی ٹوٹ جاتا ہے۔ ٹوٹ جاتا ہے تو جڑتا نہیں، جُڑتا ہے تو بال پڑ جاتا ہے۔ رحیم کی وانی اس بارے میں کتنی خوبصورت ہے

رحیمن دھاگا پریم کا
توڑو نا چٹکائے
جوڑے سے پھر نا جڑے
جُڑے تو گانٹھ پڑ جائے

ایک ماں اکثر رات کو خود گیلے پر سوتی ہے اور بچے کے لیے سوکھا کپڑا بچھاتی ہے۔ایک باپ بچے کی بیماری کے دوران رات بھر جاگتا رہتا ہے۔کبھی وقت سے دوا پلانے لگتا ہے، کبھی گود میں اُٹھا کر روتے میں چپ کراتا ہے اور کبھی اُس کی نبض ٹٹولنے لگتا ہے۔ایسی مشقت یہ ماں باپ کیوں برداشت کر لیتے ہیں۔اگر یہ سب ایک فطری جذبے کے تحت ہوجاتا ہے تو وہی جذبہ مذکورہ شخص بھی اپنے لیے چاہتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ اُس کے لیے کوئی جاگے، کوئی مستعد رہے، کوئی خبر گیری کرنے والا آگے آئے۔چونکہ ایسا نہیں ہو رہا تھا اس لیے وہ اپنے آپ کو خزاں کے موسم میں ڈالی سے گرے ہوئے اُس پتے کی طرح محسوس کر رہا تھا جس کو ہوا کبھی اِدھر کبھی اُدھر اڑا کر لے جاتی ہے۔ایسے کتنے ماں باپ آج آپ کی نظروں کے سامنے آہیں بھرا کرتے ہوئے ملتے ہیں۔

جانوروں اور خاص طور پر پرندوں کے لیے قانونِ فطرت یہی ہے کہ جب بچے ذرا سے بال و پَر نکالتے ہیں اور دانہ چُگنے کے قابل ہوجاتے ہیں تو وہ والدین کو چھوڑ کر ایک نیا ساتھی لے کر اپنا گھونسلہ کھڑا کر لیتے ہیں۔مگر انسان تو کچھ اور ہی جذبے اور احساس کے ساتھ تخلیق کیے گئے تھے۔اُن میں پیار و محبت، اُنس و اُلفت اور خاص طور پر تو دردِ دل کے جذبے سے معمور کیا گیا تھا۔آج یہی بات سوچ کر وہ اپ سیٹ (upset) تھا کہ اُس کے بچے دوسرے ملکوں میں اپنی دُنیا بسائے ہوئے مست و مخمور ہیں اور وہ خزاں کا سوکھا پتا ہو کے رہ گیا ہے۔اُس کے

اپ سیٹ ہونے میں ایک اور واقعہ بھی تھا جو اُسی روز اُس کے ایک ساتھی نے اُسے سُنایا، جس کو سُن کر اُس کے جذبات کا باندھ مکمل طور سے ڈھے گیا اور وہ زار و قطار اپنی بوڑھی آنکھوں سے پھواریں برسانے لگا۔ واقعہ سُنانے والے نے کہا تھا:

خواجہ صاحب شہر میں ایک جگہ اکیلے رہتے تھے۔ بڑی سی کوٹھی کے واحد مکین اور ایک بڑے سے باغ و لان کے اکیلے مالی۔ اب بڑھاپا سر پر تھا۔ خواجہ صاحب اب اکثر بیمار رہتے تھے۔ ڈاکٹر بیٹا انگلستان میں اپنی فیملی کے ساتھ مزے لوٹ رہا تھا۔ بیٹے نے یہ مہربانی کی تھی کہ ہمسائیگی میں رہنے والے ایک محبّ و مخلص شخص کو خواجہ صاحب پر نظر گذر رکھنے کی ہدایت کی تھی جس کے لیے شاید اُسے کچھ خرچہ بھی ملتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ وہ صاحب خود بیمار پڑ گیا اور دو دنوں تک خواجہ صاحب کی طرف نہ جا سکا اور جب ٹھیک ہونے کے بعد تیسرے روز وہ خواجہ صاحب کے گھر میں داخل ہوا تو بدبو کے ایک بھبکے سے اُس کی طبیعت مکدر ہونے کے علاوہ اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ خواجہ صاحب تین روز قبل ہی اُس وقت بے بسی اور بے چارگی کی موت مرے تھے جب اُس کا ڈاکٹر بیٹا اپنی میم نما بیوی کے ساتھ پکاڈلی لندن کے ایک مشہور پب میں کیبرے ڈانس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

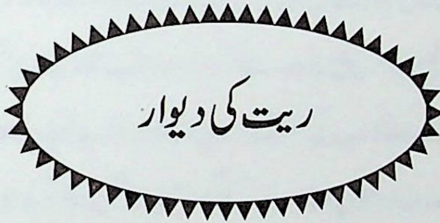
ایسے ایک نہیں کئی واقعات ظہور پذیر ہو چکے ہیں اور آگے بھی نہ جانے کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

(مخدومؔ محی الدین)

ریت کی دیوار

جسے طوفان کہا جاتا ہے وہ کچھ اور ہی شے ہے
ہوا کتنی ہی بڑھ جائے ہوا سے کچھ نہیں ہوتا
(آوارہ سلطان پوری)


ریت کی دیوار

موجودہ دور میں مغرب میں مسلمانوں کے بہت بڑے محسنوں میں کیرن ایمسٹرانگ شامل ہے۔ وہ اپنی کتاب مقدس جنگ (Sacred war) میں لکھتی ہیں:

''۲۵ نومبر ۱۰۹۵ء میں پوپ اُوبن نے پہلی صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا۔ پوپ نے اپنے اعلان میں کہا کہ سلجوقی ترکوں نے نہ صرف ایشیاء مائنر پر قبضہ کرلیا ہے بلکہ عیسائی بازنطائن سلطنت کے بیشتر حصے بھی فتح کر لیے ہیں۔ بقول پوپ ترک وحشی ہیں اور وہ خدا کے قہر کے مارے ہوئے ہیں۔ انہیں وہاں سے نکالنے کے لیے پورے یورپ کو متحد ہو کر اُن پر حملہ کر دینا چاہیے اور اُن سب کو قتل کر کے اُن سرزمینوں کو پاک کر دینا چاہیے اور خاص طور پر بیت المقدس کو اُن کافروں سے آزاد کروانا ایک مذہبی فریضہ ہے کیونکہ عیسائیوں کے لیے یہ ایک شرمناک صورت حال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی قبر مسلمانوں کے قبضے میں ہو۔

یوں اُن صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا جو تقریباً دو سو برس تک جاری رہیں۔

آگے لکھتی ہیں:

''مسلمان اپنے خطوں میں پُرامن زندگی بسر کر رہے تھے اور یہ یورپی عیسائی ہی تھے جنہوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ مسلمان جنگ نہیں چاہتے تھے لیکن اُن غیر ملکیوں نے چونکہ اُن کے شہروں کو اور بستیوں کو اُجاڑ کر آبادی کو مکمل طور پر ہلاک کرنا شروع کر دیا، اس لیے وہ اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اسلام ایک انتہائی پُرامن مذہب ہے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے اپنی پوری حیات میں کسی

قبیلے کے خلاف بے وجہ جارحیت نہیں کی بلکہ ہمیشہ صلح وصفائی کی تلقین
کی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قبیلے پر صرف اس لیے حملہ نہیں
کیا کہ اُسے زبردستی مسلمان بنایا جائے بلکہ حملہ بہ امر مجبوری یا خاص
حالات سے مجبور ہو کر ہی کیا جاتا تھا جیسے لوٹ مار یا سفیروں کا قتل
وغیرہ کے سلسلہ میں''۔

اب جہاں تک یہود کا سوال ہے وہ عیسائیوں سے بھی دو قدم آگے نکلے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تباہی، قتل اور کردار کشی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔اُن کی ریشہ دوانیاں بہت پہلے ہی سے کافی بڑھ گئیں ہیں۔اس سلسلے میں ہم بارہا قارئین کی توجہ اُن گھناونے جرائم کی طرف مبذول کرا چکے ہیں۔آج اُن کی ایک اور خباثت کو رقم کرتے ہیں:

''انور شیخ نامی ایک پنجابی مسلمان غیر منقسم ہندوستان میں محکمہ ریلوے
میں ملازمت کرتا تھا۔ پچاس کے دہے میں سبکدوشی کے بعد وہ
برطانیہ چلا گیا اور وہیں کی شہریت اختیار کر کے ایک آئرش یہودن سے
شادی کر لی۔ یہودن نے اپنے عشوؤں اور ناز و انداز کا سودا صرف
اپنے مشن کی عمل آوری کے لیے کیا۔ وہ انور شیخ کو اپنی اداؤں سے
لُبھاتی بھی رہی مگر ساتھ ساتھ اپنے مشن پر بھی سرگرمی کے ساتھ عمل
کرتی رہی اور نتیجے کے طور پر انور شیخ بکھر گیا، نور کی وادیوں سے نکل
کر ظلمات کی گھاٹیوں میں پہنچ ک قعر مذلت میں گر گیا۔ اگر وہ ترک
دین کرتا تو فکر کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ بحر ذخار سے پانی کا ایک قطرہ
نکل جائے تو بحر کی پنہائیوں کا کیا بگڑتا ہے۔مگر ریلوے ملازمت کے
دوران مذکورہ شخص کے دل و دماغ اور قلب و ذہن پر اُس وقت کے

ریلوے انجنوں کی کثافت سے بھرے دھویں کی جو دبیز تہیں جم گئی تھیں وہ کلبلا نے لگیں اور یہودیوں کے مئے پُرخمار، زرِ کثیر اور یہودن کی مرمریں بانہوں کا گھیرا تنگ ہوتا گیا اور انور شیخ نے اپنی ڈکار لی ہوئی یہودی عفونت اگلنا شروع کر دی۔

انور شیخ قشقہ کھینچ کر دیر میں بیٹھتا یا ہیکل کی پاسبانی اختیار کر لیتا تب بھی فکر کی کوئی بات نہ تھی مگر اُس روسیاہ نے دین اسلام کے خلاف زہر اُگلنا شروع کر دیا۔ جو من میں آیا بک دیا۔ یہودیوں نے اُس کا ذہن و دل اور قلم و قرطاس رہن رکھ دیا اور وہ سلمان رُشدی کی طرح اُن کا ہی ایک ماؤتھ پیس ایک سپوکس مین بن گیا۔ انور شیخ کی ان اسلام مخالف تحریروں کو کوئی مسلم دشمن جماعت (یقینی طور پر بہ وساطت یہودی نیٹ ورک) کثیر تعداد میں خرید کر بھارت کے کسی نا معلوم مقام سے مختلف تبصرہ نگازوں، تجزیہ کاروں، اخبار کے ایڈیٹروں اور دانشوروں کے نام روانہ کرتی تھی تا کہ اُن پر حسبِ منشاء تبصرہ شایع کر کے اسلامی امیج کو زیادہ سے زیادہ زک پہنچائی جائے جو یہودی ایجنڈے کی پہلی شق ہے۔

انور شیخ کی ایک شایع شدہ کتاب اسلام، جنس اور تشدد (Islam,sex and voilince) کا اسلام دشمن حلقوں میں آج سے چند برس قبل کافی چرچا رہا۔ اس سلسلے میں جب سردار خشونت سنگھ جو یک تجربہ کار، بزرگ، بے لاگ ادیب اور صحافی ہیں کو ایک کاپی تبصرے کے لیے ملی تو انہیں بے حد ذہنی تکلیف ہوئی اور انہوں نے اُن دنوں اپنے ہفتہ وار تبصرے میں (ہندوستان ٹائمز، مورخہ ۲۵ مارچ ۲۰۰۰ء) لکھا کہ یہ

ایک گندی کتاب اسلام کی کردار کشی کے لیے چلائی جانے والی مہم کا ایک حصہ ہے۔ یہ کتاب اسلام کے خلاف نہایت ہی غلیظ ذہن رکھنے والوں کی پیشکش ہے۔اس مکروہ کتاب کا اندازِ تحریر شرمناک ہے۔ کتاب پر اگر چہ برطانیہ کا پتہ چھپا ہے مگر مارچ کے تیسرے ہفتے میں یہ کتاب مجھے جس پارسل میں ملی اُس پر ہندوستانی ڈاک ٹکٹ لگے تھے۔''

اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے بعد سردار جی نے کتاب کے مصنف سے ایک سوال کا جواب دینے کو کہا ہے: کہ ''کیا وجہ ہے آج عیسائیت، ہندوازم اور سکھ ازم کے مقابلے میں اسلام میں زیادہ لوگ داخل ہو رہے ہیں۔قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اُن کے لیے زیادہ پُرکشش ثابت ہو رہی ہے''۔

اولاً سردار جی کا خیال تھا کہ کتاب اسلام کے خلاف محض ایک شرارت ہے اور یہ فرضی نام سے شایع کی گئی تھی کیونکہ اس کے دو حصوں کا اندازِ تحریر جداگانہ ہے اور یہ دو اشخاص کی لکھی معلوم پڑتی ہے مگر بعد ازاں بریلی کے سید آفتاب علی صاحب نے انور شیخ کے ساتھ مراسلت کر کے یہ ثابت کیا کہ مئے یہودیت سے سرشار یہ شخص واقعتاً موجود تھا اور اپنے یہود آقاؤں کی معرفت تجلیات طاغوت بکھیر رہا تھا۔

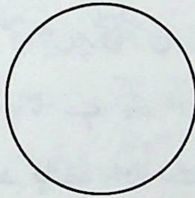
ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ایسی چیزیں بتدائے اسلام سے ہی خاص طور پر یہودیوں کے ہاتھوں سے وجود میں آتی رہی ہیں۔ایسے زہریلے ناگ سر اُٹھاتے رہیں گے اور زہر پھیلاتے رہیں گے۔گر چہ حق یہ بھی ہے کہ نورِ حق کو باطل کی ہوائیں کوئی نقصان نہیں کرتیں۔ یہودیوں کے علاوہ عیسائیوں نے بھی اسلام دشمنی میں زائد از چار ہزار کتابیں لکھی ہیں۔ ہندوؤں کی کٹر پنتھی متعصب جماعت

آر ایس ایس نے بھی اپنی طرف سے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی بقول ہندوستان ٹائمز کے مُکل منگلک ، کوئی بھی منظّم تنظیم مسلمانوں سے اس طرح نفرت نہیں کرتی جیسی کہ آر ایس ایس۔ کوئی بھی قوت اتنے مؤثر طریقے سے مسلمانوں کو شیطان کی شکل میں نا قابل بیان ظلموں کا حقدار بنا کر پیش نہیں کرسکتی تھی جیسے کہ آر ایس ایس کرتی ہے۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سب کے باوجود اسلام کا کیا بگڑا۔ اسلام پوری شد و مد کے ساتھ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ پھیل رہا ہے۔ اسلام دنیا کے غیر مسلموں میں مقبول ہو رہا ہے۔ لوگ دھڑا دھڑ حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔ دشمن اپنی ریشہ دوانیاں کرتے رہیں۔ اُن کی وہ ساری مذموم کوششیں ریت کی دیوار ہی تو ثابت ہو رہی ہیں جو کھڑی تو ہو سکتی ہیں پر ٹکتی نہیں۔ بقول آوارہ سلطان پوری

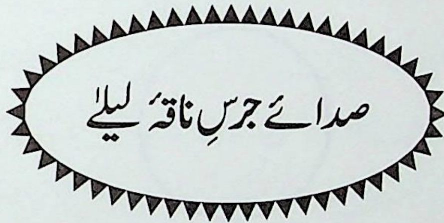
جسے طوفان کہا جاتا ہے کچھ اور ہی شے ہے
ہوا کتنی بھی بڑھ جائے ہوا سے کچھ نہیں ہوتا





صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ

غزالو تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوا نہ گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری
(رام نرائن موزوںؔ)


صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ

عشقیہ داستانیں دیو مالائی لوک کہانیوں ہوں یا حقیقت پر مبنی سچی کہانیاں ہوں اُن کا جس طرح زبان و ادب میں ایک مقام ہوتا ہے، اُسی طرح انسانی تہذیب وتمدن اور سماج میں بھی اُن کی ایک انفرادی پہچان ہوتی ہے۔ سچ تو سچ جھوٹے اور خیالی قصوں کا بھی انسانی سوچ وذہن پر ایک خاص اثر ہوتا ہے اور ایک قاری مطالعے کے دوران جب کسی داستان میں کھو جاتا ہے تو نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو یا تو داستان کا ایک کردار تصور کر لیتا ہے یا اپنے آپ کو دیگر کرداروں کے قریب پاتا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو داستان کے مظلوم ترین کردار میں دیکھتا ہے تو کبھی انصاف پسند اور ہمدرد کردار میں اپنے آپ کو پاتا ہے جو کہانی کے خاص کردار ہیرو اور ہیروئن یعنی عاشق و معشوق سے ہمدردی کرتا ہے۔ اُن کی مدد کرتا ہے اور اُن کا معاون ومددگار بنتا ہے۔

جس طرح لالہ رخ اور رومیو جیولٹ کا چرچا یورپ میں ہے۔ اُسی طرح بلکہ اُس سے بہت بڑھ کر داستان لیلیٰ مجنون کی ہر دلعزیزی ایشیاء میں خاص طور پر سنٹرل ایشیاء، مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مغربی ایشیاء میں ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ لیلیٰ مجنون کی داستان سے متاثر ہو کر کئی اور جھوٹی داستانیں جیسے وامق عذرا، یوسف زلیخا اور شیرین فرہاد لکھی گئیں تو غلط نہ ہوگا۔ اور معذرت کے ساتھ اگر یہ بھی کہا جائے کہ شیکسپیئر نے رومیو جیولٹ ڈرامہ بھی اسی داستان سے متاثر ہو کر لکھا ہوگا تو بے جا نہ ہوگا۔ حسن ذوالفقاری کی تحقیق کے مطابق ایرانی عشقیہ داستان میں لیلیٰ مجنون کی داستان سے متاثر ہو کر تقریباً نواسی نقلی داستانیں تحریر کی گئیں ہیں جن میں خسرو شیرین یا شیرین فرہاد کے اکاون، یوسف زلیخا کے بائیس اور وافق عذرا کے سولہ ورشن (Version) تصنیف و

تالیف ہوئے ہیں اور واحد دستگیری کے فرمانے کے مطابق اگر کوئی تمام نئے اور پرانے کتب خانوں (Libraries) کو کھنگالنے کی سعی کرے گا تو بلاشبہ اُسے ہزار سے زیادہ داستانِ لیلیٰ ومجنوں کے ورشن ملیں گے۔

ایران اور سنٹرل ایشیاء میں اس داستان کو نظامی گنجوی نے دوام بخشا اور اُنہی کے کام کو پھر دوسروں نے مستعار لے کر اپنے ذوق و استعداد کے مطابق اس داستان کو مختلف انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر رڈولف گالپک (داستان لیلیٰ مجنون اومیگا پبلی کیشن ۱۹۶۶ء) کے مطابق:

> بعد میں آنے والے کئی ایرانی، ترکی اور ہندوستانی شعراء نے گرچہ نظامی کے کام کی نقل اُتارتی چاہی مگر وہ نظامی سے آگے نہ بڑھ سکے بلکہ حقیقت یہی ہے کہ وہ نظامی تک بھی نہ پہنچ پائے۔

اسی طرح ایرانی دانشور حکمت نے داستان لیلیٰ ومجنوں کے فارسی زبان میں چالیس اور ترکی زبان میں تیرہ مسودوں کی نشاندہی کی ہے۔

فارسی کے مشہور شاعر نظامی گنجوی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کی پانچ طویل نظموں (خمسہ) میں سے تیسرے نمبر پر داستان لیلیٰ مجنون ہے۔ اُن کی نظم سے متاثر ہو کر بعد میں کئی شعراء اور ادباء نے اس داستان کو مختلف انداز سے پیش کیا جس میں امیر خسرو نے بھی سن ۱۲۹۹ء میں طبع آزمائی کر کے اس داستان کو ایک دوسری طرح دے دی۔ اس کہانی کو لے کر مختلف ممالک میں کئی اوپیرا اور ڈرامے سٹیج ہوئے۔ ناول اور نظمیں لکھی گئیں اور کئی میوزک البم وجود میں آئے۔

ہندوستان میں بھی اس داستان کا کافی اثر اور مقبولیت رہی جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان میں جب ۱۹۱۷ء میں خاموشی فلمیں بننے لگی تو دو تین فلموں کے بعد ہی داستان لیلیٰ مجنون سن ۱۹۲۰ء میں فلمائی گئی اور اُس کے بعد سن

۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۷ء میں خاموش اور سن ۱۹۳۱ء میں دو اور بولتی فلمیں بنیں۔ اُس کے بعد تو یہ سلسلہ چل نکلا اور تیلگو اور ملیالم زبان میں ایک ایک فلمیں بننے کے علاوہ اُردو زبان میں نو فلمیں بنیں۔ نذیر، شمی کپور اور رشی کپور کی فلمیں کافی مقبول رہیں۔ اس کے علاوہ لگ بھگ تین سو فلموں میں اس داستان پر مبنی ایک سِکٹ (Skit) یا گانا رکھا گیا جس کو تماشہ بینوں نے پسند کیا۔

حرمین شریفین کی زیارت کے بعد میں جب بھی سعودی عربیہ کے کسی اور علاقے کی طرف نکل جاتا تھا تو ہر بار میرا ذہن لیلیٰ مجنون کی طرف گھوم جاتا تھا۔ میرے دل میں ہمیشہ تڑپ رہتی تھی کہ میں اُس گاؤں کو دیکھوں جو لیلیٰ کے نام سے منسوب ہے اور اُس صحرا کو دیکھوں جس کے ذرے ذرے پر عشق کے مارے دو متوالوں نے ایک ایسی داستان رقم کی ہے جو رہتی دنیا تک پیار کرنے والوں کے دلوں کو دھڑکاتی رہے گی۔ ریت کے بنتے بگڑتے اُن ٹیلوں کو دیکھوں جن کی اوٹ میں دو دیوانے ملا کرتے تھے ____ چھپ چھپ کر، قبیلے کی نظروں سے دور اور ہر آہٹ پر ڈر ڈر کر اپنے پیار کو پروان چڑھاتے رہے۔ پیار کی دنیا بساتے رہے، پیار کی دنیا میں کھو جاتے رہے۔ ایک موہوم امید ____ اور مٹ میلے ادھورے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے نہ جانے کس دنیا میں پہنچ جاتے تھے۔ یہ پیار بھی کتنی بڑی دیوانگی ہے جو فرزانگی کے اُجلے چہرے کو سیاہ پردوں سے ڈھانپ دیتی ہے۔ اُس صحرا نے اُن عاشقوں کی کتنی آہوں کو سُنا ہوگا، کتنی کراہوں کو اپنے سینے میں دفن کیا ہوگا۔ کتنے بہے آنسوؤں کو پیا ہوگا، کتنی آہ وزاریوں کو سہا ہوگا۔ صحرا کی بنجر فضائیں بھی اُن کا دُکھ، اُن کا کرب، اُن کی بے چینی اور اُن کی تڑپ دیکھ کر کئی بار تڑپی ہوں گی۔

سعودی عربیہ کی راجدھانی الریاض کے جنوب میں وادیٔ الدواسیر کی جانب

ہوتے ہوئے جبل طویق جو نجد کے میدانی علاقوں سے شروع ہو کر رب الخالی تک تقریباً نو سو کلو میٹر کے ایک لمبے سلسلے میں الریاض سے تقریباً تین سو کلو میٹر کے فاصلے پر لیلیٰ الافلاج کا قصبہ پڑتا ہے۔ لیلیٰ کے اُس شہر میں لیلیٰ کے اُس گاؤں میں یا شعراء کی زبان میں کوچہ لیلیٰ میں ہر طرف بس لیلیٰ ہی لیلیٰ آج بھی چھائی ہوئی ہے۔ ہر طرف لیلیٰ، ذرے ذرے میں لیلیٰ، لیلیٰ بیترول (پیٹرول)، لیلیٰ حلاقہ (ہیر کٹنگ سیلون) لیلیٰ محل بقال (پرواجنل سٹور) لیلیٰ مکتب (بک شاپ) لیلیٰ ملابس (لانڈری) لیلیٰ آئس کریم وغیرہ غرضیکہ لیلیٰ آج بھی لیلیٰ الافلاج گاؤں میں لوگوں کے بیچ موجود ہے۔ صدیاں بیت گئیں مگر گذرتا وقت یادوں میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔

داستانِ لیلیٰ و مجنون سے دنیا واقف ہے۔ مجھے وہ داستان دہرانی نہیں ہے بلکہ اُس حقیقی داستانِ عشق سے متعلق کچھ باتیں عرض کرنی ہیں جو بیشتر لوگ یقیناً نہیں جانتے ہوں گے۔ اولاً یہی کہ لیلیٰ و مجنون کا وجود رہا ہے۔ یہ کوئی فرضی یا بناوٹی داستان نہیں ہے۔ مجنون (دیوانہ) کا اصلی نام قیس بن الملاوہ بن مظاہم اور لیلیٰ کا نام لیلیٰ بنت مہدی بن سعد تھا۔ دونوں عاشق و معشوق ایک ہی قبیلے بنو عامر سے تعلق رکھتے تھے جس کے لوگ مرکزی سعودی عربیہ میں رہتے تھے بلکہ آج بھی رہتے ہیں۔ یہ داستان ساتویں صدی عیسوی میں لگ بھگ ۶۵۰ء اور ۶۶۰ء کے آس پاس خلیفہ سومؓ کے دورِ خلافت میں وقوع پذیر ہو چکی ہے۔ لیلیٰ الافلاج ایک قلیل آبادی والا عرب کا ایک چھوٹا سا اور ایک بہت قدیم قصبہ ہے۔ اس قصبے سے باہر کچھ دوری پر دریائے لیلیٰ کے نام سے ایک ٹھنڈے میٹھے پانی کا دریا بھی بہتا تھا۔ روایت ہے کہ لیلیٰ اُس دریا پر نہانے کے لیے آیا کرتی تھی۔ بنجارے اور بدوین دریا کے کنارے ڈیرہ ڈالا کرتے تھے اور اپنے آپ کے علاوہ مویشیوں کو

سیراب کر کے سفر کے لیے بھی مشکیزے بھر بھر کر پانی لے جاتے تھے جو بے آب و گیاہ صحراؤں میں کافی دنوں تک اُن کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ مذکورہ دریا صدیوں سے صحراؤں کی بیچوں بیچ بہتا رہا مگر حیرانگی کی بات ہے کہ سن ۲۰۰۰ء میں یہ اچانک سوکھ گیا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ فارمنگ کے لیے کثرت سے پانی کے استعمال نے اس دریا کا گلا گھونٹ دیا۔ آج دریا کا خالی پاٹ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے والے رنجیدہ اور تہی دست پتن ہیں۔ دریا جسم کے مانند گوشت کے بغیر ہڈیوں کا ایک خالی پنجر لگتا ہے۔

روایت یہی ہے کہ لیلیٰ کے باپ نے قیس کے ساتھ رشتے کی منظوری نہیں دی کیونکہ قیس لیلیٰ کی محبت میں پاگلوں جیسی حرکات کرتا تھا اور لیلیٰ کے باپ نے اُس کی دیوانگی کے سبب رشتہ منظور نہیں کیا جس میں کچھ پرانی خاندانی چپقلش بھی شامل تھی۔ اس وجہ سے قیس مکمل طور سے دیوانہ ہو گیا اور مجنون کہلایا۔ دونوں میں بچپن سے ہی ایک دوسرے کے لیے چاہت کا جذبہ پل رہا تھا جو جوانی میں آ کر وحشیانہ پن اختیار کر گیا۔ مجنون لیلیٰ کے فراق میں شعر کہتا تھا جس کا آس پاس کے قبیلوں میں کافی چرچا تھا۔ اُس کے موجود کلام میں سے ایک عربی شعر کا لفظی ترجمہ کچھ اس طرح سے ہے:

گھروں کی دیواروں کو گلے لگاتا ہوں
کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر بوسہ دیتا ہوں
گھر دیوار کی محبت سے کیا واسطہ مجھے
میں لیلیٰ کی پرچھائیوں کو چومتا ہوں

کی بے عزتی برداشت نہ کرسکی اور دوسری جگہ شادی ہو جانے کے سبب دل برداشتہ ہوکر گھُٹ گھُٹ کے مرگئی۔ اُسی دیوانگی کی حالت میں مجنون کو سن ۶۸۸ء میں ایک دن لیلیٰ کی قبر کے پاس مردہ پایا گیا اور یوں یہ ٹریجڈی سدا کے لیے ایک عالمی ٹریجڈی بن گئی۔

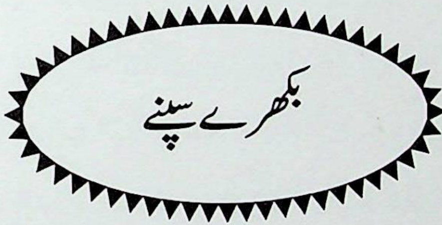
غزالوں تم تو واقف ہو کہو مجنون کے مرنے کی
دوا نہ گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

(رام نرائن موزوںؔ)



بکھرے سپنے

شعلوں کی حکومت ہے چمن زیر و زبر ہے
موسم ہے بہاروں کا مگر رقصِ شرر ہے
(عزیز بگھروی)


بکھرے سپنے

کئی سال قبل ایک مذہبی تنظیم سے وابستہ ایک بزرگ کارکن جب بھی کسی مجلس میں، تبلیغی تدریسی محفل میں، میٹنگ میں یا دفتر میں تشریف لاتے تو حاضرین پر ''السلام علیکم یا اہل القبور'' کہتے۔ حاضرین ایک بھرپور قہقہہ لگاتے اور دیر تک سب کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ موصوف مرنجان مرنج قسم کے شخص ہیں اس لیے ہنسی مذاق کرنا یا سنجیدہ لوگوں کا موڑ بنانے کی خاطر دل لگی کرتے ہیں۔ لیکن ایک بار ایک شبینہ محفل میں وہ میرے قریب ہی بیٹھے تھے اس لیے رات کو چائے کے وقفے کے دوران باتوں ہی باتوں میں انہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ بتایا کہ وہ دل لگی میں نہیں بلکہ جان بوجھ کر اور خاطر جمعی کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ وجہ پوچھنے پر جو کچھ انہوں نے بتایا اُس کا نچوڑ کچھ اس طرح سے ہے:

''ہر طرف لوٹ کھسوٹ ہے، ظلم و جبر ہے اور رشوت کا بازار گرم ہے۔ غریب کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ نوکریاں رشوت دے کر ملتی تھیں مگر اب رشوت دے کر بھی نہیں ملتیں۔ ہر ایک کو اپنی فکر ہے، دوسرا مرے تو اُس کی بلا سے۔ پیار، محبت، بھائی چارہ اور خلوص بندے سے رخصت ہو چکا ہے۔ حکومت جو چاہتی ہے کرتی ہے، کرواتی ہے مگر کوئی اُف تک نہیں کرتا۔ ظلم و ستم کے آگے کوئی زبان بھی نہیں کھولتا۔ استحصال کے آگے کوئی سینہ سپر نہیں ہوتا۔ تو ایسے لوگوں کو زندہ کس طرح مانا جائے گا۔ اُن میں زندگی کی کوئی علامت یا حرارت ہی نہیں ہے۔ سارا شہر اور گاؤں بڑی آسانی کے ساتھ تکالیف کو سہہ جاتا ہے تو ایسے میں زندوں کو سلام کروں یا مُردوں کو''۔

مذکورہ بزرگ کتنی کھری اور دوٹوک بات کہتے تھے۔ بظاہر ہنسی مذاق سمجھنے والی بات میں کتنی صداقت پنہاں ہوتی تھی۔ سوئے ہوئے بے عمل لوگوں کے لیے وہ ایک چیتاونی ہوتی تھی مگر سمجھنے والے سمجھ کر بھی خاموش ہی رہا کرتے تھے کیونکہ وہ مُنہ کھولنے کی سزا جانتے تھے اور وہ ایسی سزائیں صدیوں سے بھگتتے آرہے تھے۔

تب سے اب تک کافی وقت گذر گیا۔ جہلم اپنے وجود کے اوپر سے کافی پانی بہا چکا ہے۔ کافی خون کی دھارائیں اپنی دھاراؤں میں مدغم کر چکا ہے۔ کافی بے گور و کفن لاشوں کو پانی کے ہنڈولوں میں سوار کر کے بہاؤ کی جانب لے جا چکا ہے۔ کافی ساری لاشوں کو اپنی گود میں پلنے والی مچھلیوں کو بھی کھلا چکا ہے۔ اُس وقت ایک یُگ تھا آج دوسرا زمانہ ہے۔ اُس وقت آبادی میں سوا لاکھ لوگوں کی برتری تھی۔ آج اُن میں وہ جن کو مدفن نصیب ہوا مختلف جگہوں پر مزارانِ شہداء میں محوِ خواب ہیں اور باقی بے گور و کفن کچھ درندوں کی خوراک بنے، کچھ مچھلیوں کے نوالے بنے اور کچھ بے نام ونشان قبرستانوں کے مکین بنے۔ جبر اور استحصال بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ نوجوان روزی روٹی کے لیے پریشان ہیں۔ ابھی کل ہی مسجد میں امام صاحب کو ایک پرچی ملی جس میں لکھا تھا کہ ”میں نے مقابلتی امتحان اول درجے میں پاس کیا ہے مگر پھر بھی ملازمت دینے کے لیے مجھ سے دس لاکھ روپیہ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ میرے پاس دس ہزار پیسے نہیں میں کیا کروں۔ دریں حالات میں خودکشی کا مرتکب ہونے جا رہا ہوں کیونکہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں“۔ ظاہر ہے کہ یہ مراسلہ کسی نوجوان کا ہی تھا۔ شہر کی حالت واقعتاً بہت ہی زیادہ خراب ہے۔ اسامی یا پوسٹ یہاں کے لیے وجود میں آجاتا ہے مگر اُس پر صوبہ جموں سے کسی شیڈول کاسٹ نوجوان کی تقرری ہوتی ہے۔ شمار میں وہ پوسٹ کشمیر کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے مگر حقیقت میں اُس پر جموں کا باشندہ کام

کرتا ہوتا ہے۔

اس زیادتی کے لیے کوئی آگے نہیں آسکتا۔کوئی آ بھی جائے تو اُس کا جسم اُن مہلک ہتھیاروں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے جو ساری دنیا کی حکومتوں نے ممنوع و متروک قرار دیے ہیں مگر یہاں کے بے قیمت انسان کے لیے ہر آتشیں اسلحہ جائز قرار دیا گیا ہے۔لوگ عامل کے معمول جیسے ہوگئے ہیں۔لب ہلا نہیں سکتے، احتجاج کر نہیں سکتے۔ حقوق کا مطالبہ اُن کے لیے ممنوع ہے۔ حقوق بشری کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ بچوں کی نسل کشی ہو رہی ہے۔ مریضوں کو نقلی دوائیاں مل رہی ہیں۔ وادی سے باہر جانے والے کاروباری لوگوں اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے والے نوجوانوں کو جھوٹے الزامات لگا کر یا تو جیلوں میں سڑایا جاتا ہے یا قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں لاشوں کی کیا کمی تھی کہ اب لاشیں کبھی کرناٹک سے، کبھی دہلی سے، کبھی ممبئی سے آنے لگیں ہیں۔ غیر ریاستی باشندے ریاست میں بسائے جانے لگے ہیں۔وادی کی معصومیت اور پاکیزگی اور مجموعی طور پر ریاست کی نفرادیت ختم ہو چکی ہے۔ خوبصورت مقاموں اور اعلیٰ پایے کی زمینوں کی بندر بانٹ ہو چکی ہے۔فوج ک قبضے میں زائد از اڑسٹھ لاکھ کنال زمین ہے۔سی آر پی کو محکمہ بجلی کا کروڑوں روپیہ واجب الادا ہے اور عام جنتا سے صرف چار دن بل ادا نہ کرنے پر اضافی رقم چارج کی جاتی ہے۔

انیسویں صدی کی طرح آج بھی کشمیری مسلمان بے قیمت ہو کے رہ گیا ہے۔ اُس زمانے میں اُس کی قیمت اگر اڑھائی روپے تھی آج ایک جان ضائع ہو جائے تو اُس کے لیے احتجاج کرنے پر مزید چھ جانیں جمہوریت اور انسان برابری کے قدموں میں نثار کرنا پڑتی ہیں۔ کتنا بے وقعت اور گیا گذار ہو کے رہ گیا یہ انسان۔ آج بھی عزت و عفت کے بخیے اُدھڑ رہے ہیں۔آج بھی حیا کی چنری تار تار

ہے۔آج بھی شرم کی اوڑھنی کی جھولیں لٹک رہی ہیں۔آج بھی وہ کمزور صنف نازک اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے بار بار اپنے نام نہاد محافظ سے، اپنے باپ سے، اپنے بھائی سے وہی صدیوں پرانا سوال دُہرا رہی ہے۔تمہیں خلقِ خدا سے اطاعت شعاری کروانا اور ہوس ملک گیری دامن گیر تھی۔تمہیں پیسہ اور سیاسی پوزیشن کی ضرورت تھی۔کوٹھیاں اور کمپلیکس درکار تھے۔مگر_____ مگر میرا قصور کیا ہے۔آخر میرا جرم کیا ہے۔میں تعصب کے تیر کا شکار کیوں ہو رہی ہوں۔ میں فرقہ واریت کی سلیب پر کیوں لٹک رہی ہوں۔مجھے ہی خاص سازشوں کے تحت بار بار اور ہر دوسرے چوتھے برس پیر گلزار جیسے لوگوں کے ہتھے کیوں چڑھنا پڑتا ہے۔

آئے دن بچوں کو پکڑ کر اور پھر ایک ڈرامائی منظر اختراع کر کے انہیں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کی بجائے موت کی نیند سُلا دیا جاتا ہے۔کبھی ایک گاؤں مقتل بنتا ہے۔کبھی شہر اپنے بچوں کی خون کی ہولی کا منظر دیکھتا ہے۔ڈرامے کا سٹیج کبھی گاؤں تو کبھی شہر بنتا ہے۔ ہڑتالیں موت کے کالے سایوں کے لیے متبدل فروزاں شمعیں نہیں بن سکتیں۔مختلف تنظیمیں کچھ شور شرابہ کر کے چپ ہو جاتی ہیں۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک کنکری گرتی ہے۔شڑاپ کی آواز آتی ہے، دائرے بنتے ہیں، گول گول دائرے، دائرے پھیلتے ہیں، دور دور تک، کچھ دیر کے بعد دائرے سمٹنے لگتے ہیں، پانی برابر ہو جاتا ہے۔پھر وہی خاموشی، وہ سکوت_____ ہُو کا عالم، کالی رات کے سایے، اُجڑے گھر کی آہیں، بیوہ ماں کی کراہیں_____ کربناک سسکیاں _____ آنسوؤں کی لڑیاں _____ اور _____ اور بکھرے سپنے_____

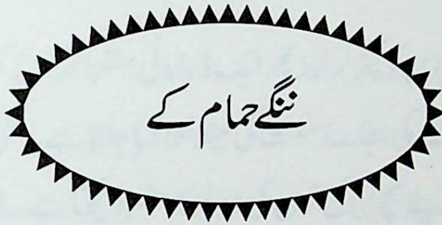
(جون ۲۰۱۳ء)

☆☆☆

ننگے حمام کے

اُنگلی اٹھاؤں تو کس پر الزام دوں تو کس کو
اِک جیسا لگ رہا ہے ہر چہرہ آدمی کا

(سید قاسم جالنوی)


ننگے حمام کے

مشہور فلمی اداکار سنجے دت جس کو اے کے فورٹی سیون رائفل رکھنے کی پاداش میں ابھی حال ہی میں دس سال کے بعد مقدمے کے ایک فیصلے میں جیل کی سزا ہوگئی، کی ماں کا نام نرگس تھا۔ وہ بھی اپنے وقت کی ایک مشہور فلمی اداکارہ تھی جس کی فلمیں برسات، آرزو، میلہ، آوارہ، آہ، شری چار سو بیس، مدر انڈیا وغیرہ سُپر ہٹ فلمیں ثابت ہوئیں۔ نرگس کا اصلی نام کنیز فاطمہ تھا اور اُس کی ماں جدن بائی ممبئی کی ایک مشہور طوائف تھی۔ اُس کا مُجرا سُننے کے لیے کئی لوگ آتے تھے جن میں اُس زمانے کی کچھ مشہور شخصیتیں بھی ہوا کرتی تھی۔ چونکہ جدن بائی کو معلوم تھا کہ نرگس ایک مسلمان باپ کی اولاد ہے حالانکہ اُس نے اُس کے باپ کا نام کبھی ظاہر نہیں کیا، اس لیے وہ چاہتی تھی کہ نرگس ساز و آہنگ اور گلیمر کی دُنیا سے دور کسی عزت دار اور شریف گھر کی دلہن بنے۔ اِس سلسلے میں جدن بائی کی محفل میں آنے والوں میں سے ایک سید خاندان کے نوجوان بھی ہوا کرتے تھے۔ جدن بائی کی نظر انتخاب اُسی شریف زاد پر تھی۔ میں اگر اُس کا نام ظاہر کروں تو لوگ مجھ پر حکم کُفر کا فتویٰ لائیں گے مگر حقیقت بہر حال حقیقت ہی ہوتی ہے۔ چونکہ موصوف ایک بہت بڑے اور جلیل القدر خانوادے کے چشم و چراغ تھے اس لیے وہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ نرگس فلمی دُنیا کی زینت بن گئی اور سید صاحب نے ممبئی کو خیر باد کہہ کر اپنا آبائی پیشہ درس و تدریس، وعظ و تبلیغ اور اشاعت دین کا کام سنبھال لیا۔

تمہید ایک جملہ مقرضہ کی صورت میں لایا گیا جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جدن بائی ایک طوائف تھی۔ پیشے کے لحاظ سے وہ کیا تھی مگر نرگس کے لیے وہ ایک ماں تھی۔ اِسی لیے چاہتی تھی کہ اُس کی بچی کسی عزت دار گھر کی فرد بن جائے۔ تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک عورت بداخلاق ہو، بدشکل و بدوضع ہو، بدزبان،

بدمزاج اور بدکردار ہو، وہ اُس کی ذاتی حیثیت ہوگی مگر اپنے بچے کے لیے وہ منجملہ صرف اور صرف ایک ماں ہوگی۔

جہاں تک ماں کی عظمت وتقدس کا تعلق ہے اُس کے لیے رب العالمین نے کوئی پیشگی شرط نہیں رکھی ہے۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ رب کائنات نے یہ نہیں فرمایا کہ ایک ماں فلاں فلاں صفات کی حامل ہونی چاہیے تا کہ اُس کو جنت پانے کا وسیلہ قرار دیا جا سکے۔ گویا ماں کے قدموں کے نیچے اگر جنت رکھی گئی ہے اُس کے لیے کوئی شرط نہیں رکھی گئی ہے۔ ایک عورت ذاتی حیثیت میں کیا ہے، کیا کرتی ہے، کیسے کرتی ہے، خوش خلق ہے یا بداخلاق، مومنہ ہے یا دہریہ، چراغِ خانہ ہے یا شمع محفل، باکردار ہے یا گلٹا، اُس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنے بچے کے لیے وہ فقط ایک ماں ہوتی ہے اور بچہ ماں کی ذاتی زندگی سے قطع نظر ماں کی خدمت و تابعداری، ادب واحترام اور ہر حکم بجالانے کا پابند ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ دنیوی زندگی کے ساتھ ساتھ اُس کی اُخروی زندگی کے لیے بھی اُس کے لیے شادیانے بجیں۔

یہ بات بہر حال بتانے یا سمجھانے کی نہیں ہے کہ ماں ایثار وقربانی کا ایک مجسمہ ہوتی ہے۔ ماں اپنے بچے کے حمل کے دوران، بچہ جننے کے وقت اور اُسے دودھ پلا کر، پال پوس کر بڑا کرنے کے دوران کیا کیا کرتی ہے اور کتنی تکلیفیں اٹھاتی ہے، کیا کیا پاپڑ جھیلتی ہے اور اور خود کن مراحل اور تکالیف سے گذرتی ہے یہ بس ماں ہی جانتی ہے۔ ماں ہی سمجھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک صحابیؓ اپنی اپاہج ماں کو کندھے پر اُٹھا کر خانہ کعبہ کا طواف کرارہا تھا۔ دوسرے صحابہؓ نے اُس کا یہ عمل دیکھ کر اُس کی بڑی تعریف وتوصیف کی اور ہوتے ہوتے یہ بات آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ انہوں نے سُنانے والوں کی تنبیہ کرتے ہوئے

فرمایا کہ مذکورہ صحابیؓ نے کوئی اتنا بڑا کام نہیں کیا جو آپ لوگ اُس کے لیے رطب اللسان ہیں۔ یاد رکھو، ماں کے درزہ کی ایک کراہ کا نعم البدل بھی اُس شخص سے ادا نہیں ہوا چہ جائیکہ اُس نے ماں کی کوئی بڑی خدمت کی۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑھاپے میں والدین بچوں کے لیے بوجھ بن جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح وہ اپنے بچوں کو پروان چڑھانے میں، پالن پوشن اور تربیت دینے میں دن رات ایک کرتے ہیں، آرام حرام کرتے ہیں اور اپنے قیمتی وقت کا تیاگ دے کر بچے کا مستقبل اُن کی زندگی کا مطمع حیات بن جاتا ہے، اُسی انداز سے یا غالباً اُس سے بڑھ چڑھ کر اُن کے والدین نے بھی اُس کے لیے کیا ہوگا۔ چلو مان لیتے ہیں بوڑھے کانٹے ہیں۔ ٹھیک ہے کانٹے ہی سہی مگر وہ بھی تو آپ ہی کے گلستانوں سے ملے ہیں۔ کبھی یہ نافہم بچے جو اپنے والدین کو نظر انداز (ignore) کرتے ہیں، چمن کے پھول تھے اور والدین چمن کے مالی ہوا کرتے تھے۔ مگر اب کیا ہوا، کیا بات ہوئی جو بیٹھے بٹھائے والدین کھٹکنے لگے۔

ہم ماں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ماں کی عزت و عزمت مقدم ہے۔ ماں کی خدمت فرض ہے اور کبھی کبھی واجب فرض کو چھوڑ کر بھی ماں کی خدمت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ابتدائے اسلام میں ایک بار ایک صحابیؓ جہاد کے لیے جانا چاہتے تھے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ والدہ گھر میں اکیلی ہے اور اُس کی خبر گیری کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابیؓ کو جہاد پر جانے سے روک کر ماں کی خدمت کرنے کی ہی صلاح دی۔

ہم آئے دن اخباروں میں اس بات کے اشتہار دیکھتے ہیں کہ ماں کے لیے اک خادمہ کی ضرورت ہے تنخواہ معقول دی جائے گی۔ سوچنے کی بات ہے اگر

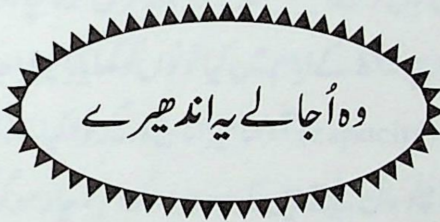
اشتہار دینے والا دنیا میں اکیلا بھی ہوگا تب بھی اُس کے لیے ایسا اشتہار دینا زیب نہیں دیتا کیونکہ جنت حاصل کرنے کے لیے ماں کی خدمت سے بڑا اور کیا کام ہو سکتا ہے اور بغیر بہت زیادہ محنت کیے ہی وہ ایک ایسے خیر سے سرفراز ہوسکتا ہے جس کے لیے جتنی بھی عبادت کی جائے کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا جب تک رب کا فضل وکرم شامل حال نہ ہو۔ افسوس کا مقام ہے کہ خود میاں بیوی سات سمندر پار جا کر موج اُڑاتے ہیں اور ماں کے لیے خادمہ کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ ایسے ڈاکٹروں، انجینئروں اور دیگر بزنس مینوں یا زندگی کے مختلف شعبہ ہائے روزگار سے تعلق رکھنے والے کار پردازوں جو ملک سے باہر زیادہ سے زیادہ دھن کمانے کے چکر میں سرگرداں ہیں، سے ___ میں مودبانہ عرض کرنا چاہوں گا کہ کیا دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ قحط کے ایام میں کیا نوٹوں کو کھایا یا چبایا جاسکتا ہے۔ اگر ایک بندے کی کپیسٹی (capacity) آدھا سیر اناج و دیگر فواکہات کھانے کی ہے، زیادہ پیسہ آنے سے چلو مان لیتے ہیں کہ وہ دوسو گرام، چار سو گرام کھانا زیادہ کھائے گا، عام لوگوں کی نسبت ایک اچھا مکان بنائے گا اور ہزار لوگوں کے مقابلے میں اُس کا پہناوا زیادہ اچھا یا دیدہ زیب ہوگا۔ کیا اسی معمولی آسائش کے لیے وہ ماں کی شفقت اور دعاؤں اور اُس دائم وقائم انعام سے ونچت ہو رہے ہیں جو ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ہائے ___ ہائے ___ افسوس، یاد رکھنا چاہیے یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ کل وہ بھی اس حمام میں ننگے نظر آئیں گے جو آج انہوں نے خود تعمیر کیا۔

☆☆☆

وہ اُجالے یہ اندھیرے

وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

(اقبالؒ)


وہ اُجالے یہ اندھیرے

دوقومی نظریہ سب سے پہلے آر ایس ایس کے بانی ویر ساورکر نے پیش کیا تھا۔ اُسی نظریے کی موجودگی میں جب مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کے حق میں ذرا سی لب کشائی کی تو ویر ساورکر کے ایک بھگت نے برسرِ عام مہاتما کی ہتھیا کی اور بعد میں عدالت کے کٹہرے میں جج کے سامنے بڑے دھڑلے سے کہا کہ اُسے اس قتل پر کوئی شرمندگی یا تاسف نہیں ہے۔ اُس نظریے کو پھر کن لوگوں سے استقامت اور حوصلہ ملا، اُس سے قطع نظر انگریز نے اُس تجویز کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور ملک کا غیر منصفانہ بٹوارہ کر کے دوملکوں اور دو قوموں کے درمیان ایک دراڑ ڈال دی جو کبھی پاٹی نہیں جاسکے گی۔ حق تو یہ ہے کہ یہ دراڑ پاٹی جاسکتی تھی مگر جو متعصب جماعتیں ہندوستان کو ایک ہندو راشٹر میں تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے کیونکہ اُس طرح سے دولوگوں کے آپس میں مل کر شیر وشکر ہونے کی سنمبوانا ہے جو وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتے کیونکہ مسلمان اُن کے لیے ایک نہایت ہی قابلِ نفریں شے ہے۔

بٹوارے سے قبل غیر منقسم ہندوستان میں انگریزوں کی مرکزی حکومت کے علاوہ ساڑھے پانچ سو سے زیادہ چھوٹے راجواڑے تھے جن پر راجے، مہاراجے اور نوابین حکومت کرتے تھے مگر سبھی حکومتوں کی نکیل انگریز کے ہاتھ میں ہوتی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہی بادشاہ ساز (king makers) تھے تو وہ بات زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ اُن راجاؤں، مہاراجوں اور نوابوں میں کئی ایک مسلمان بھی تھے۔ اُنہی میں سے ریاست بھوپال میں نواب سلطان بیگم بھی ایک سربراہ تھیں۔ یہ سطور اُسی ریاست سے متعلق ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں تک نواب سلطان جہاں بیگم

ریاست بھوپال کے تخت وتاج کو پسِ پردہ رہ کر زینت بخشی رہی۔ اُن کے حُسنِ نظامت کے بارے میں سید سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں:

''نواب سلطان جہاں بیگم کی ہستی میں رعب و داب اور شفقت کی ایک عجیب آمیزش تھی۔ اُن کا اخلاق اور اُن کی عادتیں نہایت پُرکشش تھیں۔ اُن کا دربار حد درجہ سادہ ہوتا تھا۔ دربار کے آداب بھی تمام تر شرعی تھے۔ وہ خود پردے کے پیچھے تشریف رکھتی تھیں۔ کورنش، تسلیمات اور رکوع وسجود کا وہاں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ سب سے پہلے ''السلام علیکم'' کی بلند آواز اُن کی طرف سے آتی تھی''۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے تین بیٹے تھے۔ بڑے صاحبزادے کا نام پرنس نصر اللہ خان تھا جو ریاست کے ولی عہد بھی تھے۔ شومیٔ قسمت وہ عنفوان شباب میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کے بعد دوسرے نمبر پر کرنل حافظ عبداللہ خان تھے اور سب سے چھوٹے پرنس حمید اللہ خان تھے جس کی پیدائش سن ۱۸۹۲ء میں ہوئی تھی اور بڑے بھائی کے فوت ہو جانے کے بعد وہی ریاست کے ولی عہد قرار پائے۔ اُدھر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ (بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی سربراہی اور انتظامی اُمور نواب وقار الملک کے ہاتھوں میں تھے۔ اور ریاست بھوپال شروع سے ہی مسلمانانِ ہند کی اس عظیم درسگاہ کی ہر موقع پر امداد و معاونت کرتی چلی آ رہی تھی مگر اس داد و دہش کا دائرہ وسیع تر کرنے اور علی گڑھ کالج کے ساتھ ریاست بھوپال کے تعلقات خصوصی طور پر استوار کرنے کے لیے نواب وقار الملک نے نواب سلطان جہاں بیگم کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے پرنس حمید اللہ خان کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل کرائیں۔ پرنس کالج میں داخل ہو گئے اور انگریزی دورِ حکومت میں غالباً یہ پہلی مثال تھی کہ ایک ریاست کا

شہزادہ اور ولی عہد عام طلباء کے شانہ بشانہ ایک عوامی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے نکلا۔

پرنس حمید اللہ خان بلا شبہ ہندوستان کی ایک بڑی مسلمان ریاست کے شہزادے اور ولی عہد تھے لیکن جہاں تک اُن کے رہن سہن، رکھ رکھاؤ اور میل ملاپ کا تعلق تھا اُن میں اور علی گڑھ کے ایک عام طالب علم میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ اپنی شہزادگی پر فخر یا نمائشی غرور و تکبر اُن میں نام کو بھی نہ تھا۔ گو کہ اُن کی والدہ بیگم صاحبہ نے اُن کی رہائش کا انتظام کالج سے باہر ایک علیحدہ بنگلے میں کیا ہوا تھا لیکن شہزادہ حمید اللہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ سر سید کورٹ کے کمرہ نمبر ۳۳ میں گذارا کرتے تھے جہاں اُس زمانے کے مشہور طلباء جیسے چودھری خلیق الزماں، حکیم احمد شجاع، جناب شعیب قریشی اور مسٹر حسن محمد حیات (لارڈ حیات) وغیرہ کا جھمگٹا رہتا تھا۔ پرنس حمید اللہ خان ذہین و فطین طالب علم ہونے کے علاوہ کالج کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی تھے جو اُس زمانے میں ایک بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ کرکٹ کے علاوہ اُنہیں ہاکی اور ٹینس کے ساتھ بھی دلچسپی تھی مگر پولو کے وہ خاص طور پر بہترین کھلاڑی مانے جاتے تھے۔

سن ۱۹۱۱ء میں اٹلی کی فوجوں نے طرابلس جو اُن دنوں ترک مقبوضات میں شامل تھا، پر اچانک حملہ کیا۔ طرابلس میں مقیم فوجوں نے گرچہ بڑی بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا مگر دشمن کی بھاری کثرت کے سامنے خونِ مسلم ارزانی کے ساتھ طرابلس کی سرزمین کو لالہ زار بنا گئی۔ اس موقعہ پر ترکی نے اٹلی کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کمک مصر کے راستے گذار کر بھیجنا چاہی تو برطانیہ نے اُس کی کھلم کھلا مخالفت کی کیونکہ دشمنِ اسلام ہونے کے ناطے وہ مسلمانوں کو کٹتے مرتے ہی دیکھنا پسند کرتے تھے۔ اس مخالفت کی گونج ہندوستان میں بھی گونجی جس سے

مسلمانانِ ہند میں شدید بے چینی پھیل گئی ۔ چنانچہ محمد علی جوہرؔ کے اخبار کامریڈ، مولانا ظفر علی خان کے زمیندار اور مولانا ابوالکلام آزاد کے الھلال نے بڑی دلیری اور بے باکی کے ساتھ برطانیہ کی مسلم کش پالیسی کو بے نقاب کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اس مخاصمت کی وجہ سے کامریڈ اخبار کی رجسٹریشن منسوخ کی گئی ۔ لاہور میں انگریز کی اسلام دشمنی کا پردہ چاک کرنے کے لیے شاہی مسجد میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جہاں نوجوان ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنی مشہور نظم ''حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم'' پڑھ کر زندہ دلان پنجاب کو خون کے آنسو رُلایا۔ اس بات کا علی گڑھ کے مسلم طلباء نے بھی سنجیدہ نوٹس لے کر کھلم کھلا برطانیہ کی پالیسی کے خلاف غم و غصے کا اظہار کیا۔ اُس پُر جوش احتجاج میں پرنس حمید اللہ خان پیش پیش تھے ۔ حالانکہ خود وہ بڑی نازک پوزیشن میں تھے جس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ وہ مسلمان، علی گڑھ کالج کے ایک مسلمان طالب علم ہونے کے علاوہ ایک ایسی ریاست کے بھی ولی عہد تھے جس کے سر پر بلا شبہ انگریز کا منحوس سایہ جلوہ فگن تھا۔

(۲)

سن ۱۹۲۶ء میں نواب سلطان جہاں بیگم ریاست بھوپال کے تخت و تاج سے کنارہ کش ہوگئیں تو نواب حمید اللہ خان سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خان کہلائے جانے لگے ۔ انہوں نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی برصغیر کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینا شروع کردی۔ اس سلسلے میں پہلا اعزاز جو اُنہیں حاصل ہوا وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کی مسند تھی ۔ اِس کے ساتھ ہی وہ ایوانِ نوابان و راجگان یعنی چمبر آف

پرنسز (Chamber of Princes) جو متحدہ ہندوستان کی تمام ریاستوں پر مشتمل ایک ممتاز ادارہ تھا، کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ اُسی زمانے میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے پہلی اور دوسری گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئیں۔ نواب حمیداللہ خان نے نہ صرف اُن دونوں کانفرنسوں میں ہندوستانی لیڈران کے شانہ بشانہ شرکت کی بلکہ ہندوستان کا نقطہ نظر اُن کانفرنسوں میں پیش کرنے کے سلسلے میں صلاح و مشورے کے لیے ملک کے بڑے بڑے رہنما جیسے محمد علی جناح، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر مختار انصاری، مسز سروجنی نائیڈو وغیرہ سب ہی بھوپال آتے رہے اور اِسی سلسلے میں سن ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر اقبال بھی دو مرتبہ بھوپال تشریف لے گئے تھے۔

نواب حمید اللہ خان نہایت عالی ظرف، روشن خیال اور صاحب بصیرت حکمران ثابت ہوئے۔ وہ اپنی والدہ محترمہ کی طرح علوم وفنون کے قدردان تھے۔ مولوی عبدالرزاق کانپوری جیسے محقق اور مولوی امین زبیری جیسے مصنف اُن کی عہد حکومت میں اُسی سکون واطمینان کے ساتھ خدمت قلم وقرطاس کرتے رہے جیسا کہ وہ اُن کی والدہ محترمہ کے عہد حکومت میں کیا کرتے تھے۔ اُن کے حکومت سنبھالنے کے موقعہ پر وزارت عظمیٰ کا عہدہ خالی ہوگیا تو انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کے داماد شعیب قریشی کو اُس کے لیے منتخب کیا۔ اِسی طرح سن ۱۹۳۵ء میں جب سر سید راس مسعود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے علیحدہ ہو گئے تو نواب حمیداللہ خان نے اُن کو ایک گرانقدر مشاہرے پر اپنی ریاست کے لیے وزیر تعلیم نامزد کیا۔ اُن کی یہ دلی خواہش تھی کہ مولانا سید سلیمان ندوی اُن کی ریاست کے قاضی القضاء (چیف جسٹس) کا عہدہ قبول کریں۔ آخر کار بارہا کوششوں کے بعد وہ اُنہیں سن ۱۹۴۶ء میں ریاست میں لانے میں کامیاب ہوئے مگر بعد میں

پارٹیشن کی وجہ سے تقریری کا وہ موقعہ مختصر ہی ثابت ہوا۔

اُس زمانے میں بلائے گئے ایک بڑے جلسے کے بارے میں اگر بات کی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ سن ۱۹۳۵ء میں مولانا الطاف حسین حالی کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین نے اپنے والد گرامی کا صد سالہ جشن ولادت حالی کے آبائی وطن، ولادت پانی پت میں منانے کا اہتمام کیا۔ اُس تزک و احتشام والے جشن میں ملک بھر کی مقتدر ہستیاں، رہبرانِ قوم، اُمراء و وزراء، ادیب و شاعر، نامور اور بلند پایہ اشخاص، ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے ممتاز لوگ شامل ہوئے۔ جشن کی تیاری کے سلسلے میں کیے گئے انتظامات بے حد شاندار اور دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ جشن کا پنڈال حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کے وسیع و عریض میدان میں سجایا گیا تھا۔ خواجہ سجاد حسین نے دیگر اصحاب کے علاوہ ڈاکٹر اقبال کو بھی جشن میں شرکت کی دعوت بڑے اصرار کے ساتھ دی تھی۔ اُن دنوں ڈاکٹر صاحب گلے کی خرابی کی وجہ سے بیمار تھے۔ اُنہوں نے اُس کے باوجود بھی اپنے آنے کی رضامندی دی تھی۔ اس موقعہ کے لیے انہوں نے چند اشعار بھی بھیجے تھے جو وہ خود پڑھنا چاہتے تھے مگر بیماری اور نقاہت کے باعث کسی اور اچھے تلفظ والے سے پڑھوانے کی تاکید کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب حسبِ وعدہ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو پانی پت پہنچ گئے۔ پانی پت کے ریلوے سٹیشن پر خواجہ سجاد حسین، خواجہ غلام السیدین، نواب ناصر احمد خان، نواب ابراہیم خان اور دیگر معززین نے اُن کا شایانِ شان خیر مقدم کیا اور انہیں ایک سرکاری بنگلے میں ٹھہرایا گیا۔ ۲۶/ اکتوبر کی صبح کو نواب صاحب بھوپال بھی تشریف لائے اور پہلے مولانا حالی کے مزار پر گئے اور فاتحہ خوانی کے بعد جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ یہ جلسہ اُن ہی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نواب ابراہیم علی

خان کے استقبالیہ ایڈرس کے جواب میں نواب صاحب صدر نشین نے ایک طویل یادگاری خطبہ دیا جس کا اختتام علامہ اقبال کی اُس مشہور دُعا کے ایک بند پر کیا جو انہوں نے بڑی انکساری کے ساتھ مانگی ؀

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو گرما دے جو قلب کو تڑپا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشہ فردا دے

نواب صاحب حمید اللہ خان کے خطبہ صدارت کے بعد وزیر تعلیم بھوپال سر سید راس مسعود سٹیج پر تشریف لائے اور ریاست کی جانب سے حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کے لیے امداد کے طور پر بیس ہزار روپے کا اعلان کیا۔ سستا زمانہ اور ارزانی تھی اُس کے حساب سے بیس ہزار روپے ایک بڑی رقم تھی جو آج کم از کم بیس لاکھ روپے سے زیادہ بنتی ہے۔ اُس کے بعد بابائے اُردو مولوی عبدالحق، خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر حسین کی تقاریر ہوئی۔ جن میں مولانا حالی مرحوم کی مایہ ناز شخصیت، اُن کی شاعری اور نثر نگاری کو موضوعِ تقریر بنا کر اُن کو بے حد شاندار الفاظ میں خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ اس جلسے کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ حضرت حفیظ جالندھری نے اپنی ایک خوبصورت نظم ''یادِ حالی'' شاہنامہ اسلام کے مخصوص لب و لہجے میں پڑھی۔

یہاں یہ بات بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ نواب حمید اللہ خان، علامہ اقبال کے عاشق اور سچے شیدائی تھے اور اُن کے کلام پر بلاشبہ جان چھڑکتے تھے۔ سن ۱۹۳۵ء میں جب نواب صاحب کو علامہ اقبال کی معاشی حالات کے دگرگوں ہونے کی خبر ملی تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے لیے فوراً پانچ سو روپے ماہانہ وظیفے

کا تا عمر دینے کا انتظام فرمایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کو علاج و معالجہ کے لیے بھوپال بھی بُلایا۔ اب وہ لوگ اور وہ مسلمانوں کی عزمتِ رفتہ کہاں۔ اب اُس سُنہری دور کو ذہن میں لانے اور اُن اکابرین کو یاد کرنے والے بھی رفتہ رفتہ نابود ہوتے جارہے ہیں۔

(۳)

صورتِ حال ایسی پیدا کی گئی ہے کہ اب مسلمانوں کو یہاں زندہ رہنے کے لالے پڑے ہیں۔ ایک دو نہیں ــــــــ ہزاروں بھی نہیں بلکہ لاکھوں علماء، فضلاء، حاکم، سربراہانِ ریاست، نوابین، جاگیردار، اُدباء، شعراء، آسمانِ معاشیات، سیاسیات، مذہبیات، تعلیمات، ماہرین کسب و مصنوعات کے چاند ستارے اِسی سرزمین میں پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور اِسی زمین میں آسودہ خاک ہوئے مگر آج اُن کے لواحقین کو بڑی حقارت سے اور دھتکار کر کبھی ملک کے ایک حصے سے تو کبھی دوسرے حصے سے اور اب حالیہ فساد زدہ علاقہ مظفر نگر سے بھی وہی گھناونا، مکروہ اور نفرت انگیز حکم نافذ ہوتا ہے کہ ؎

مسلمانوں کے بس دو ہی استھان
قبرستان یا پاکستان

ہندوستان میں رواداری، یگانگت اور بُردباری (Tolernce) ہونے کی وجہ سے ہی شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیا کرتے تھے اور تبھی حکیم الامت نے نصرۂ تحسین لگایا تھا کہ ؎

میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

مگر آج اُن مسلمان اکابرین کا کہیں نام ونشان باقی نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اُن کی نسل کو موت اور دیس نکالا ہی ملتا ہے۔اُس کے برعکس آج ہر کونے کھدرے سے یہی آوازیں سُنائی پڑتی ہیں ۔

رنگ بھرا ہری سنگھ نلوے نے
رنگ لال ہے لال بہادر سے
رنگ بنا بسنتی بھگت سنگھ

کیا ملک کی تعمیر وترقی میں مسلمانوں کا کوئی یوگ دان (Contirbution) نہیں ہے۔ٹھیک ہے شاید وہ ہمیں کرنا نہیں آیا جو باقی کرتے ہیں۔آج ملک میں بدکردار سادھوں اور گاڈ فادروں (دینی باپوں) کا ہی بول بالا ہے۔ایسے استحصالی بدکاروں کے پاس اربوں روپے کی جائیدادیں ہیں۔ نایاب اور قیمتی موٹر کاروں کے کارواں ہیں اس لیے جب اُن کو ''چڑھی جوانی بڈھے نوں'' ہو جاتا ہے تو وہ کام شاستر کا ہی زیادہ اُپ یوگ کرتے ہیں۔ دھرم گرنتھوں کا وہاں کیا کام ۔ یہ بات بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی ، ایسے ہی ایک نرالے راجے کو جب ارغوانی مئے رنگین وآتشیں جب سر چڑھ کر بولنے لگی تو اُس کے لیے سدھ مہا دیو کی مہوش و دلفریب پہاڑیوں کے بیچ میں ایک آئر پیڈ بھی بنایا گیا تھا کیونکہ ۔

آسمان سے آیا فرشتہ پیار کا سبق سکھلانے
دل میں ہے تصویر یار کی لایا ہوں میں دکھلانے

آپ خود اندازہ کیجیے گلزار بٹ جیسے ''رنگیلے سیاں'' کیسے وجود میں آتے ہیں۔ایک مکمل ان پڑھ اور ٹھیٹھ جاہل عود عنسی بن کر راجہ اندر کی طرح اپسروں کا دربار کیسے سجا سکتا ہے اور کیونکر پیغمبری کا دعویٰ ٹھونس سکتا ہے جب تک نہ اُس کے لیے معقول اور مضبوط پشت پناہی حاصل نہ ہو۔ یہ وہی بیرونی آگ کی لپیٹیں ہیں

جن سے نہ صرف ہم جھلس رہے ہیں بلکہ خاک ہو رہے ہیں۔ چونکہ ملک کے سیاست دان یہودیوں کے ساتھ صلح ومشورہ کرتے ہیں اس لیے یہاں پر بھی اُنہی فرعونی ہتھکنڈوں کی عمل آوری ہو رہی ہے جو فرعونِ وقت نے اُس وقت بنی اسرائیل کو زیر کرنے کے لیے آزمایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بغیر کسی قصور کے، بغیر کسی اشتعال کے نوجوانوں کی نسل کشی ہو رہی ہے۔ کبھی نوجوانوں کو مار کر دریا بُرد کیا جاتا ہے اور اُسے خودکشی کا نام دیا جاتا ہے، کبھی نوجوان کام پر جاتا ہے، کالج یونیورسٹی جاتا ہے، امتحان دینے جاتا ہے تو اُسے مختلف ذبح خانوں کے سامنے روک کر حال چال پوچھنے کی طرح دو چار گالیاں سُنا کر قتل کر دیا جاتا ہے۔ کبھی کوکلس کلاں (برطانیہ کی ایک سابقہ دہشت گرد اور قاتل تنظیم) کی طرح نائٹ رائیڈر بن کر گاؤں میں گھس کر نوجوانوں کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ریاست سے باہر زیر تعلیم نوجوانوں کا قیام گاہوں یا ہوسٹلوں میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ اِسی لیے ہم کو آئے دن کبھی ممبئی سے کبھی کرناٹک سے، کبھی یوپی سے تو کبھی راجستھان سے لاشوں کے تحفے ملتے رہتے ہیں۔ ہمارے نوجوان نہ خودکشی کرتے ہیں اور نہ حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ اُن کو کشمیری مسلمان ہونے کی وجہ سے جان بوجھ کر فقط تنگ نظری اور تعصب کی بنا پر ہلاک کیا جاتا ہے۔ چونکہ پولیس اور فوج متعصب جماعتوں کی پشت پناہی پر ہے اس لیے ایسے معاملات کی فائلیں نہیں بنتی اور اگر بنتی بھی ہیں تو بہت جلد کلوز ہو جاتی ہیں۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا کشمیری ہونا یا مسلمان ہونا گناہ ہے، کیا مسلمان کے لیے کوئی جائے پناہ اور امن و آشتی کی جگہ نہیں۔ جہاں تک آثار و قرائن کا تعلق ہے معلوم یہی ہوتا ہے کہ جب تک یہودی ہتھکنڈے اور ریشہ دوانیاں دنیا میں برسر پیکار ہیں تب تک کچھ بھی اچھا ہونے کی توقع نہیں ہے۔

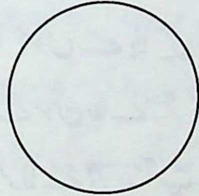
ایسے حادثات اور اتیا چار روز ہوتے رہتے ہیں۔ ہم دو چار دن شور شرابہ، احتجاج اور ہڑتال کر کے جوڈیشنل انکوائری کا مطالبہ کرتے ہیں (ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں) جو کبھی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اُس پر ذرا بھر بھی ایکشن نہیں ہوتا۔ ہم پھر اپنے معمولات اور مشغولیات کے ساتھ مصروف ہو جاتے ہیں جیسا کہ فطری ہے اور معاملہ اُسی بات کے ساتھ خود فراموشی کے صحراؤں میں گم ہو کر رہا جاتا ہے۔ مانو ؎

چڑیا کی جان گئی بچوں کا تماشہ

مگر ایک نوجوان کے شہید ہونے کی وہ پھانس انہی والدین کے دل و جگر میں خنجر کی طرح پیوست رہتی ہے جنھوں نے اُس بچے کو سولہ، اٹھارہ یا بیس پچیس یا اُس کے کم و زیادہ برسوں تک آنکھوں سے بلائیں لی ہوں گی۔ ہم اُن کے درد و کرب کو کیا جانیں۔ جس تن لاگے سو تن جانے۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم یہ درد و کرب اور آہ و فغان اپنے لیے خود خرید کر لائے ہیں۔ آپ نے سُنا ہی ہوگا جب شاعر تلملا اُٹھا تھا ؎

ذرا اپنا ذوقِ اسیری تو دیکھو
چمن بیچ کر ہم قفس مول لائے

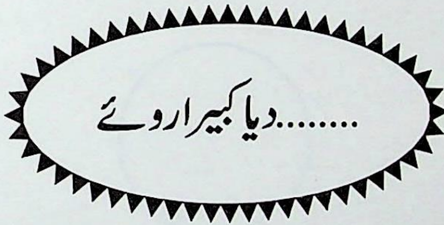
☆☆☆



........دیا کبیرا روئے

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے

(بھگت کبیر)


........دیا کبیر اروئے

بھگت کبیر پر لکھنے والے بیشتر اُدباء اور محققین کے اختلافی اور متضاد آراء کے باوجود اس بات پر سب کی توثیق ہوئی ہے کہ وہ ایک برہمنی کی ناجائز اولاد تھے اور سن ۱۳۹۸ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ پیدا ہونے کے بعد اُن کی ماں نے اُنہیں بنارس کے قریب لہر تارا گاؤں کے ایک تالاب کے کنارے پھینک دیا اور اولاد سے محروم وہاں سے گذر رہے نیرو اور نیما نام کے ایک مسلمان جولاہا جوڑے نے اُنہیں اُٹھا کر گھر لا کر پھر پرورش کی اور یہی میاں بیوی مستقبل میں کبیر کے والدین قرار پائے۔ چونکہ غریب جولاہوں کا گھر اُتنا فارغ البال، متمدن، روشن خیال اور مذہبی عقائد و تعلیمات سے متصف نہیں رہا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کبیر کو ایک مسلمان گھر میں رہ کر بھی مذہبی سوجھ بوجھ، سمجھداری ہی ملی اور نہ تعلیم و تربیت ___ نہ دنیاوی اور نہ دینوی۔ مذہبیات کا وہ علم جو ایک مسلمان کی حیثیت سے اُنہیں گھر اور والدین کی تربیت کے نتیجے میں ملنا چاہیے تھا وہ اُنہیں اِن حالات میں میسر نہ آ سکا۔ چونکہ آس پاس کے سارے ماحول پر ہندو مذہب کے اثرات تھے اور بنارس یا کاشی ایک مشہور دھرم استھان ہونے کے ناطے بھی قرب و جوار میں زیادہ تر ہندو ہی آباد تھے۔ اس لیے بھگت کبیر پر ہندو مذہب کے اثرات زیادہ پڑے۔

دوسری جانب کبیر شریعت اسلامی کے بارے میں بھی کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اسلام کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے البتہ اُن کے گھر میں اور گھر کے آس پاس جو مسلمان رہتے تھے وہ بھی کبیر کے گھر کے افراد کی طرح غریب، مفلس، گنوار اور ان پڑھ تھے یا بہت کم علمیت رکھتے تھے۔ اُنہی لوگوں کو دیکھ کر جو اُن کی سمجھ میں آیا انہوں نے اُسی عمل کو اسلام سمجھ لیا۔ ہندو مذہب و فلسفہ کے بارے میں بھی اُن کا علم محدود تھا۔ چونکہ اُن کے میدانِ عمل کا ماحول اسلام کے مقابلے میں ہندو دھرم کے لیے زیادہ سازگار تھا اس لیے اُن کو اسلام کے

مقابلے میں ہندو دھرم کے بارے میں زیادہ باتیں معلوم تھیں۔ کبیر شاید ہندوستانی بھگت یا صوفی شاعروں میں واحد شاعر ہیں جن کی زندگی کے کسی بھی گوشے سے متعلق ناقدین اور محققین میں اتفاق رائے نہیں ہوسکا ہے۔ چونکہ کبیر پر لکھنے والے تمام محققین اور ناقدین ہندو دھرم سے تعلق رکھتے تھے اور ویسے بھی معاملہ کاشی کے ایک شاعر کا تھا اس لیے اُن کے بارے میں ہندو نقطہ نظر ہی سامنے آیا۔ مسلمان اُدباء اور محققین بھگت کبیر پر زیادہ توجہ نہ دے سکے یا ہوسکتا ہے کہ ایسا جان بوجھ کر کیا گیا ہو۔ بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام پہلو تشنہ طلب ہی رہ گئے جن کا تعلق اُن کا ایک مسلمان خاندان میں پرورش پانے سے ہوسکتا تھا۔

جیسا کہ آگے ہی مذکور ہو چکا ہے کہ بھگت کبیر ان پڑھ تھے اس لیے اُن کے تمام افکار، خیالات و تصورات کا ذریعۂ تعلیم کے بجائے خود اُن کے مشاہدات و تجربات تھے۔ وہ جس معاشرے کے فرد تھے وہاں حالانکہ ہندوؤں کی اکثریت تھی مگر ساتھ ہی وہ علاقہ مسلمانوں کے زیر اقتدار تھا۔ اس لیے لازماً وہاں مسلم تہذیب کا بھی تھوڑا بہت اثر تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ وہاں کے مذہبی ماحول میں کا ہنی، ناتھ پنتھی اور تانترک سادھوؤں کا بھی بہت زیادہ اثر تھا۔ یہ لوگ اپنے اپنے طریقوں سے روزمرہ کے اعمال و رسوم اور خود ساختہ عبادات کے عادی ہو چکے تھے۔ جس سے الوہیت اور خدا پرستی کا بنیادی جذبہ ہی مجروح ہو جاتا بلکہ ہو چکا تھا۔ اس لیے کبیر کی نکتہ چینیوں کے اولین ہدف یہی لوگ بنے۔ گندگی کو کتنے بھی پردوں کے پیچھے چھپا کر رکھیں مگر بدبو آخر پھیل ہی جاتی ہے۔

بھگت کبیر ہندو تھے نہ مسلمان اور نہ ہی انہوں نے دنیا میں رائج کسی مذہب یا مذہبی نظام سے اپنا کوئی تعلق رکھا۔ اُن کا فلسفہ تھا کہ خدا کو اجتماعی صورت میں پکارنے سے نہیں پایا جاسکتا جبکہ یہ قطعی ایک انفرادی عمل ہے جو ایکانت اور تنہائی

کا مرہونِ منت ہے۔ اُن کے لیے ایک باقاعدہ اور منظّم مذہب کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ رب العالمین واحد ہے اس لیے اُس کو حاصل کرنے کے لیے بھی ہر شخص کو اکیلے اور انفرادی طور پر کوشش وعبادت کرنی چاہیے۔ ایکانت اور اکیلے میں ہی عمل کر کے اُس کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ البتہ عبادت وریاضت کے طریقے جداگانہ ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ہر شخص اپنے خودساختہ یا متعین کیے ہوئے طریقے پر چل کر اُسے تلاش کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے چونکہ ساری زبانیں خدا کی ہی زبانیں ہیں اس لیے اُسے کسی بھی زبان یا بھاشا میں مخاطب کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ دنیا میں مختلف منظّم مذاہب کو کبیرا چھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اُن کے خیال میں نیک نیتی کی بنیاد پر قائم کیے گئے یہ منظّم مذاہب عملی طور پر انسان اور انسان کے درمیان دوری پیدا کرنے کے سبب بنے ہیں اور انسان کئی خانوں میں بٹ کے رہ گیا ہے۔

چونکہ سماجی ومذہبی حالت بہت بگڑ چکی تھی اس لیے ظاہر ہے کہ مختلف مذاہب کی ظاہری شکل جو آئے دن اُن کے مشاہدے میں آتی رہی ہوگی اُن کا ایسے حالات میں متنفر ہونا لازمی تھا۔

(۲)

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس طرح ایسا کرنے سے وہ ایک نئے ''دین الٰہی'' کی داغ بیل بھی نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ لوگوں کا حال احوال، اعمال، وطیرہ، مذہب کے نام پر سوداگری اور حرام خوری دیکھ کر ہی تو وہ چلا اُٹھے تھے

ارے ان دونوں نے راہ نہ پائی
ہندون کی ہندوائی دیکھی ترکن کی ترکائی

مطلب یہ کہ ہندو اور مسلمان دونوں گم گشتہ راہ ہیں۔ کوئی صحیح منزل کی جانب

رواں دواں نہیں ہے۔ میں ان دونوں دھرم والوں کا طریقہ کار اچھی طرح سے پہچان چکا ہوں۔ مسلمانوں کو مخاطب ہو کر کہا ؎

دن کو روجا رہت ہو رات ہنت ہو گائے
یاں تو خوں واں بندگی کیونکر خوش ہو خدائے

مطلب یہ کہ مسلمان دن کو روزہ رکھے اور رات کو گائے ذبح کرے، ایک طرف تو وہ خدا کی بندگی کرتا ہے اور دوسری جانب خون بہاتا ہے (کیونکہ ہندو دھرم کے مطابق گئو ہتھیا مہا پاپ ہے۔ یہاں پر کبیر ہندو فلسفہ کی آڑ لیتا ہے جس کا اُن پر زیادہ اثر تھا) کیا اس طرح کے عمل سے اُس پر رب راضی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے بارے میں بھی کہا ہے ؎

پاہن پوجے ہری ملے تو میں پوجوں پہار
تاتے یہ چکی بھلی پیس کھائے سنسار

مطلب یہ کہ اگر پتھر کے پوجن سے بھگوان مل سکتا ہے تو پھر میں پورے پہاڑ کو ہی پوجنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ خیال عبث ہے۔ پتھروں میں چکی کا پتھر کتنا بھلا اور فائدہ مند ہے کہ اس کے پیسے ہوئے اناج سے دنیا پلتی ہے، گویا یہاں بُت پرستی کی بھی صاف لفظوں میں مخالفت کی ہے۔

جیسا کہ آگے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ کبیر مذہبیات کے معاملے میں بالکل ہی کورے تھے کیونکہ اُن کو ویسا ماحول ہی دستیاب نہ ہو سکا جس میں اُن کو دینی تربیت ہو سکتی تھی پھر وہ چاہے اسلامی شریعت کی ہو جاتی یا ہندو دھرم و فلسفہ کی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ایسی بات ہرگز نہ کہتے کہ ؎

کنکر پاتھر جوری کے مسجد لئی چُنائے
تا پر مُلا بانگ دے کیا بہرو بھئیو خدائے

مطلب یہ کہ لوگوں نے پتھر، مٹی، گارے سے مسجد بنا کر کھڑی کردی۔ پھر مُلا مینار پر چڑھ کر اذان دیتا ہے۔ خدا کو چلا چلا پکارنے یا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ (نعوذ باللہ) بہرا تو نہیں ہے۔

یہ تو عیاں ہے کہ مسجد سے جو اذان دی جاتی ہے وہ خدا کو بلانے کے نہیں بلکہ لوگوں کو نماز کے لیے مقررہ وقت کی یاددہانی کرا کے امن و آسودگی اور فلاح کی راہ کی طرف بلایا جاتا ہے۔ یہ تجاہل عارفانہ یا بے خبری بلکہ جہالت کی انتہا ہے۔ کبیر کو کم از کم یہ بات معلوم ہونی چاہیے تھی کہ اذان خدا کو پکارنے کے لیے نہیں بلکہ بندوں کو اُس کی متعین کردہ راہ کی طرف بلانے کے لیے دی جاتی ہے۔ حالانکہ کبیر خود ہی ایک موقعہ پر کہتے ہیں ؎

مُو کو کہاں ڈھونڈے رے بندے
ارے میں تو تیرے پاس رے

کبیر پنت بہر حال تمام دنیا کے انسانوں کو اِس بات پر ہم خیال بنانا چاہتا ہے کہ خدا کی محبت انسان کے لیے واحد راہ نجات ہے۔ اُس کی محبت کے سِوا ایسا کوئی دوسرا راستہ یا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس کو اپنا کر انسان اپنا مقصد پا سکے یا منزل پر پہنچ سکے۔ اس لیے جو بھی ہو جیسے بھی ہو انسان اُسی واحد کا دم بھرتا رہے، اُسی کو یاد کرتا رہے اور اُسی کی محبت میں سرشار رہے۔ اس لیے اُس رب ذوالجلال کی محبت میں ڈوبنے کے لیے بھگت کبیر پوجا پاٹھ، یگیہ، ہوَن، دنیا سے کنارہ کشی، جنگلوں اور غاروں کا باسی ہونا، نماز، روزہ دیگر عبادات، ننگ دھڑنگ پھرنا، تانترک، کاہنی اور دیگر حربے اپنانا لاحاصل مانتے ہیں اور ساتھ ہی معاشرے کے لیے نقصان دہ تصور کرتے ہیں۔ اُن کا بس صرف اس قدر ماننا ہے کہ سچا راستہ صرف اور صرف خدا کی محبت میں پوشیدہ ہے اور اُس محبت کو اپنے انفرادی طور پر بلا

شرکت غیرے دریافت کرنے کی قابلیت واہلیت ہر ایک انسان میں موجود ہوتی ہے۔ ہر انسان ، ہندو ، مسلمان ، برہمن ، شودر ، اونچ نیچ ، بُرے بھلے کو خدا سے قربت کا حق حاصل ہے۔ اُس کے یہاں کہتر مہتر، اونچ نیچ ، رنگ ونسل ، ذات پات، جنس یا عقیدے یا فرقے کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ہے۔

بھگت کبیر کی نظر میں انسان اور انسان کے درمیان تفریق ، دوری ، غلط فہمی ، فرقہ واریت صرف بُرا عمل ہی نہیں بلکہ ایک گناہِ عظیم ہے جس کو خدا کبھی معاف نہیں کرے گا۔ عالمی بھائی چارے (Universal Brothers hood) کے لیے پریم وانی گاتے ہوئے اُن کا کہنا ہے کہ ؎

پوتھی پڑھی پڑھی جگ موا پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی آکھر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

یعنی کوئی شخص دنیا میں کتنے بھی گرنتھ پڑھ لے ، کتنی بھی کتابوں کا مطالعہ کرے ، مگر پھر بھی وہ پنڈت یعنی پڑھا لکھا شخص تصور نہیں ہوگا۔ البتہ جو پریم کے ڈھائی الفاظ (پر ، اے ، م) کے مطلب کو سمجھ لے وہی ہماری نظروں میں پنڈت یا پڑھا لکھا شخص ہے۔

ایک انسان کا دنیا میں آنا اور پھر آکر چلے جانا گویا اُس کی فانی زندگی کی مثال ایک چلتی چکی کے دو پاٹوں سے دی ہے کہ جس طرح چکی میں دانے ثابوت ڈالے جاتے ہیں مگر انجام کار وہ فنا ہو جاتے ہیں، اسی طرح انسان دنیا میں آتا ہے مگر یہ مختصر سا وقفہ آخرش فنا کے ہی گھاٹ اُترتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

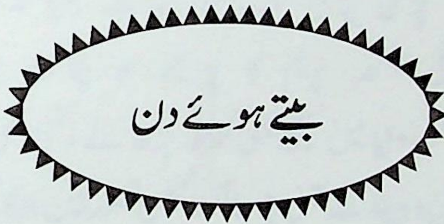
چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دو پاٹن کے بیچ میں ثابت بچا نہ کوئے

☆☆☆

بیتے ہوئے دن

کونسی ایسی ہے نعمت جو مجھے حاصل نہیں
درد و غم بھی ہیں مصائب کی فراوانی بھی ہے

(عرش صہبائی)


بیتے ہوئے دن

زمین کی کھدائی میں ہڈیوں کے پنجروں سے، فوسل، جوہڑوں، سوکھے کنوؤں، پتھروں کے اوزاروں، غاروں کی دیواروں پر مختلف اشکال و چتر کلا سے، سنگی زیورات، کراکری کے ٹکڑوں اور ٹوٹے مٹی کے برتنوں سے قدیم زمانے سے متعلق جو مفروضے وضع کر لیے گئے ہیں یا جیسے وادیٔ سندھ کی تہذیب ترتیب دی گئی ہے آج جب ہم اُس کے بارے میں کتابیں پڑھتے ہیں تو ہمیں وہ کھوج یا تحقیق مفروضہ نہیں لگتا بلکہ ہم سچ مچ ہی ہڑپا، موہنجوداروں کی سرزمینوں میں کھو جاتے ہیں اور سندھ کے ٹھنڈے میٹھے وشال پتوں پر تصوراتی آنکھ سے اپنے آپ کو بھی اُنہی لوگوں میں شمار کر لیتے ہیں جو کبھی اُن صحراؤں، وادیوں اور میدانوں میں اپنے رومان پرور ماحول میں اپنے رومانوں میں مست ساز بجاتے، گیت سجاتے، اپنے قدیم طرز کے مزامیر بکھیرتے آنے والی نسلوں کے لیے ایک نشانی اور تحقیق کے لیے ایک موضوع چھوڑ جاتے تھے۔

جو بات میں گوش گذار کرنے جا رہا ہوں اگر نوجوان طبقہ اسے حُسنِ اتفاق سے بلکہ متعجب ہو کر تاریخ سمجھ لے تو پھر یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس تاریخ کے مورخ و مآخذ بھی ہم ہیں اور راوی بھی ہم ہی ہیں۔ کیونکہ یہ باتیں سُنی سُنائی یا نانی اماں کی کہانی یا اساطیر الاولین کے زُمرے میں نہیں آتی بلکہ یہ حقیقت پر مبنی آنکھوں دیکھی اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔ ستم ظریفی دیکھیے جو بچے سن ۱۹۸۰ء کے بعد پیدا ہوئے ہیں وہ یہ باتیں جب اپنے بزرگوں سے سُنتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی اپنے بزرگوں پر اعتبار بھی نہ کرتے ہوں۔ یہ باتیں الف لیلوی قصے کہانیوں کی طرح دیو مالائی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی صرف چند سال قبل کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

کچھ عرصہ یا چند سال اُدھر کی بات ہے کہ ہماری ایک بزرگ خاتون گوجوارہ سے رات کے ایک بجے دعوت سے فارغ ہو کر اکیلی میزبان کے ہاں سے چل پڑی اور لگ بھگ ڈھائی بجے رات کو گھر (بربرشاہ) پہنچی۔ محترمہ اگرچہ پرانی طرز کا کشمیری برقعہ اوڑھے ہوئے تھی مگر پھر بھی اُس کے ہاتھ، کلائیاں، چہرہ اور کان وغیرہ عیاں تھے اور اُن تمام اعضاء پر سونے چاندی کے زیورات لگے تھے۔ بالے، بُندے، چوڑیاں، جگنی، انگوٹھیاں سب دِکھ رہے تھے مگر محترمہ بغیر کسی خوف وڈر کے بڑے آرام سے لگ بھگ چار کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ طے کر کے آئی اطمینان سے گھر پہنچ گئی۔ عجیب بات ہے نہ چور چکاری کا خوف نہ اغوا کا ڈر اور نہ ہی بے حرمتی یا قتل ہونے کا وسوسہ تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ کون سی بڑی بات ہے مگر حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی بات ہے کیونکہ سابقہ خیام سینما یا موجودہ خیبر ہسپتال ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ خیام روڈ پر جو آج دوکانوں کی قطاریں، ہوٹل، گیسٹ ہاؤس، کارخانے، بستیاں، سکول اور پیٹرول پمپ وغیرہ ہیں وہ بھی نہیں تھے۔ اخوان ہوٹل اور اُس کے سامنے آرٹی سی یا سنگر مال کمپلیکس کو جانے والی روڈ اور اُس کے مقابل خانیار جانے والی سڑک کا بھی وجود نہیں تھا۔ بربرشاہ کے قریب سے گذرتا ہوا باباڈیمب روڈ بھی نہیں تھا۔ قدیم تاریخ میں مشہور آبی گذرگاہ نالہ مارسڑک، ڈل جوہڑ میں اور خوبصورت کناروں، رومان پرور یارہ بلوں (Frienols meeting places) والی لچکتی، بل کھاتی ندی رونٹھ کوہل بھی بدبودار نالی میں تبدیل نہیں ہو چکی تھی۔

جس بڑے راستے کو آج خیام روڈ کہا جاتا ہے وہ سڑک کے نام پر ایک پتلی سی راہداری تھی جو عام طور پر ٹانگوں کی آمد ورفت کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ دائیں بائیں ڈل کے پانیوں سے لدے ہوئے اور روئے آب ہری کائی سے

سجے نالے تھے جن میں اکثر ٹانگے سواریوں سمیت دُرگھٹنا سے دوچار ہو جاتے تھے۔ ایس ایم ڈی سکول نہیں تھا اور منور آباد محلے کے اندر جانے والی گلی کے بائیں طرف قبرستان تھا جس پر آج شاندار تعمیرات کھڑی ہیں اور سکول کے بالکل سامنے ایک سوکھا بوڑھا چنار بھی تھا جس نے نہ جانے اپنے اندر کتنی داستانیں چھپا کر رکھی تھیں ۔ شام گئے لوگ اس راستے پر چلنے سے کتراتے تھے اور بلاشبہ رہزنوں کے خوف سے نہیں بلکہ بھوت پریت کے ڈر سے ۔کوئی خوف تھا نہ ڈر اور نہ کہیں فوجی پہرہ ہوتا تھا۔ پولیس نظر آتی تھی نہ کوئی گرہ کٹ ۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ چوریاں نہیں ہوتی تھیں یا مکمل ''رام راجیہ'' تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اُچکے اور اغوا کار نہیں تھے۔ عورتوں کا جان و مال اور عفت و عصمت محفوظ تھی ۔ چند پیسوں کے لیے قتل ناحق نہیں ہوتے تھے اور رواں دواں گاڑیوں میں بچیوں کی بے حرمتی نہیں ہوتی تھی ۔ بے راہ روی ، نشے کی لت اور اغوا کاری نہیں تھی ۔ ایکس گریشیا ریلیف لینے کے لیے باپ اپنے بچیوں کا بے دردی کے ساتھ قتل نہیں کرتے تھے ۔ کتنے امن وامان والے اور پُرسکون تھے ۔ وہ دن ۔ بیم و رجاء سے قطع نظر دماغ میں حملے کا، چوری کا یا لٹنے کا خیال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور یہ وادی جنت بے نظیر اپنے نظاروں اور کہساروں کی وجہ سے نہیں تھی کیونکہ دنیا میں سینکڑوں بے انتہا پُرکشش اور خوبصورت مقامات ہیں البتہ یہ وادی بلاشبہ جنت بے نظیر اپنے ماحول بے خطر عبور و مرور، امن و آسودگی اور محفوظ جان و مال کی وجہ سے تھی ۔ گرچہ کشمیریوں بلکہ یہ کہنا دُرست ہوگا کہ کشمیری مسلمانوں نے وقت وقت پر سیاسی ظلم، مذہبی عصبیت اور تنگ نظری و تعصب کے ستم سہے تھے مگر ایسے ستم تاریخ کے کسی گوشے سے ہویدا نہیں ہوئے ہیں جس طرح کے ستم آج کل مروج ہیں ۔ اُس وقت اگرچہ مسلمان کم پایہ، غریب اور حاجت مند تھا مگر انفرادی حیثیت

میں وہ ایک باکردار انسان تھا۔ جب اُس سے بیگار لی جاتی تھی تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ راجدھانی پاس پر پیر پھسلنے کا بہانہ بنا کر وہ بیس سیر کا بوجھ کہیں پھینک سکتا تھا۔ مگر نہیں ـــــــ وہ گرچہ بیگار پر ہوتا تھا مگر چاول برابر فوجی کیمپ میں جمع کراتا تھا۔ مگر اب وہ باتیں کہاں ۔ اب ہم نے اپنا سب کچھ، اپنی فرزانگی، بلند خیالی، صبر، مستقل مزاجی، عمدہ کردار اور راستی سب کچھ پس پُشت ڈال دیا ہے اور صرف دنیا کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں ۔ اگر ہم نے معمولی دنیاوی مفاد کی خاطر قانون قدرت اور اپنی ذمہ داریوں سے روگردانی نہ کی ہوتی، غفلت نہ بھرتی ہوتی تو آج خوف وڈر اور گھبراہٹ و پریشانی، بے اطمینانی اور سراسیمگی سے معمور یہی شب و روز ہمارے لیے بہار کے مست و معطر جھونکے ثابت ہو سکتے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ روگردانی نافرمانی ہے اور نافرمانی بہر حال مستوجب سزا و عذابِ الٰہی ہے۔ ناتمام آرزو یہی ہے کہ ؂

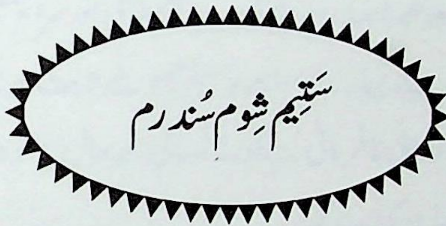
کوئی لوٹا دے میرے بیتے ہوئے دن



سَتیم شِوم سُندرم

کریں وہ ظلم و تشدّد کو عام کیا معنی
لبوں پہ جن کے رہے رام رام کیا معنی؟

(اعظمؔی)


سَتیم شِوم سُندرم

دنیا کی مشہور و معروف کلاسیکی ادب کے زُمرے کی کتاب ''جنگ اور امن'' (War and Peace) کے خالق لیوٹالسٹائی روس کا ایک مشہور فلسفی، صحافی اور ادیب گذرا ہے۔ اُس کی پیدائش سن ۱۸۲۸ء میں ہوئی تھی اور اپنے دن پورے کر کے اُس کی وفات سن ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ وہ روس کے ہی دوسرے مایۂ ناز ادیب خالق ''ماں''، میکسم گورکی کے بچپن کا ساتھی، دوست اور ایک حقیقی رفیق تھا۔ لوگوں نے ٹالسٹائی کے متعلق بیان کیا ہے کہ اُس نے جوانی کی عمر زندگی کے حقیقی معنی سمجھنے اور دریافت کرنے میں گذاری، اور جب وہ اپنی آدھی عمر اس تحقیق و تلبیس میں گذار چکا تو وہ اُس سوال کا جواب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو اوائل عمر میں ہی اُس کے دماغ میں پیدا ہو کر پریشانی کا باعث بنا تھا۔

ایک مرتبہ لوگوں نے ٹالسٹائی سے سوال کیا کہ اُس نے زندگی کا حقیقی معنی کیا سمجھ لیا ہے۔ اُس نے جواب میں کہا:

> میرے خیال اور تحقیق میں بہتر وہی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ مخلوق کے دل میں پیدا کرتا ہے اور وہ ہے ''محبت''۔ محبت ہی زندگی کے حقیقی معنی ہیں۔ ٹالسٹائی اپنے اس انکشاف کے بعد تیس سال تک زندہ رہا اور اُس نے اپنے موقف کو اپنی زندگی میں ہی اُسے لوگوں تک اپنی تحریروں کے ذریعے پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ وہ محبت نامے سدا بہار پھولوں کے مانند کتابی دنیا میں ہمیشہ محفوظ اور زندہ رہیں گے۔

آخر یہ محبت کیا ہے؟ چار حروف سے بنا یہ جادو صفت لفظ ایک پاک پوتر سرمدی جذبہ ہے۔ کرو تو روحانی جلوؤں سے فیض یاب ہو جاتے ہیں، نہ کرو تو خون آشام طاغوتی سائے، سایہ فگن رہتے ہیں۔ محبت کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔

محبت کی دنیا ایک عجیب وغریب دنیا ہے۔اس میں نہاں صلاحیتیں اُبھر کر آتی ہیں، اندھیرے روشن ہو جاتے ہیں اور تاریکیاں چمک اٹھتی ہیں۔ محبت میں درد لذیز لگتا ہے اور گھاؤ سکون دیتے ہیں۔ رِستے ناسور مزہ دیتے ہیں اور ٹھیس فرحت بخشتی ہے۔ ہجر اور بے تابیاں ہنساتی ہیں جب کہ وصال رُلاتا ہے۔ یہ وہ پھول ہے جس میں مہک اور خوشبو تو ہے مگر یہ ہمیشہ کانٹوں سے چھدا رہتا ہے۔ بیگانہ اور باورا تو کرتی ہی ہے مگر محبت ایک ایسی شراب ہے جس کا نشہ آدمی مرنے کے بعد بھی محسوس کرتا ہے۔ کر کے دیکھنے کی شرط ہے۔ دنیا بڑی حسین اور زندگی بڑی پیاری لگنے لگتی ہے۔

بھارت میں مختلف مذاہب، اعتقادات، ذاتوں اور فرقوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں سے قطع نظر لگ بھگ پچاس کروڑ لوگ بلکہ زیادہ سَتیم شِوم سُندرم کے مدعی ہیں۔ یعنی اُن کا ماننا ہے کہ سچائی اور حقیقت اگر کچھ ہے تو وہ شِو ہے اور شِو ہی سُندرتا کا پرتیک بھی ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ شِو ہی ایک اٹل حقیقت ہے اور شِو ہی سُندرتا، خوبصورتی یا جمال کا دوسرا نام ہے۔ گویا سادہ زبان میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہے وہ رب العالمین کی ذات ہے۔ وہی ذاتِ واحد ایک اٹل حقیقت ہے، وہی جمیل ہے اور وہی جمال ہے۔ وہ سراسر جمیل ہو کر جمال کا خالق ہے۔ اب اگر اِس بات کو دوسری یعنی عربی بھاشا میں کہنا ہو تو کیا کہیں گے ______

''اللّٰہُ جمیلٌ و یُحِبُ جمال '' لیجیے صاحب عقدہ کھل گیا۔ اس دعوے کے مدعی اپنے دعوے کے انوسار جمال کو جمیل مانتے ہیں۔ سُندرتا کا پرتیک جانتے ہیں۔ اُس کی جمالیات کے معترف ہیں، قدردان ہیں اور سر آنکھوں سے لگانے والے، مان سمان دینے والے اور پوجن سماجن کرنے والے بھی ہیں۔

ہاں تو بقول مومن خان 'لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا'۔ اب ذرا یہ دیکھتے

ہیں کہ جمیل کی جمالیات میں کیا کچھ آسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جمیل نہ پیکاسو ہے اور نہ وین گال، نہ ایف ایم حسین ہے اور نہ غلام رسول سنتوش جو چار پینٹنگز سامنے کر کے اپنے جمال کی پری درشنی کر دی یا من موہن ڈیسائی یا بر جاتیا بردرس کی طرح دو چار فلمیں داغ دیں اور اپنے جمال کا آگھمن کیا اور سُندرتا کا آسکر ایوارڈ حاصل کر لیا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ جمال کی جمالیات، اُس کی تخلیقات میں جیسے لا انتہا کائنات اور اُس کے بلیک ہولز، چاند، سورج، کہکشائیں اور ان گنت تارے، پہاڑ، دریا، چشمے اور جھیلیں، باغ، گلستان، مرغزار اور نسیمِ سحر، چرند، پرند، اشجار اور نباتات، ترکاری، پھل، پھول اور منڈراتے بھونرے، پانی، بادل، برف اور ہوائیں، دن، رات، شامیں اور صبحیں، ماہ، سال اور صدیاں آسکتی ہیں اور بلا شک وشبہ اِن سب مخلوقات کے ساتھ ہمارے زائد از پچاس کروڑ دوستوں، بھگت جنوں کو محبت ہے، الفت ہے، لگاؤ اور عقیدت ہے۔ نہ ہوتی تو یہ جملہ مخلوق دیوی دیوتاؤں کا روپ دھارن نہیں کرتے اور قابلِ پرستش نہیں بنتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چندرما، شنی، منگل اور سوریہ دیوتا بھی پوجے جاتے ہیں۔ گنگا ندی میا سمان ہے اور جمنا، سرسوتی کی بھی پوجا ہوتی ہے۔ اشومید، گج راج اور ہمالیہ پربت بھی دیوتاؤں کے سروپ ہیں۔ اتِ آد (وغیرہ وغیرہ)۔

بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ "سیر کرتے رہے ہم نا دیدہ بیابانوں کی" مصداق یہ تو عام مخلوق یا تخلیقات ہوئیں۔ ان سب سے بڑھ کر بھی ایک مخلوق ہے جس کا نام اشرف المخلوقات ہے یعنی حضرت انسان۔ تمام مخلوقات میں سے ذی عزت، اشرف، پُروقار۔ جس کے سامنے ان گنت فرشتوں نے سجدۂ تعظیم کیا۔ جس کے لیے سورج، چاند، سیارے، کوہ ودمن، سمندر اور دریا، کشتیاں اور دیگر آمد و رفت کے سادھن، جانور اور حیوانات مسخر بنائے گئے ہیں۔ ہر ایک چیز اُس کے

فائدے کے لیے رکھی گئی۔اس دنیا کا گلستان اُس کا پیرہن بنا کر اُس میں سارے نگہت ونشاط کے پھول پرو دیے گئے ہیں اور جب یہ اپنا پیراہن ہوا میں اُچھال دیتا ہے تو اُس سے پھوٹنے والی عطر وعنبر سے فرشتے وضو کرتے ہیں۔ اِسی لیے مخلوقات میں جو سب سے اعلیٰ ہے اُس کی اعلیٰ قدر و قیمت، توقیر و منزلت اور اعلیٰ شرف و وقار بھی ہونا چاہیے۔ضروری ہے کہ ہونا چاہیے، ایک انسان کو دوسرے انسان کے پاس، ایک ملکی کر دوسرے دیش واسی کے پاس، ایک مذہب رکھنے والے کو دوسرے مذہب دار کے پاس، ایک بولی بولنے والے کو دوسری نطق رکھنے والے کے پاس، ایک رنگ وذات والے کو دوسری چمڑی والے کے پاس اور تب ہی اشرف کو حقیقی معنوں میں اشرف سمجھا جائے گا۔تب ہی اُس کو اشرف ہونے کا درجہ ملے گا۔اُس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو اپنی قبیل، اپنے ہی دائرے کا، اپنے جیسا گوشت پوست والا اور باہم اشرف تصور کرے، جیسے اسلام نے تمام دُنیا کے لوگوں کو ایک اکھنڈتا اور بھائی چارے کا سبق دیا ہے اور ایک انسان کے قتل کا عالم انسانیت کا قتل مترادف ٹھہرایا ہے مگر مگر یہ کیا______ ''یا ایں شوراشوری یا ایں بے نمکی''۔

اُسی عظیم مخلوق کو، اُسی اشرف کو، اُسی جمال کے جمیل کو اس شہرِ ناشاد میں، اس الم کدے میں سر اُٹھانے نہیں دیا جاتا، جینے نہیں دیا جاتا۔اُس کے زندہ رہنے کے راستے مسدود ہیں۔ وہ مسلسل ایک کرب و بلا میں مُبتلا ہے۔کبھی سوپور سے جنازہ اُٹھتا ہے تو کبھی پلوامہ سے، کسی روز ہندوارہ ماتم کدہ بنتا ہے تو کسی روز ترال سے آہ وفغاں بلند ہوتی ہے۔کبھی شہر روتا ہے تو کبھی گاؤں آنسو بہاتا ہے۔

ہر سال امرناتھ یاترا کے دوران تقریباً آدھا شہر ہندوستان سے آنے والے مختلف شہروں اور ریاستوں کے یاتریوں کی خدمت میں جٹ جاتا ہے مگر متعصب

یہاں بھی اُس کی خدمت گذاری اور جانفشانی کو نظر انداز کر کے کبھی سرکاری ملازمین کو پیٹتا ہے اور کبھی مفلوک الحال غریب ڈانڈی والوں اور گھوڑے والوں کی ہڈی پسلی ایک کر دیتا ہے۔ کتنی افسوس ناک اور شرمناک بات ہے کہ اِس سال بیلٹ فورس کے متعصب عنصر کو کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے چیتھڑا پوش مفلس مزدوروں اور خدمت گاروں کو یاتری عورتوں کے ساتھ چھیڑ خوانی کرنے کا الزام عائد کر دیا۔ کس کس طریقے اور حربے سے اِس مخلوقِ خدا کو تنگ کیا جاتا ہے اُس کا کوئی پُرسانِ حال ہی نہیں کیونکہ جب ؎

سیاں بھیٔے کوتوال تو ڈر کا ہے کا

آج کل کشمیر کے لوگ سیاحتی مقامات پر بھی جاتے ہیں، خوب کھیلتے کھاتے ہیں اور موج مستی کرتے ہیں۔ یہاں لاکھوں سیاح بھی آتے ہیں۔ کاروبار خوب ہوتا ہے پیسے کی بھی ریل پیل ہوتی ہے۔ ایک دور دراز دیہات کی اماں جس نے زندگی میں کبھی شہر سرینگر بھی نہیں دیکھا تھا، آج وہ ٹرین پر بیٹھ کر وادی کے جنوبی علاقوں سے مغربی علاقوں تک ریل یاترا سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ کشمیر کے دیہات جو ظالم حکمرانوں کے دستِ تطاول کی وجہ سے صدیوں افلاس، غربت اور تنگ دستی کے ساتھ جھوجنے کے علاوہ آفاتِ سماوی جیسے سیلاب، بھونچال، قحط سالی اور بیماری کی قہر سامانیوں کے نتیجے میں بھوک مری کے بھی شکار بنتے تھے آج اللہ کے فضل و کرم سے خوشحال اور فارغ البال ہیں۔ دیہاتوں کے بچے، نوجوان، زن و مرد زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ماشاء اللہ اونچے اونچے عہدوں پر براجمان ہیں۔ مگر اِن تمام باتوں اور خوش مرحلوں کے باوجود بھی کیا ہم سچ مچ خوش ہیں۔ کیا واقعی ہمارے زخم مندمل ہو چکے ہیں۔ اغیار کی گولیوں سے بہا اپنے بچوں، عزیزوں کا ہاتھوں اور کپڑوں پر لگا خون کیا دُھل

چکا ہے۔ کیا یہ وہی وادی ہے، کیا اس وادی کے شب و روز، مشغولیات، مصروفیات، تفریحات اور سماجی رشتے، عزتِ نفس، آدرسمان وہی ہیں جو بائیس سال قبل تھے۔ کیا الجزائر، فلسطین، بوسینا، افغانستان اور عراق کی طرح وہ لاتعداد اور کچھ بے نام ونشان قبرستان ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اس موقعے پر مجھے اختر شیرانی یاد آتے ہیں جب وہ اپنے ایک ہمنوا سے سوالوں کی بوچھاڑ کر کے پوچھتے ہیں ؂

اُو دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں
مستانہ ہوائیں آتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر
گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں
ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں
کیا شام پڑے گلیوں میں
دلچسپ اندھیرا ہوتا ہے
اور سڑکوں کی دھندلی شمعوں پر
سایوں کا بسیرا ہوتا ہے
باغوں کی گھنیری شاخوں پر
جس طرح سویرا ہوتا ہے
اُو دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی شفق کے سایوں میں

دن رات کے دامن ملتے ہیں
کیا اب بھی چمن میں ویسے ہی
خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں
برساتی ہوا کی لہروں سے
بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں
کیا اب بھی مہکتے مندر سے
ناقوس کی آواز آتی ہے
کیا اب بھی مقدس مسجد پر
مستانہ اذاں تھراتی ہے
اور شام کے رنگین سایوں پر
عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے
اُور دیس سے آنے والے بتا

اِس طرح کے کئی سوالات ہمارے ذہنوں میں بھی اُبھرتے ہیں اور جب جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ایک دم ذہن کے پردے پر وہ والدین، مائیں، بہنیں اُبھر آتی ہیں جن کو سالہا سال بیت جانے کے باوجود بھی اپنے بچوں اور عزیزوں کے بارے میں پتہ نہیں چلتا کہ اُن کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اِسی لیے آج بھی وہ ایک موہوم اُمید کے سہارے سڑکوں پر اور پارکوں میں اپنے گمشدہ عزیزوں کی تصویریں لیے ''نقشِ فریادی'' بنے عالم انسانیت اور انسان دوست مدعی ملکوں اور تنظیموں کے دعویٰ کو ننگا کر رہے ہیں۔ آج بھی ہاہا کار مچی ہوئی ہے کہ اُن کے بچوں کو والدین سے کس نے جُدا کر دیا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ وہ کون لوگ اور کیسے عناصر تھے جنہوں نے یہ رِستا ناسور محض چند

سکوں کی خاطر یا اپنی ترقی کی خاطر، ودیعت کیا ہے۔ اُن لوگوں کا احتجاج، چیخ و پکار اور آخر میں تھک ہار کر خاموش گریہ وزاری صدا بہ صحرا ہی ثابت ہو رہی ہے۔ وُکلاء بھی ہیں، پولیس بھی ہیں، قانون بھی ہے اور عدالتیں بھی ہیں مگر پھر بھی اُن بے نوا روتے بسورتے، بے حال لوگوں کو انصاف نہیں ملتا۔ اِس شہرِ آشوب میں مسخر اور مفتوح کی دہائی سُننے والا کوئی نہیں ہے۔

ہم کاروبار، خرید و فروخت اور شادی بیاہ کے موقعوں پر شاپنگ کے لیے ملک کے کسی حصے میں جا نہیں پاتے۔ مسافر کو دہشت گرد اور خریداری کے لیے پیسے کو حوالہ رقم کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے والے یا پہلے سے ہی گئے طالب علموں کو مختلف طریقوں سے تنگ طلب کیا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی مدھیہ پردیش اور کرناٹک ریاستوں میں زیر تعلیم طلباء و طالبات کے لیے ریاست کے موجودہ چیف منسٹر کو بھی مداخلت کرنی پڑی۔

آخر ہم کیا کریں، ہم کہاں جائیں۔ اب تو ہماری عزت، ہماری نوجوان بیٹیاں بھی سلاخوں کے پیچھے ڈال دی جاتی ہیں۔ فوج کی طرف سے مستورات کی آبروریزی اگرچہ کم ہوگئی مگر ختم نہیں ہوئی۔ ہمیں سکون واطمینان کے ساتھ جینے نہیں دیا جاتا۔ زندہ رہنے کے راستے مسدود ہیں۔ بچے کو نوجوان ہونے سے روک ہے۔ نوجوان کو جوان ہونے سے ٹوک ہے۔ ادھیڑ کو مسلا جاتا ہے۔ بوڑھے کو کچلا جاتا ہے۔ گھر بے نام ونشان ہو جاتے ہیں۔ مارٹر گولوں سے مسکن راکھ کے ڈھیر میں مبدل ہو جاتے ہیں۔ جلی ہوئی بستیوں پر گدھ اونگھتے ہیں۔ گلستانوں پر اُلو بولتے ہیں۔ عورت کی چادر غیر محفوظ ہے۔ عصمت سنگسار ہے۔ عزت تار تار ہے۔ ہر خاندان غمزدہ ہے۔ ہر گھر ماتم کدہ ہے۔ ہر سال، سالِ ماتم ہے، ہر ماہ ماہِ کرب ہے، ہر ہفتہ ہفتۂ بلا ہے، ہر روز روزِ محشر ہے، ہر شام شامِ غریباں ہے، ہر

فردِ واحد اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔

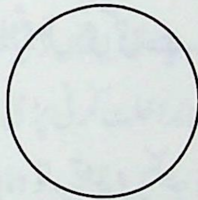
کیا پھر بھی ستیم شِوم سُندرم کا دعویٰ صحیح ہے، حق بجانب ہے، ہرگز نہیں۔ یہ تو دعوے کی کھلی اڑاتی ہوئی ایک ڈھول ہے۔ جی ہاں فقط ایک ڈھول۔ جس ڈھول کے دبیز پردے میں کتنے بچھڑ گئے، اُن کا کوئی حساب ہی نہیں۔ کچھ جنگلوں میں مارے گئے جو جنگلی جانوروں کی غذا بنے۔ کچھ جوہڑوں اور کھڈوں میں مٹی کی دبیز تہوں کے نیچے سُلائے گئے۔ ایسی اجتماعی قبریں صدیوں کے بعد ہی کسی حادثے کی صورت میں معرضِ وجود میں آسکتی ہیں تب تک وہ تو رجعت پسندوں اور متعصب لوگوں کی کرتوت پر پردہ ہی پڑا رہے گا اور کچھ ایسے بھی بے نام ونشان قبرستان ہیں جن کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اُن قبروں میں کن کے جگر کے ٹکڑوں پر مٹی کی دبیز چادر ڈال دی گئی ہے۔ اس لیے ہم اس کے سِوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

کریں وہ ظلم و تشدّد کو عام کیا معنی
لبوں پر جن کے رہے رام رام کیا معنی؟

(اعزؔمی)

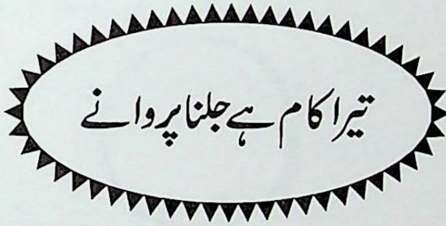


۲۰۱۱ء



تیرا کام ہے جلنا پروانے

ہر طرف ارزاں ہے اس دنیا میں اپنا لہو
چاہے پینے کے لیے ہو یا بہانے کے لیے
(عبدالرحیم نشترؔ)


تیرا کام ہے جلنا پروانے

کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حشر اور ہندوؤں کی انگریز دوستی دیکھ کر سن ۱۹۴۲ء میں قائداعظم علی محمد جناح نے ایک مسلم مملکت کا نعرہ دیا تھا۔ دوقومی نظریے کے تحت مسلم مملکت کی مانگ کے لیے اُنہیں جو بدنام کیا جاتا رہا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نعرہ ہندو مہا سبھا کے بانی اور چیف ویر ساورکر نے بہت پہلے دیا تھا جب اُس نے ہندو راشٹر اور ہندوتوا کی تھیوری پیش کی تھی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ قائداعظم نے غیر منقسم ہندوستان میں مسلم مفادات کو سبوتاژ ہوتے دیکھ کر ایک الگ مملکت کا نظریہ دُہرایا ہو مگر وہ صرف پیش بین تھے پیش ور نہیں۔

ویر ساورکر نے اپنی کتاب ''ہندوستانی تاریخ کے چھ ادوار'' میں مراٹھوں سے بے حد ناراضگی ظاہر کی ہے کہ وہ احمد شاہ ابدالی (۱۷۵۷ء) کے مظالم کا بدلہ موجودہ مسلمانوں سے کیوں نہیں لیتے۔ ساورکر مسلمانوں سے صرف بدلہ ہی نہیں لینا چاہتا تھا بلکہ اسلام اور مسلمانوں کو نیست و نابود کر کے ہندوستان کو ''مسلمانوں سے پاک'' کرنا چاہتا تھا۔ ساورکر نے یورپی ممالک سپین، پرتگال، یونان اور بلغاریہ جیسے ممالک کی تعریف و ستائش کی ہے کہ ماضی میں اُن ممالک نے مسلمانوں کو مار کر عیسائیت کے لیے تحفظ یقینی بنالیا تھا اور اُسی طرح وہ ہندوستان کے لیے مسلمانوں کو مار کر ہندوتوا کو متعارف کرانے اور ہندومت کے تحفظ کے لیے تاویلیں اور دلیلیں دیا کرتا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ مراٹھوں کو اُن مسلمانوں سے بھی بدلہ لینے کو کہہ رہا تھا جو متھرا، گوکل وغیرہ جیسی جگہوں پر بود و باش رکھتے ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ مل جُل کر رہتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ساورکر ہندوؤں خاص کر مراٹھوں کی فہمائش کر کے کہتا ہے کہ ہندوستان میں مقیم عام مسلمانوں کو بھی قتل کر

دینا چاہیے۔ اُن کی مسجدوں کو مسمار کر دینا چاہیے اور مسلمان عورتوں کی عزت لوٹنا چاہیے تا کہ ماضی میں اُن کے ہم مذہبوں سے ہوئی زیادتیوں کا اتلاف ہو سکے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ متعصب جماعتوں نے ساورکر کے ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے بابری مسجد کو جزوی طور منہدم کیا اور اُس سلسلے میں ہوئے مظاہروں میں سب سے زیادہ نقصان ممبئی کے مسلمانوں کا ہوا۔ پولیس کی شکل میں وردی میں ویر ساورکر کے چیلوں نے برابر اپنے گرو کے فرمان کی تعمیل کی۔ ممبئی کی فری لانس صحافیہ جیوتی پنوانی کی کتاب 'وِٹ نسز سپیک' (witnesses speak) کے مطابق ممبئی پولیس نے گھروں میں گھُس کر مسلمان عورتوں کو بے آبرو کیا۔ درس گاہوں اور مدرسوں سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہانک کر اور سڑک پر لا کر اُن کی پیشانیوں کو گولیوں سے داغ دیا۔ بستیوں میں جا کر پُر امن لوگوں، نادار بزرگوں اور اپاہج عورتوں تک کو بھی بے دردی کے ساتھ ذبح کر دیا۔ مسجدوں میں جا کر نمازیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا اور جو زندہ بچ رہے اُن کو جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر کال کوٹھریوں میں ڈال دیا۔ ابھی حال ہی میں سن ۱۹۹۳ء کے قتل عام میں پھنسائے گئے ایک نوجوان فاروق ماپکر کو سولہ سال کے بعد کورٹ نے باعزت بری کر دیا۔ مگر آنریبل کورٹ اُس نوجوان کی جوانی کے ضائع شدہ سولہ سال کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ کر بھی کیسے سکتی تھی کیونکہ

جہاں بے درد حاکم ہو وہاں فریاد کیا کرنا

فاروق ماپکر کے جرمِ بے گناہی میں قید و بند میں کاٹے ہوئے سولہ سال وہ اندھے کنویں میں گذارے جوانی کے بیتے ہوئے دن، اُنہیں کون لوٹائے گا۔ کوئی لوٹا ہی نہیں سکتا اور نہ کوئی اُس وقت کی تلافی ہی کر سکتا ہے۔

یہ بات ضمناً عرض کروں کہ جیوتی پنوانی نے بلیک فرائی ڈے نامی فلم ریلز

ہونے کے موقعہ پر ٹائمز آف انڈیا ممبئی ایڈیشن (مارچ ۲۰۰۹ء کی کوئی تاریخ) میں ایک مبسوط تبصرہ لکھ کر ممبئی پولیس کے بہت سے مظالم سے پردہ اٹھایا ہے (اخبار کا تراشا آگے پیچھے ہوگیا ہے اس لیے میں صحیح تاریخ کی نشاندی نہ کرسکا)۔

بہر حال ویر ساورکر کی کتاب سے دیے گئے مذکورہ حوالے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی جرم میں یقین رکھتا تھا۔ سزا انفرادی حیثیت میں اپنے کیے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ہم مذہبیوں کے کیے کرائے کے لیے دی جاتی تھی۔ بقول اُس چھوٹی سی انگریزی کہانی کے جو بچے اکثر پڑھتے رہتے ہیں کہ ''کیا ہوا کہ ابھی تم چھ مہینے کے ہو تم نے نہ سہی تمہارے باپ نے ضرور گالیاں دیں ہوں گی''اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کو تاریخی خطاؤں کے لیے سزا ملتی ہے۔ یہ مکارانہ چالیں، عصبی سوچ، متعصّبانہ کج فہمی اور مسلمانوں کے ساتھ خدا واسطے کا بیر کی ایک عجیب منطق ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی جب کہ غلط کرنے، کروانے کا بھی کوئی مدلل ثبوت یا کوئی تاریخی شواہد موجود نہ ہوں۔ جہاں تک غیر مسلموں کی لکھی ہوئی تواریخ کا تعلق ہے انہوں نے مسلمانوں کی حکومت کو بلا کسی شک وشبہ اور دباؤ کے جمہوری اقدار کی حامل ٹھہرایا ہے اور وہ مسلمان بادشاہوں کی عدل گیری، ہم آہنگی، انصاف پروری، رفاہ عام کے کام، فلاح و بہود، مذہبی رواداری اور غیر مسلموں کے ساتھ حُسنِ سلوک کے لیے رطب اللسان ہیں۔ مشہور ہے کہ سندھ سے جب محمد بن قاسم کو واپس بغداد بلایا گیا تو وہاں کے غیر مسلم عوام نے احتجاج کیا اور کئی ایک نے دھاڑیں مار مار کر اور رو رو کر اپنا بُرا حال کر دیا۔ وہ اپنے حُسنِ سلوک کی وجہ سے غیر مسلم رعایا میں ہر دلعزیز اور محبوب تھے۔

متعصب مؤرخوں نے سلطان محمد تغلق کو ایک بیوقوف بادشاہ ثابت کرنے کی

کوشش کی ہے۔ مگر یہ بے پر کی اڑانے والے بلاشبہ بیمار سوچ وسمجھ کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ایک غیر مسلم ہندو نے ایک بار سلطان پر بھائی کے قتل کا مقدمہ قاضی شہر کی عدالت میں دائر کر دیا۔ فوراً کاروائی ہوئی اور بادشاہ کے نام سمن جاری ہوا اور عدالت میں حاضر ہونے سے قبل بادشاہ نے قاضی کے پاس یہ اطلاع بھیج دی کہ جب وہ یعنی بادشاہ عدالت میں حاضر ہوں تو کوئی اُس کے استقبال کے لیے پیش قدمی نہ کرے بلکہ اُس کے ساتھ عام ملزموں جیسا سلوک کیا جائے۔ مقررہ دن پر بادشاہ بغیر کسی مصاحب، یا نوکر غلام کے عدالت میں حاضر ہوا۔ قاضی نے مقدمے کے فیصلے میں مقتول کی دیت باشادہ کا قتل مقرر کیا۔ غور فرمایئے خون بہا میں سلطان ہند کو قتل ہونا تھا اور وہ بھی اُس سلطان کو جو تخت نشین تھا، حاکمِ ہندوستان تھا۔ اِسی کو اسلامی قانونِ انصاف کہتے ہیں۔ جس میں راجہ اور رنک میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اب کیسے خاکی نیکر پوشوں کو سمجھائیں کہ ایسے ہی مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان پر عدل وانصاف کے ساتھ حکومت کی ہے۔ بہرحال بعد میں استغاثہ خون بہا میں زرکثیر پر راضی ہوا اور بادشاہ کو معاف کر کے اپنا مقدمہ واپس لے لیا۔ اِسی طرح اک مصاحب کے لڑکے نے اِسی بادشاہ پر اکیس کوڑوں کی نالش کی۔ قاضی نے بدلہ لینے کا فیصلہ دے دیا۔ بری عدالت میں بادشاہ پر کوڑے برسائے گئے۔ اُس کی کلاہ شاہی دور لوگوں کے پیروں میں جا گری مگر انصاف پورا ہو کر رہا۔

تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے۔ کیا شیر شاہ سوری جیسا عظیم، باجبروت اور باغیرت بادشاہ اپنی بہو کو اپنی ننگی پیٹھ دکھانے کا حکم دے سکتا تھا۔ ایسا ہو چکا ہے اور یہ واقعہ ایک انگریز مؤرخ ولیم اِرسکین نے اپنی کتاب ''اے ہسٹری آف انڈیا'' میں درج کیا ہے۔ اس معاملے میں بھی مستفیث اور

استغاثہ ایک ہندو دوکاندار ہی تھا۔ جس کی بیوی کی پیٹھ نہانے کے دوران ولی عہد نے دیکھ لی تھی۔ بہرحال عرض یہ کر رہا تھا کہ مسلمان حکمرانوں نے رعایا پروری اور عدل و انصاف کا ثبوت ہر قدم پر دیا ہے۔ ہر مسلم حکومت میں بڑے بڑے کارندے اور عمایدین خاص غیر مسلم ہی ہوا کرتے تھے۔ مگر کتنی افسوس کی بات ہے کہ انہی عدل و انصاف اور مہربان و رحیم حکمرانوں کی اولاد کو بلکہ منجملہ تمام مسلمانوں کو ہندوستان سے صاف کرنے کے مشورے دیے جاتے رہے ہیں اور مشوروں پر عمل درآمد بھی ہوتا رہا ہے۔ بقول عبدالرحیم نشترؔ

ہر طرف ارزاں ہے اس دنیا میں اپنا لہو
چاہیے پینے کے لیے ہو یا بہانے کے لیے

II

لیبیا کے صدر کرنل معمر قدافی صحیح تھے یا غلط، حق پر تھے یا ناحق خون خرابہ کرا رہے تھے سر دستِ وہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اُس سے قطع نظر اپنی چودھراہٹ کے زعم میں اُس پر ہوائی حملے کرا کے اُس کی فیملی کو ہلاک کر کے ڈرامہ ساز اور ڈرامہ باز کنگال ورلڈ پولیس مین نے ایک سنگین اور بین الاقوامی جرم کا ارتکاب کیا۔ چونکہ اُس شرمناک اور گھناونے جرم کی عالمی سطح پر مذمت ہو جاتی، اس لیے اُسی مکروہ غرور میں اُس نے دنیا کو مزید بیوقوف بنانے کے لیے قتل ناحق کے صرف ایک دن بعد اسامہ بن لادن پر ریڈ کر کے اُسے شہید کرنے کا ایک اور ''ون ایکٹ پلے'' کا نرمان کیا حالانکہ یہ ڈرامہ حقیقت سے کوسوں دور تھا۔ اپنے یہودی حکومت سازوں اور پالیسی سازوں کی پالیسیوں کی عمل آوری اور طاغوتی چیرہ دستیوں کی بجا آوری کے سلسلے میں ایسا ہی ایک ڈرامہ گیارہ ستمبر سن ۲۰۰۱ء کو بھی کھیلا گیا تھا۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے بیشتر لوگوں کو نکال کر بذاتِ خود سینٹر کی دونوں عمارتوں میں تباہ کن بم پلانٹ کر کے پھر اُس پر ہوائی حملہ کرا کے اسامہ بن لادن کو حملے کا ذمہ دار مان کر اور مجرم قرار دے کر عالم اسلام کے مسلمانوں پر دہشت گردی کا لیبل چسپاں کر دیا گیا اور مجموعی طور پر اسلام کو دہشت گرد مذہب مشتہر کر کے امریکہ نے اپنے لیے بیسوں مطالب اور فائدے محفوظ کروا لیے۔

پہلا فائدہ ورلڈ پولیس مین کو یہی ہوا کہ مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے کر اُسے مسلمان ملکوں میں مداخلت کرنے، فوج کشی کرنے اور اُن کو کھنڈروں میں تبدیل کرنے اور اُن کے سربراہوں کو قتل کرنے کا موقعہ ملا۔ جس کی مثالیں، عراق، افغانستان، پاکستان، تیونس، یمن اور مصر وغیرہ سے مل سکتی ہیں۔ خصوصاً عراق اور افغانستان میں ملک یا سلطنت کہلانے والی کوئی بھی شے باقی نہ بچی۔ کبھی کی شاندار تاریخی پس منظر کے ساتھ کی مملکتیں آج آثار قدیمہ نظر آتی ہیں۔ دوسرا فائدہ مسلمان ملکوں کے قدرتی وسائل اور معدنیات وغیرہ پر بلا شرکت غیرے نظر گذر اور بہ الفاظ دیگر قبضہ کرنا تھا۔ مسلمان ممالک میں امریکی فوج کا داخلہ بھی بغیر کسی روکاوٹ کے ہونا جس سے اسرائیل کو ایران، پاکستان اور سعودی عربیہ سے حملے کا خطرہ ٹل گیا۔ حالانکہ ایسی کوئی بھی بات نہ تھی مگر یہ صرف امیر مسلمان ملکوں کے قدرتی وسائل پر زبردستی چودھراہٹ قائم کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ اور یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ سعودی عربیہ میں امریکی فوجی چھاونیوں میں ہر طرح کی دادِ عیش دیتے ہیں اور اُن کا خرچہ سعودی حکومت اُٹھاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ کیمپوں کی رکھوالی پر سعودی فوج مامور ہے۔ ستم ظریفی دیکھیے غاصب اور شر پسند فوج موج اڑاتی ہے اور دین دار باہر ریت اور بالو کے جھکڑوں سے جھلستے رہتے ہیں۔ ورلڈ پولیس مین کے یہودی آقا یہ سب دیکھ کر کتنی خوشیاں مناتے ہوں گے۔

تیسرا فائدہ اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ امریکہ میں تیزی سے پھیلنے والا مذہب اسلام ہے، اُس پر بھی روک لگانا مقصود تھا۔ بہرحال اُس میں کس حد تک کامیاب ہوا، وہ دنیا جانتی ہے، جب آئے دن تبدیلیٔ مذہب کی خبریں اخباروں میں آتی ہیں۔ یک فائدہ اُس کو یہ بھی تھا کہ مسلمان ملکوں کو تباہ کرنے کے بعد انہیں نئے سرے سے تعمیر کرنے کے سارے کنٹریکٹ امریکی کمپنیوں کو دینا۔ انہی بیسیوں مالی اور سیاسی فائدوں کے پیش نظر اتنا بڑا کھڑاگ تیار کیا گیا تھا۔ مجموعی طور پر کوئی ملک کیسا بھی گیا گذرا ہو اُس پر بہرصورت کچھ لوگوں کا حقیقت پسند اور حقیقت شناس ہونا ناگزیز ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر خود ساختہ حملہ ہونے کے بعد کئی ایجنسیوں، اداروں اور دانشوروں نے اس بات کی سرے سے مخالفت کی کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر اسامہ بن لادن کی تنظیم نے حملہ کیا تھا جب کہ یہ متفقہ طور پر مان لیا گیا کہ امریکی اربابِ اختیار اور حکام بست و کشاد نے یہ گھناونا جرم خود ہی سرانجام دیا تھا۔ اُن تنظیموں اور اداروں کا کہنا ہے کہ اسامہ بن لادن یا القاعدہ کے پاس وہ صلاحیت اور ٹیکنالوجی تھی ہی نہیں جس نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو منہدم کیا تھا۔ انجینئروں اور واقف کار حلقوں کا کہنا ہے کہ ہوائی جہازوں میں موجود پیٹرول سے اُن ٹاوروں میں استعمال ہونے والے مضبوط ترین لوہے کا پگھلنا ناممکن تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دونوں ہمالیای عمارتوں کے انہدام کی وجہ جہازوں کا ٹکرانا نہیں ہے بلکہ عمارتوں میں پہلے سے نصب شدہ طاقت ور بموں کا ٹھیک اُسی وقت پھٹنا ہے، یہ عمارتیں آگ کے زور سے نہیں بلکہ بموں کے پھٹنے سے زمین بوس ہوگئیں۔ یہ بات یوں بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ جس نے بھی اُس واقعے کی ویڈیو فلم دیکھی ہوگی اُس نے یہ بات ضرور مشاہدہ کی ہوگی کہ عمارت کی جس جگہ کے ساتھ جہاز ٹکراتا ہے اُس سے تقریباً پچاس گز نیچے کالے دھویں کے بادل ظاہر ہو جاتے ہیں اور اُس کے

ساتھ ہی آگ نمودار ہوتی ہے۔ ٹاور کا سر ایا اوپر والا حصہ اور بیچ والا حصہ کیسے ایک ساتھ متاثر ہو سکتے ہیں۔ کوئی کہے یا نہ کہے حیرانگی تو ویسے بھی واقعہ کو دیکھ کر ہو جاتی ہے۔

امریکہ کے مشہور تحقیقی ادارے جیسے نیویارک کولیشن فارا کاونٹ ءبلٹی فار نائن الیون، آرکیٹکٹس اینڈ انجینئرس فار ٹروتھ آف نائن الیون، یو۔ ایس۔ ملٹری آفیسرس فار نائن الیون ٹروتھ، مشہور مصنف ڈیوڈ رے گرفن، مشہور امریکی دانشور نوم چومسکی ، صحافیہ ایون ریڈلی، بی بی سی لندن کا سابق نیوز رپورٹر ایلین ہارٹ، برازیل، جاپان، ارجنٹینا اور ایران کی حکومتوں کے ذمہ داران اور دنیا کے ہزاروں انصاف پسند اور حقیقت شناس لوگ حالات اور شواہد کی بنا پر اِس ڈرامے کو ورلڈ پولیس مین کی ہی کارستانی سمجھتے ہیں۔

مذکورہ ڈرامے کے ڈراپ سین کے چند مہینوں بعد امریکہ میں پروٹسٹنٹ فرقے کی سب سے بڑی تنظیم مارٹن بورس کے سربراہ فرنیکلین گراہم نے ایک ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسلام ایک فسق و فجور (wicked) والا مذہب ہے۔ ابھی اُس اسلام دشمن کی کوتاہ عقلی پر ماتم ہو ہی رہا تھا کہ دنیا کے سب سے بڑے اور بدترین مسلم دشمن یہود نواز سابقہ امریکی صدر جارج بش نے پیغمبری کا دعویٰ ٹھونسا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُسے خدا کی طرف سے اپنی قوم کی قیادت پر مامور کیا گیا ہے۔ جارج بش کے عقائد نامی کتاب کے مصنف سٹیفن فیلڈ کے مطابق امریکی سابقہ صدر کو یقین تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس کے دل اور روح میں سما چکے ہیں۔ جارج بش کی اسلام دشمنی اس طرح سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عراق اور افغانستان کے نہتے لوگوں کو خاک و خون میں ملانے اور تڑپا تڑپا کر مارنے سے قبل اُس نے اِسی مسلم دشمنی کی آڑ میں نہ صرف اسرائیل کو مضبوط

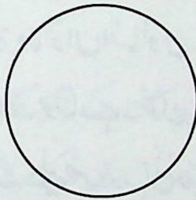
بنانے میں ہر طرح کا تعاون اور مدد دی بلکہ امریکی عیسائی خیراتی اداروں کو اُس سال (۲۰۰۱ء) ساڑھ ارب امریکی ڈالر (زائدازاٹھائیس کھرب روپیہ) چندہ بھی دے دیا۔

حضورِ پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل مکانی کے ساتھ ہی پیغمبری کے جھوٹے دعویداروں کا سلسلہ شروع ہوا تھا جو آج اکیسویں صدی تک برابر جاری ہے۔ اُن جھوٹے اور کذاب مدعیاں کا اپنے اپنے زمانے میں کیا حشر ہوا، اُس سے کئی ہزار گنا زیادہ نحوست اور تباہی کے لیے مذکورہ کذاب اور ورلڈ پولیس مین کو من حیث القوم اور اعانت کار تیار رہنا چاہیے کیونکہ پیغمبری کے لغو دعوے کے علاوہ نہ صرف اُس کے بلکہ اُس کی قوم کے بھی ہاتھ ہزاروں، لاکھوں، بے گناہ مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور ناخیز و ناتواں انسانوں کے قتل ناحق سے آلودہ ہو چکے ہیں۔ قتل کسی کا بھی ہو لہو بہر صورت بولتا ہے۔ خونِ ناحق سے جو زمینیں لالہ زار ہو چکی ہیں وہ ایک دن انصاف کے لیے ضرور دہائی دیں گی اور "زبان خنجر اگر چپ بھی رہے گی مگر آستین کا لہو ضرور پکار اٹھے گا"۔

سردست مسیلمہ کذاب کے برادر اور اُس کے جانشین کو ہم صرف اتنا ہی کہیں گے کہ سرکش انسانوں اور سرکش قوموں کو رب العالمین سزا دینے میں اگر دیر کرتا ہے مگر بہر حال انصاف ہو کر رہتا ہے۔ اُس کی برسنے والی لاٹھی سے گرچہ آواز نہیں آتی مگر دنیا تماشہ ضرور دیکھتی ہے۔ اُن کے لیے یہ بھی مشورہ ہے کہ اگر فرصت ملے تو سرکش قوموں کے انجام سے متعلق تاریخ کی کُتب کا مطالعہ ضرور کرنا۔

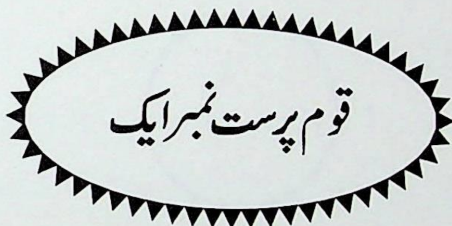
(اکتوبر ۲۰۱۱ء)

☆☆☆



قوم پرست نمبر ایک

میرے مزاج میں جذبہ ہے ملک و ملت کا
مرا پیام ہے ہر بشر کے لیے
(قمر رئیس بہرائچی)


قوم پرست نمبر ایک

موجودہ زمانے میں رہنے والے لوگوں کو یہ اچھی طرح سے معلوم ہے کہ ہماری ضروریات اور ترجیحات کیا ہیں اور وہ ہر اُس شخص کے لیے بھی عیاں ہیں بلکہ خصوصیت واہمیت رکھتے ہیں جو ہندوتوا کی حقیقت سے واقفیت رکھتا ہو۔ایک مندر جو ممکن ہے کسی خاص وجہ سے منہدم کرایا گیا ہو جیسے اورنگ زیب عالمگیرؒ نے سفر کے دوران جب دیگر ہم سفر مصاحبوں اور راجاؤں کے کہنے پر بنارس میں ایک رات کے لیے پڑاؤ ڈالا تاکہ سلطانِ ہند کے ساتھ سفر کرنے والے ہندو راجے اور اُن کی رانیاں گنگا میں اشنان کر سکیں تو اُس نے وہاں ایک مندر گرا کر اُسے دوسری جگہ سرکار کی جانب سے دی ہوئی زمین پر تعمیر کرنے کا حکم اس لیے دیا تھا کیونکہ بادشاہ کے اُس مختصر سے قیام کے دوران اُس کے ایک ماتحت راجہ کی رانی کو مندر کے پروہتوں (تفاصیل انشاء اللہ پر کبھی بتاؤں گا) عصمت دری عین گنیش جی کی مورتی کے نیچے تہہ خانے میں کی تھی۔

______ اُس کے بدلے میں ناحق ایک مسجد شہید کر دی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ہی جو فسادات کرائے جاتے ہیں اُس میں مسلمانوں کی غیر ثابت شدہ اور ناکردہ تواریخی جرم میں ملوث ٹھہرا کر سزا دی جاتی ہے۔ایک شہر میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جاتا ہے، انہیں زندہ جلایا جاتا ہے۔عورتوں حتیٰ کہ پانچ پانچ برس کی معصوم بچیوں تک کی بھی بے حرمتی کی جاتی ہے، تاکہ ایک دوسرے شہر میں ریل گاڑی کے ڈبے میں خود ہی جلائے گئے مسافروں کو بدلہ لیا جا سکے۔اس سب قہر سامانی اور حیوانی بربریت کو ریاست گجرات کے وزیر اعلیٰ کی چھتر چھایا میں اجتماعی جرم کے نام پر جائز ٹھہرایا جاتا ہے اور اُس سفاک دل میں اِس انسانی شکار اور آدمیت کی بے عزتی پر ذراسی بھی دیا یا معمولی سا بھی افسوس نہیں ہوتا اور وہ آج

بھی ٹھاٹھ سے ریاست کی سب سے اونچی پدوی پر بیٹھ کر اُن بچے کھچے مسلمانوں کو اپنے گاؤں میں جانے کی اجازت نہیں دیتا اور اُن کی نجی زرعی زمینیں اپنے چہیتے لوگوں میں کارخانے اور فیکٹریاں لگانے کے لیے بانٹ رہا ہے اور بلاشک وشبہ یہ سب ساورکر کی تحریروں میں پائے جانے والے خیالات کی بازگشت ہے۔

اتنا اشتعال انگیز ذہن رکھنے اور زہر آلود لٹریچر فراہم کرنے کے باوجود بھی ظاہر ہے کہ ساورکر کو ان باتوں کے لیے کم ہی موردالزام ٹھہرایا جاسکتا ہے جو کچھ اُس کے حواری عملی میدان میں کر رہے ہیں کیونکہ کوئی بھی لیڈر یا دشمنِ انسانیت شخص اپنے پیروکار خود نہیں چُن سکتا ہے وہ بھی اُس صورت میں جب وہ منظر نامے سے غائب ہو چکا ہو۔ کہنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ جب ہندوستان اتنے نازک وقت سے گذر رہا ہے۔ اقلیتوں کے لوگ عیسائی، دلت اور خاص طور پر مسلمان خوفزدہ ہیں۔ ہر فرد اپنے آپ کو اور گھر کی بہو بیٹیوں کی عزت غیر محفوظ سمجھتا ہو اور وادی کے لوگ خاص طور پر کاروبار کے سلسلے میں پھل فروٹ لے کر یا خریداری کے سلسلہ میں، تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اور علاج ومعالجہ کے لیے، سفر پر جانے سے بھی غیر محفوظ اور خوفزدہ ہوں، کیا تب ایک ایسے شخص کو جس کا فلسفہ حیات فرقہ پرستانہ، عدم برداشت، غیر اخلاقی اور غیر جمہوری ہو، اعزاز بخشنا دانش مندی کی دلیل ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اجیت کمار کارنک نے اکنامک اور ''پولیٹکل ویکلی'' میں لکھا تھا:

''ساورکر کا انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں دوہرا اور متنازعہ کردار ایک طرف ساورکر کے افکار میں جو تقسیم پرور اور اخراج کا فلسفہ ہے، وہ جمہوری سوچ کے لیے اتنا ناگوار ہے کہ اُس کی ہر ایک شخص کو کھل کر مخالفت اور سخت ترین مذمب کرنی چاہیے۔ ساورکر کی عزت

افزائی کے معنی اُس کے زہر آلود اور غیر جمہوری فلسفے کی قبولیت بخشنا اور احترام کرنا ہے۔ یہ میری دانست میں بہت خطرناک بات ہے۔ صرف پُر تناؤ عصبیت اور فرقہ پرست دور سے گذرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اگر ہم اپنے ملک کو ایک جمہوری ملک سمجھتے ہیں تب بھی یہ ایک خطرناک اقدام ہے۔ جب ملک کے مشہور دانشور، عالم اور سیاست داں ساور کر تقسیم پرور، اخراج پر مبنی، عدم برداشت اور فرقہ پرست موقف کو جان بوجھ کر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور مزید پریشان کُن یہ ہے کہ اس موقف کو اپنی خاموشی یا ان کہی تائید سے نوازتے ہیں، تب مجھے خوف آتا ہے ـــــ تمام ہندوستانیوں کے لیے خوف آتا ہے اور ہندوستان کے جمہوری، سیکولر ملک کے بطور مستقبل کے لیے، آنے والے وقت کے لیے، آنے والے دنوں کے لیے حد سے زیادہ خوف آتا ہے"۔

ایک اور فلیش بیک لیتے ہیں۔

سن ۱۹۴۰ء کے اپریل مہینے میں مسلم لیگ ہند کا ایک عظیم اجتماع لاہور میں ہوا جس میں تقسیم وطن کی قرارداد منظور ہوئی۔ مگر اس قرارداد کو اللہ بخش نامی ایک شخص نے جو مسلم لیگ کی ذیلی جماعت آزاد مسلم لیگ کے لیڈر تھے ـــــ نے چلینج کیا۔ قرارداد حق بجانب تھی یا غلط، تقسیم ملک کسی کے مفاد میں تھا یا خسارے میں، وہ میرا موضوعِ سخن نہیں ہے اور نہ ہی مجھے اس موضوع پر کوئی رائے زنی یا تبصرہ کرنا ہے۔ دوقومی نظریے سے ہٹ کر جو بات مجھے کہنی ہے اُس کی طرف آتے ہوئے عرض کرنا چاہوں گا کہ اللہ بخش نے صرف متحدہ قوم پرستی کے نظریے سے قرارداد کی مخالفت کی۔ یہاں پر آسانی کے ساتھ دو انسانوں، دو سوچوں اور دو نظریوں کا بخوبی موزانہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے، اقلیتوں کو

نیست و نابود اور تقسیم کی دراڑ ڈالنے کی بات کرتا ہے اور دوسرا اپنے ہم مذہبوں کی مخالفت اس لیے کرتا ہے کہ وہ ایکتا، اکھنڈتا اور سالمیت پر وشواس رکھتا ہے اور اُسی کی وکالت بھی کرتا ہے۔

سن ۱۹۴۲ء میں ''کویٹ انڈیا موؤمنٹ'' کی قرار داد کانگریس سیشن میں پاس ہوئی جس پر وزیر اعظم برطانیہ ونسٹن چرچل بہت سٹپٹایا اور اُس نے اس قرار داد کی مخالفت میں ایک زبردست بیان دیا۔ اللہ بخش نے نہ صرف برطانوی پارلیمنٹ میں دیے گئے چرچل کے بیان کی مخالفت کی بلکہ ایک خط کے ذریعے اپنی برہمگی کا اظہار بھی کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تب تک اُنہیں حکومت ہند (انگلشیہ) کی طرف سے جو بھی خطابات ملے تھے اُن کو بھی واپس کر دیا۔ اُن تاریخی واقعات و دستاویزات کی طرف آج کس کا دھیان جاتا ہے۔ اللہ بخش کی اُس بیباکانہ جرأت پر سبھاش چندر بوس نے انہیں مبارکباد دی۔ دیگر کانگریشی زعماء بشمول پنڈت نہرو اور مولانا آزاد اُن دنوں جیل میں تھے۔

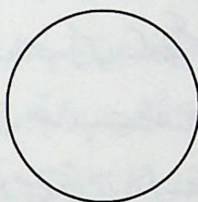
اللہ بخش کے اُس قوم پرستانہ رویے کی پاداش میں سندھ اسمبلی میں اکثریت کے باوجود اُنہیں وزات اعلیٰ کی پدوی سے برخاست کر دیا گیا اور بالآخر ہندوستان کی قوم پرستی کی الم بلند کرتے ہوئے انہیں اپنی جان بھی دینا پڑی۔ سن ۱۹۴۳ء کی چودہ مئی کو انہیں انگریزوں نے لاہور میں قتل کروایا۔ اُن کے قتل کے فوراً بعد لاہور میں ایک سکھ نوجوان نے اُن کی ابتدائی سوانح حیات لکھی۔ جگت سنگھ برائٹ کی کتاب کا پہلا حصہ تھا ''ہندوستان کا قوم پرست نمبر ایک'' انل کمار نوریا نے ''دی ہندو'' میں کچھ عرصہ قبل لکھا تھا:

''اپریل ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے لاہور سیشن میں مسلم علیحدگی پسندگی کو آزاد مسلم کانفرنس کے ذریعے چنوتی دینے کو ہندوستان تقریباً بھلا

چکا ہے۔ اللہ بخش کے زیر صدارت اُس کانفرنس نے برطانوی انتظامیہ
کو ہلا دیا تھا۔ مولانا آزاد نے اُس کانفرنس کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ سیشن اتنا شاندار تھا کہ برطانوی اور برطانوی ہندی پریس بھی، جو کہ بالعموم قوم پرست مسلمانوں کی اہمیت کو کم ہی آنکا کرتی ہے، اُس کو نظر انداز نہیں کرسکی۔ اُن کو یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑا کہ اس کانفرنس نے یہ ثابت کر دیا کہ قوم قرست مسلمان نہ کے برابر عنصر نہیں ہیں''۔

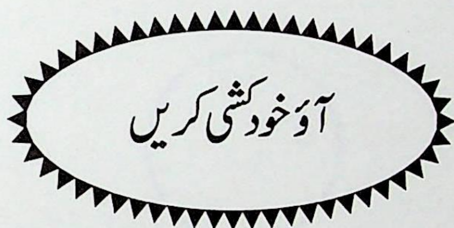
یہ کُل ہند کانفرنس جیسے پنڈت نہرو نے ''ہندوستان کی کھوج'' کتاب میں کافی کامیاب بتایا تھا آج ایک بھولا بسرا واقعہ بن چکا ہے۔ جہاں تک ہمارے بہت تاریخ نویسوں کا سوال ہے جس شخص نے اُس اہم کانفرنس کو منظّم کیا تھا، اُن کے لیے شاید اُس کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ اُس کے برعکس ساورکر جس نے ہندوستانی قوم پرستی سے انکار کیا، جمہوری اقدار سے مُنہ موڑا، حقیقی معنوں میں دوقومی نظریے کی وکالت کی تاکہ ہندوقوم پرستی پر زور دے سکے، اُس کی تصویر ہندوستانی پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں لٹک رہی ہے۔ موجودہ سیاسی جماعتوں خاص کر بر سر اقتدار کانگریس پارٹی کی بابت سنجیدہ سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے کہ وہ لوگ جو کہ بنیادی طور پر ساورکر کے نصب العین کے خلاف ہیں انہوں نے بھی اس بارے میں چُپ رہنے کی ترجیح دی۔ ایک وقت تھا جب کانگریس اپنے اتحادیوں کو متاثر کرتی تھی۔ اللہ بخش کانگریس میں نہیں تھے لیکن اُن کی اتحاد پارٹی سندھ میں کانگریس کے پروگراموں کی قریبی ساتھی تھی کیونکہ اللہ بخش جیسوں کی آوازیں ہندوستان کے اندر یک جہتی کے رجحان کا اظہار تھیں۔ اُن کو نظر انداز کرنے سے ہی ہندوتوا کو بڑھاوا ملا ہے۔ ساورکر کی تصویر یقینی طور اللہ بخش کی بنائی ہوئی جگہ پر نصب کی گئی ہے۔ کیا ایسا کرنا مناسب تھا؟۔ ☆☆



آؤ خودکشی کریں

ہر ایک رات گذاری کچھ اس طرح ہم نے
غبارِ غم کی رِدا درد کا بچھونا تھا

(قمر سنبھلی)


آؤ خودکشی کریں

کہتے ہیں کہ انگلستان کے بادشاہ جارج ہفتم کی لکھنے کی میز پر اور چیزوں کے علاوہ سٹینڈ کے ساتھ ایک چھوٹی سی تختی آویزاں تھی جس پر لکھا تھا کہ انسان کو دنیا میں زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔ دوسروں کی بھلائی، بہتری، دلبری اور دلجوئی سب سے بڑی عبادت اور زندگی کا بہترین مصرف ہے۔ اس لیے بہترین مصرف کے لیے زندگی کو وقف کرنا ہی عقلمندی ہے۔

اگر کوئی شخص مرد عورت، نوجوان لڑکا یا لڑکی پاگل نہ ہو اور جان بوجھ کر موت کو گلے لگائے تو اُس کی خودکشی کا وہ قدم اُس کی دنیاوی زندگی کے انتہائی بدترین اقدامات میں سے اور بدترین جرائم میں گِنا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ خودکشی وہ لوگ کرتے ہیں جو کم عقل اور فلسفۂ حیات یا زندگی کی افادیت سے ناآشنا اور جاہل ہوتے ہیں اور اُسی سبب سے انتہائی قدم اُٹھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ اگر اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو پھر مشہور اور معروف مصنفین جیسے میکسم گورکی، موپاساں، ٹالسٹائی، ارنسٹ، ہمنگیوے، مشہور زمانہ مصور وین گاگ، شاعر چیسٹرٹن، سیاست دان لارڈ کایو، ڈاکٹر وارڈ (کرسچیس کیلر فیم) ٹرومین کے سیکریٹری جیمز فورسٹل وغیرہ وغیرہ سینکڑوں زعماؤں کو کس قطار میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اُن دانشوروں کا وہ اقدام خودکشی کیا جہالت اور کم عقلی کے باعث مانا جا سکتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ بھی ہے کہ مصنفین ہی زندگی سے فرار نہیں بلکہ زندگی کے ساتھ پیار کرنا سکھاتے رہے ہیں۔

چند سال قبل عالمی ادارہ صحت (WHO) کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے ہر ایک لاکھ نفوس میں سے لگ بھگ ۳۵ فیصدی لوگ خودکشی کے مرتکب ہو کر اپنی جانیں گنوا دیتے ہیں۔ مگر یہ ایک تخمینہ ہے، اندازہ ہے جو خودکشی کی واردات کو مد

نظر رکھ کر نکالا گیا ہے۔ اگر اس بارے میں دنیا کے تمام ممالک کا الگ الگ اوسط نکالا جائے تو تناسب بڑھ بھی سکتا ہے۔ انسانی نفسیات کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے کئی اداروں نے اس ضمن میں جو تحقیق کی ہے اُس کے مطابق خودکشی کے کئی اسباب ہیں۔ بکنگھم یونیورسٹی کے ڈاکٹر ہیرنگٹن اور ڈبلیو کراس کے مطابق خودکشی کا ایک اہم سبب ذہنی انتشار (Intellectaal Dessipation) ہے۔ پریشانی، ٹینشن اور ذہنی خلفشار کے اسباب، زندگی کی رنگینیوں کے ساتھ خواہ مخواہ کی نفرت، اقتصادی بدحالی، مفلسی کا کرب، جنسی و جسمانی کمزوریاں، ایک دوسرے کے لیے حسد، نفرت اور امتحانات میں ناکامی ہوسکتی ہے۔ بھارت میں جرمِ خودکشی کے اسباب مختلف بیان کیے گئے ہیں جیسے خانگی پریشانیاں، معاشی بدحالیاں، مرضی کے خلاف شادی، مرد عورت کی عمروں میں فرق، مرد عورت کے درمیان باہمی جھگڑے، ساس اور بہو کے درمیان نااتفاقی اور جہیز کی مانگ وغیرہ۔

خودکشی کے جرم پر تحقیق کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں خودکشی عام طور پر پنکھے کے ساتھ لٹک کر، کنویں میں چھلانگ لگا کر یا اونچائی سے اپنے آپ کو گرا کر، انگلستان میں گلے میں پھندا لگا کر کی جاتی ہے جب کہ امریکہ میں پستول سے مدد لی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ خودکشی کے آسان طریقے گلا یا نس کاٹنا، ٹرینوں کے آگے لیٹ جانا، جراثیم کش ادویات کھانا اور اونچی عمارتوں سے خود کو گرانا وغیرہ بھی ہیں۔ آج سے چند سال پہلے تک جاپان خودکشی کے معاملے میں تمام دنیا میں سب سے آگے تھا۔

کچھ عرصہ قبل تک وادیٔ دلسوز میں لوگ خودکشی تو کیا اس نام سے بھی خوف کھاتے تھے مگر ابھی حال ہی میں بلکہ سابقہ دو سال کے دوران ہوئی وارداتوں سے لگتا ہے کہ لوگ خصوصاً نوجوان لڑکیاں اور شادی شدہ عورتیں اس جرم کی زیادہ

سے زیادہ مرتکب ہو رہی ہیں جس کے وجوہات ذہنی انتشار کم مگر جلد بازی میں لیے گئے انتہائی اقدام اور جذباتی فیصلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ سابقہ بیس سال سے لوگ کافی حد تک ذہنی امراض کے شکار ہو گئے جس کی وجوات پکڑ دھکڑ، اذیت وعقوبت، قتل وغارت گری، حراستی نابودگی، بیگار واستحصال بھی ہے اور غیر محفوظ عفت وعصمت بھی ہے۔ مگر لوگ پھر بھی جیسے تیسے جی رہے ہیں۔ بقول قمر سنبھلی

ہر ایک رات گذاری کچھ اس طرح ہم نے
غبار غم کی رِدا درد کا بچھونا تھا

اخباری بیانات کے مطابق سن ۲۰۰۰ء کے صرف پانچ مہینوں میں ایک سو دس لوگ اِس جرم کا ارتکاب کر کے اپنی جانیں گنوا چکے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ماہ بائیس نفوس نے خودکشی کی اور اُس کے بعد سے اب تک سابقہ گیارہ برسوں میں یہ تعداد ہزاروں ہوگئی ہے۔ زندگی سے بڑھ کر انمول شے کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ پتہ نہیں یہ لوگ اتنا بڑا دل گردہ کہاں سے لاتے ہیں جو اپنی زندگی کو لمحوں میں تلف کر دیتے ہیں۔ ایسا انتہائی قدم اُٹھانے کے لیے واقعی بہت بڑے حوصلے اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔

وادی میں خودکشی کرنے والوں میں سے اکثر بیشتر (لگ بھگ نوے فی صد) نے پھلوں پر چھڑکنے والی جراثیم کُش ادویات سے اپنے آپ کو ختم کر دیا جب کہ مذکورہ تعداد سے دوگنی تعداد کو بروقت طبی امداد سے بچا لیا گیا۔ یہ ایک لمحہ فکریہ ہے اور بڑھتی ہوئی اس حرام موت کے بارے میں سنجیدہ ذہن اپنا کر اس گھمبیر مسئلے کا حل تلاش کرنا ناگزیز بن گیا ہے۔ دیہات میں رہنے والے حضرات کو اس طرف خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ خودکشی کی وارداتیں دیہات میں پچانوے

فی سے زیادہ وقوع پذیر ہو جاتی ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایسی بھی کیا لٹرمستی کہ سمِ قاتل پیکٹوں یعنی جراثیم کش ادویات کے پیکٹوں کو تمباکو، نسوار کی پڑیاؤں کی طرح بے احتیاطی کے ساتھ گھر میں اِدھر اُدھر پھینکا جاتا ہے اور منتشر ذہن، جھگڑا، امتحان میں ناکامی کے وقت، غصہ یا جلد بازی میں جذباتی فیصلہ کرنے والے نفوس کو ایک آسان اور دستیاب موت فراہم کی جاتی ہے۔ یہ معاملہ اُس وقت اور بھی سنجیدہ رُخ اختیار کر لیتا ہے جب آئے دن کے واقعات نظروں کے سامنے رو بہ عل ہونے کے باوجود بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر کوئی بھی مثبت قدم نہیں اُٹھایا جاتا ہے۔ بدحتیاطی کے سبب یہ جراثیم کش ادویات کے پیکٹ، بوتلیں، کنستر وغیرہ کھانے پینے کی چیزوں میں بھی مِکس اپ (mixup) ہو سکتے ہیں۔ بچے بھی بچگانہ حرکت کر سکتے ہیں اور اگر یہ ادویات چوہوں نے کھالیے اور گھر کے اندر ہی مر گئے تو اللہ بچائے وباء بھی پھیل سکتی ہے۔ اس لیے اتنی نازک اور خطرناک اشیاء کو بڑی احتیاط اور مناسب ڈھنگ سے محفوظ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ نے اس بات کا مشاہدہ نہیں کیا ہے کہ جب سے پھلوں پر جراثیم کش ادویات کا سپرے (spray) بڑھ گیا ہے کتنے ہی سُریلی بولیاں بولنے والے نایاب و نادر، خوش رنگ و نازک پرندے غائب ہو گئے ہیں اور ایک ننھی سی جان گوریا جسے عرفِ عام میں چڑیا کہا جاتا ہے، نابود ہو رہی ہے۔ جب ایسی ادویات درختوں پر چھڑکنے سے پرندے نابود ہو سکتے ہیں تو گھر میں بداحتیاطی سے رکھنے پر وہ انسانی زندگی کے لیے کس قدر آسان موت کو دعوت دے سکتی ہے، اُس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ویسے بھی کسی خوش فہمی میں رہنے کی حاجت نہیں ہے۔ نقلی اور غیر معیاری ادویات، ملاوٹ والا تیل، گھی، چائے اور مصالحہ جات کے شکار تو ہم پہلے سے

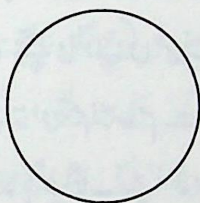
ہیں۔ دوسرا ستم یہ ہے کہ وہ جراثیم کش ادویات جو پھلوں کے درختوں پر چھڑکی جاتی ہیں، وہ بارش کے پانی کے ساتھ مل کر پینے والی پانی کے ساتھ مل جاتی ہیں، کچھ پانی کھیتوں میں چلا جاتا ہے اور پودوں میں مل کر ہمیں اناج اور سبزیوں کی شکل میں پھر واپس مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سابقہ لگ بھگ تیس سال سے ہر گھر میں مختلف بیماریاں اپنا آسن لگا کر بیٹھی ہیں۔ معدہ، انتڑیوں اور ہڈیوں کی بیماریوں سے کون سا گھر خالی ہے۔ ساری دنیا میں صرف وادیٔ کشمیر ہی ایسی جنت نما جہنم ہے جہاں ٹنوں کے حساب سے ادویات استعمال ہوتی ہیں۔ سکمز کے کنووکیشن میں پڑھی گئی رپورٹ کے مطابق ہر دن چالیس نئے کینسر کے مریض ہسپتال میں رجسٹرڈ ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی غیر تسلیم شدہ اور غیر معتبر دواساز کمپنیاں بھی یہاں پٹری پر مال بیچنے والوں کی طرف ارب پتی بن کر واپس لوٹتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ معمولی تعلیم یافتہ اور علم اجسام سے بے بہرہ ایسے نوجوان جن کی پتلون اتنی آزاد ہوتی ہے کہ ذرا سا ہاتھ لگانے پر ''قامت درازی کا بھرم ٹوٹنے'' کا اندیشہ رہتا ہے بھی ________ میڈیکل ایجنٹ ہیں اور سب اپنے ہی لوگوں کی ہڈیوں پر اپنا محل کھڑا کر لینے کے آرزومند رہتے ہیں، یہ سوچے سمجھے بغیر کہ

دُعا تو مانگ رہے ہو تم آندھیوں کی مگر
تمہارا گھر بھی تھپیڑوں کی زد میں آئے گا

(قمرؔ سنبھلی)

ان حالات میں، میں سمجھتا ہوں کہ اب خودکشی کا رجحان گھٹ جائے گا کیونکہ لوگ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار کر خود ہی اپنی موت کا سامان کر رہے ہیں۔ جب موت آسان بن گئی تو خودکشی کی کیا ضرورت ہے۔

☆☆☆



اُوس کی بوندیں

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیزار
دل کا کیا رنگ بھروں خونِ جگر ہونے تک

(غالبؔ)

اُوس کی بوندیں

دین اسلام کے خلاف جب بھی کوئی سازش ہوتی ہے یا کوئی نیا فتنہ کھڑا کیا جاتا ہے تو اُس کا تدارک اُس کے خلاف صف آرائی بہت جلد بلکہ اُسی وقت ہونی چاہیے۔ ایسا ہی ہم نے اپنے سلف صالحین سے سیکھا ہے۔ مثال کے طور پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل مکانی کے ساتھ ہی جھوٹے مدعیان نبی پیدا ہوئے جن میں ایک عورت بھی نسوانی نبی ہونے کی دعویدار تھی۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فوراً سے پیشتر تلوار میان سے نکال ک فتنے کا تدارک کیا اور دشمنانِ دین کی سرکوبی کر کے اُس خلفشار کو فرو کیا۔ اُس کے بعد زکوٰۃ ادا نہ کرنے کا فتنہ وجود میں آیا تو صاحب موصوف نے منکرین کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت جانور رسی سے بندھا آتا تھا تو میں وہ رسی بھی وصول کر کے رہوں گا۔ انیسویں صدی کے اواخر پر جب یہودیوں نے خلافت کے خلاف خباثت کا ڈھول بجانا شروع کیا تو تمام مسلم دنیا میں لاوا پھوٹ پڑا حتیٰ کہ غیر منقسم برصغیر میں خلافت موؤمنٹ نے جنم لیا اور احتجاج شروع کیا۔ گرچہ یہود اپنی شرمناک سازش میں کامیاب ہوئے مگر بہر صورت احتجاج ہوا اور مخالفت ہوئی۔ برصغیر ہی میں جب احمدیہ موؤمنٹ وجود میں آ گئی تو ہمعصر جید عالم دین حضرت ثناء اللہ امرتسری ایک دم ارتداد کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ اسی طرح موجودہ وقتوں میں جو بین الاقوامی لیول کی سازش کے تحت نصاریٰ نے زر کی تھیلیاں کھول کر نادان، نافہم اور مجبور نام نہاد مسلمان نوجوانوں کو روپے پیسے، شادی اور نوکری کی لالچ دے کر بہکانا شروع کیا ہے، اُس کے لیے جم کر احتجاج اور مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ارتداد کی یہ بُرائی شروع ہوتے ہی عدم کے راستے کی راہی ہو کر سازشوں کے مُنہ پر تھوکنا شروع کر دے۔

رب الکریم نے قرآن حکیم میں مرتد کے لیے حکم ربانی میں ارشاد کیا ہے کہ جو اسلام کو ترک کر کے دوسرا غیر فطری یا متروک طریقہ اپناتا ہے اُس کے لیے دونوں جہاں کی رسوائی ہے اور نیکیاں بھی اُس کے کام نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں ہی کام آئیں گی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایسے عناصر کے لیے قتل کا حکم فرمایا ہے۔ یہاں اس بات کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ ارتداد فقط اسلام چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ فرض تو فرض اگر کوئی اسوۂ حسنہ یا سنتوں کا انکار کرے وہ بھی اُس زُمرے میں آتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اگر کوئی خدائے رحمان پر بھی ایمان رکھتا ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صادق المصدوق مانتا ہو مگر صرف ایک سُنت کو نہ مانتا ہو، پردے کی مخالفت کرتا ہو، داڑھی رکھنے پر پھبتی کستا ہو، برقعہ یا تعلیم اسلام کو عورت کی ترقی اور آزادی کا روڑہ سمجھتا ہو یا دیگر ایسے ہی مخالف دین شیطانی خیالات کو پال رہا ہو، اظہار کر رہا ہو، عملا رہا ہو یا فقط من میں اس طرح کی کوئی خواہش رکھتا ہو، وہ بھی بلاشک وتردّد ارتداد کا شکار ہے۔ ایسا نہ میرا کہنا ہے نہ کسی کی ذاتی رائے پر محمول ہے بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں یہ علمائے دین اور اکابرین عظام کا ماننا ہے، اُن کا دین ہے اور اُن کا ایمان ہے۔

استدراج وارتداد کے لیے محدثین عظام اور علمائے کرام نے کئی وجوہات بتائیں ہیں جن میں خاص طور پر جہالت یعنی دین سے دوری اور ناواقفیت، روپے پیسے کی لالچ، ملازمت، مصاحبت، امارت، بادشاہت اور آج کل کے زمانے میں طرحدار لڑکی کے ساتھ شادی، بدلیش میں اچھی نوکری، بزنس جمانے کے لیے مدد ____ اُجول کیریئر، روشن مستقبل بھی وعدہ اغیار کی شقیں ہیں۔ علمائے سلف نے ایک وجہ پیار ومحبت اور عشق کا باوراپن بھی بتایا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال ہم موخر الذکر وجہ ناعاقبت اندیشی پر بات کرتے ہیں کیونکہ موجودہ وقتوں میں

یہ وباء زوروں پر ہے۔

علامہ عبدالرحمان ابن الجوزی نے اپنی کتاب 'زم الھویٰ' میں اس سلسلے کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ حوالے کی تفاصیل کو اپنے الفاظ میں ڈال کر عرض کرنا چاہوں گا کہ بغداد میں کسی وقت صالح المقلب بہ مؤذن کے نام کا ایک شخص چالیس سال تک متواتر ایک مسجد میں اذان دیتا رہا۔ ایک دن وہ حسب معمول مسجد کے مینار پر اذان دینے کے لیے چڑھ گیا تو شومیٔ قسمت ناگاہ اُس کی نظر پڑوس کے ایک نصرانی کے گھر کی طرف بھٹک کر گئی۔ اُس گھر کے اندر اُس نے ایک حسین وجمیل نصرانی لڑکی دیکھی جس کو دیکھتے ہی مؤذن صالح ریشہ خطمی ہوگیا۔ صاحبِ کتاب کا فرمانا ہے کہ یہ معلوم نہ ہوسکا اُس نے اُس وقت کی اذان دی یا بغیر اذان دیے مینار سے اُتر آیا۔ وہ سیدھا جا کے نصرانی کے گھر میں گھُس گیا اور دیکھی ہوئی اُس لڑکی سے دلبری اور دلرُبائی کا مطالبہ کرنے لگا۔ لڑکی نے کہا بہتر ہوگا کہ اس وقتی لطف اندوزی کی بجائے ہم دائمی عیش کوشی کے لیے ہم اپنا من بنائیں اور وہ طرزِ زندگی اختیار کریں۔ میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں مگر شرط صرف اتنی سی ہے کہ تم کو اپنے دین سے دستبردار ہونا پڑے گا تب ہی دائمی وصل کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ کہو کیا ارادہ ہے۔

صالح چونکہ عشق میں دیوانہ ہو چکا تھا اس لیے اُس نے بغیر کسی تامل کے کہا، جو کچھ خدا نے نازل کیا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کے سامنے رکھا، میں سب کے لیے انکار کرتا ہوں۔

عیسائی لڑکی کے دل کی کلی کھِل اُٹھی مگر شاطر تھی اس لیے کہنے لگی، ٹھیک ہے لیکن مجھے کچھ اطمینان نہیں ہوا۔ سور کا گوشت کھا کر اپنے چیلنج کو ثابت اور عشق میں وفا اور ثابت قدمی کی گواہی دینا ہوگی۔ اُس پر صالح نے بلا تاول سور کا گوشت زہر

مار کیا۔ مگر اس کے باوجود بھی لڑکی ڈانواڈول ہی رہی۔ وہ صالح کو بناوٹی عشق اور جھوٹی اپنائیت کی آڑ میں پوری طرح تلملا اور تڑپا رہی تھی۔ اُس نے پھر کہا، دل کو ابھی بھی پوری تسلی نہیں ہوئی۔ کیا کروں یہ دل بھی عجیب وساوس اور شبہات کی آماجگاہ ہے، مجھے اپنی زندگی کا سودا کرنا ہے۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے عشق ہوگیا ہے تو تم کو مئے ناب سے بھی شغل مے نوشی کر کے دکھانا ہوگا۔ جام حاضر ہے بس ہاتھ بڑھ کا سرشاریٔ عشق میں پائے استقلال دکھانے کی دیر ہے۔ صالح کی ناک کی نکیل پوری طرح لڑکی کے روپ میں شیطان کے ہاتھ میں آچکی تھی، اُسے بھلا کیا انکار ہوسکتا تھا۔ اُس نے بلا تامل جام پر جام چڑھائے۔ جب لڑکی نے دیکھا کہ صالح پوری طرح سے دُھت ہوکر ہوا کے دوش پر سوار اپنے تن ومن سے بے خبر ہوچکا ہے تو اُس نے ایک شیطانی قہقہہ لگا کر اُس پر آخری ناوک اندازی کی۔ اُس نے بڑے شاطرانہ انداز سے کہا:

'اب مجھے پوری طرح سے اطمینان ہوگیا ہے کہ تم پیار میں ثابت قدم رہوگے۔ تم نے میری خاطر ''قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا'' کر ''کاسہ لیسی'' کی اور ''ترک اسلام'' بھی کیا۔ اب ٹھیک ہے میں صرف تمہاری ہوں۔ میرا باپ باہر گیا ہوا ہے، کچھ دیر میں لوٹ کر آئے گا تو ہماری شادی کرا دے گا۔ تم ذرا دیر کے لیے چھت پر ٹہل کے آؤ۔ چہل قدمی سے تمہاری طبیعت بحال ہوجائے گی اور مزید غور کرنے کا موقعہ بھی ملے گا'۔

اب لڑکی آگے کیا کرنے والی تھی یا اُس کے ارادے کیا تھے، اُس س قطع نظر صالح کوٹھے یعنی چھت پر چلا گیا اور جھوم جھام کر ترنگ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور کوٹھے پر سے نیچے ،گر کر مر گیا۔ کچھ دیر کے بعد لڑکی کے باپ نے آکر اُس کی لاش کو اُٹھا کر سڑک پر پھینک دیا۔

مسجد سے وابستہ علاقے کے لوگوں کو حالات سے واقفیت ہوئی تو انھوں نے ایک گندگی کا ڈھیر تلاش کر کے صالح کی لاش کو اُس پر پھینک دیا۔ چلیے خس کم جہاں پاک۔

نادانی، کوتاہ اندیشی اور جلد بازی میں چالیس سال اذان دینے والے ایک موقر و معظم موٴذن نے جھوٹے عشق کے ہاتھوں بُرباد ہو کر اپنی زندگی کے علاوہ اپنا دین وایمان اور دنیا و عقبیٰ اس طرح سے گنوادیا کہ ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے

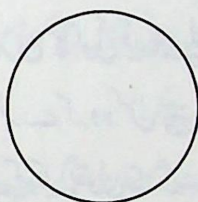
میں نے مندرج بالا واقعہ تفنن طبع کی خاطر نہیں بلکہ عبرت حاصل کرنے کے لیے بیان کیا۔ تاکہ اِس طرح کا کوئی فیصلہ لینے سے قبل صراطِ المستقیم سے بھٹکنے والا بندہ سوچے، غور و فکر کرے کہ وہ کس چیز یا کس مقصد کو پانے کے لیے اپنے دین و دنیا کا سودا کر رہا ہے کیونکہ بقول علامہ

بُلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

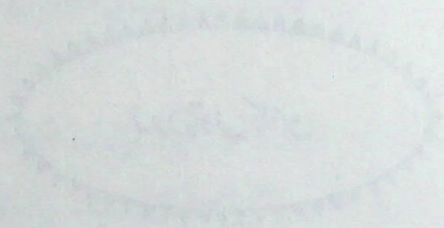
حسین عورتیں بھی صرف ''سرخ وسفید مٹی کی مورتیں'' ہوتی ہیں اور جب ''ستارے چراغاں بالائے سر'' کرتے ہیں تو موئے ابیض، کمان کمر، جھری دار چہرہ، پوپلا مُنہ اور لاٹھی کی ٹِک ٹِک سے دن میں ہی تارے نظر آنے لگتے ہیں اور بھٹک کر ہوش میں آنے والا پھرلا حاصل اور بے مقصد دہائیاں دینے لگتا ہے ؎

______ ہائے ______ ہائے
آنکھوں کا تھا قصور چھُری دل پہ چل گئی



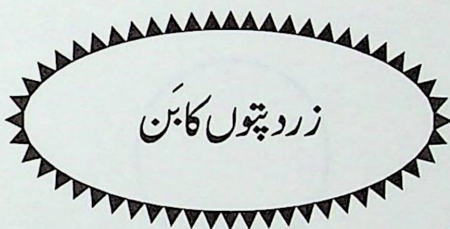


زرد پتوں کا بَن



قتل و خوں کے دوسرے دن یہ پڑھا اخبار میں
آج کل اس شہر میں ہر ایک بشر محفوظ ہے

(اخلاق سہسوانی)


زرد پتوں کا بَن

''ژاس'' کشمیری زبان کا ایک لفظ ہے۔ چونکہ کشمیری زبان کے ساتھ واقفیت رکھنے والے ہمارے قارئین اس لفظ سے واقف ہیں اس لیے غیر کشمیری قارئین کو بتانا ضروری ہے کہ ''ژاس'' ایک کشمیری لفظ ہے، ایک سیدھا سادہ مفرد لفظ جو نہ ہی مرکب ہے اور نہ ہی جس میں کوئی پوشیدہ معنی چھپا ہوا ہے۔ ''ژاس'' کھانسی کو کہتے ہیں۔ البتہ یہ دُرست ہے کہ کھانسی کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس لفظ میں کوئی گُھتی یا اسرار چھپا ہوا نہیں ہے مگر یارانِ نکتہ دان اور دلبرانِ بذلہ سنج اس لفظ کو کبھی کبھی یا خاص خاص موقعوں پر بحیثیت اصطلاح کے بھی استعمال کرتے ہیں اور ماڈرن کشمیری تہذیب میں اس اصطلاح نے اپنی انفرادی طرح ڈال دی ہے۔

''ژاس'' ایک معصوم سا سہ حرفی لفظ ہے مگر یہ حرف جتنا معصوم اور بے ضرر دکھائی دیتا ہے نکتہ دانوں کے لیے اُتنا معصوم نہیں ہے۔ یہ اپنے اندر مرض کے علاوہ ایک ہنگامہ خیز اور انقلابی مادہ بھی رکھتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لفظ اچھے خاصے اور کھاتے پیتے گھرانوں میں نفاق کا باعث بنتا ہے۔ اب اِسی بات کو لیجیے کہ ہر گھر میں ایک دو بوڑھے ہوتے ہی ہیں، کبھی میاں بیوی اور کبھی دو میں سے ایک۔ وہ اپنی جوانی میں سمو کر رہے ہوں یا نہ رہے ہوں مگر بڑھاپے میں چونکہ قویٰ اور اعضاء کمزور اور انجر پنجر ڈھیلے ہونے کے ساتھ دل، جگر، معدہ، پھیپھڑا، مثانہ وغیرہ بغاوت کرنے کو اپنی عمر کی پختگی اور بڑھاپے کا جائز حق مانتے ہیں اس لیے دیگر عارضہ ہائے جان کے علاوہ ایک بوڑھا کھانسی کو اپنی نجی شناخت تصور کر لیتا ہے مگر ایم اے پاس دلہن یا دلہنوں کو یہ دن کا دادرا اور رات کی ٹُھمری پسند نہیں آتی ہے، اس لیے وہ اپنے دُلہوں کو آمادہ بہ احتجاج کر لیتی ہیں اور نتیجے کے طور پر بڑے بیٹے کو

دیکھتے دیکھتے چھوٹا بیٹا بھی ''خانہ زادہ زلف'' ہوکر ''زنجیر سے نہیں گھبراتا'' اور سانجھے چولہے سے نکل کر الگ سے تنور بنا کر روٹی سینکنا شروع کر دیتا ہے اور مزے سے آزادانہ فضاؤں میں کھانسی کی کریہہ آواز سے دور اپنی ایک الگ دنیا بسا لیتا ہے۔ جہاں راوی وقتی طور چین کی بنسری بجا کر چین ہی چین لکھتا ہے۔ مگر کبھی کبھی کسی گھر میں ''جوئے شیر'' لانے کے لیے پہاڑ نہیں کاٹنا پڑتا بلکہ فرہاد کا تیشہ چلے بغیر ہی ''جوئے شیر'' گھر میں داخل ہو جاتی ہے۔ اُس موقعہ پر کشمیری محاورہ عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ '' بُڈ ﮦ تہٕ موٗ ی تہٕ ژاس تہٕ موکلاے'' یعنی بوڑھا بھی مر گیا اور کھانسی بھی ختم ہوگئی۔ ایسی صورت حال جب پیدا ہو جاتی ہے تو گھر خوشیوں سے بھر جاتا ہے اور دلہن کی بہنیں اور سہیلیاں اُسے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ چپکے سے مبارکباد بھی دے دیتی ہیں۔ مگر اُس وقت وہ خوشیاں منانے والے نادان یا ایم اے پاس دلہنیں اور اُن کی ہمجولیاں اور بہنیں وغیرہ یہ بات بھولے سے بھی خیال میں نہیں لاتی کہ ایک دن یہ صورت حال اُن کے ساتھ بھی پیش آنے والی ہے جب سفید دھوپ بالائے سر جگمگاتی ہے تو پھر گارنیر اور امپورٹیڈ خضاب بھی بالوں کی سفیدی چھپانے سے قاصر رہتے ہیں اور داڑھی، سر کے کنارے اور مانگ تو ہر دوسرے تیسرے دن چغلی کھانے لگتے ہیں۔ ویسے میں کوئی عالم یا واعظ تو نہیں مگر بزرگوں سے یہی سُنا ہے اور کتابوں میں بھی پڑھا ہے کہ بالوں کو کالا کرنے والوں کو جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہوگی۔ ہاں بالوں کو مہندی سے رنگنا بہر حاصل ایک استثنیٰ ہے۔

جیسے میں نے آگے ہی عرض کیا کہ یارانِ نکتہ دان اس لفظ کو اصطلاحی انداز سے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اُس کو ہم ژاس کا جمالیاتی روپ بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ روپ یا یہ پہلو زیادہ تر ایوانِ بالا اور حاکمانِ بست وکشاد کے پاس واضح روپ

سے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جب کوئی بہت سنجیدہ معاملہ وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ کوئی ظلم و ناانصافی یا استحصال کا معاملہ درپیش ہوتا ہے تو ایک دم سیکورٹی ایجنسیوں کو متحرک کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی ٹیم تشکیل دی جاتی ہے۔ انکوائری کرنے کے لیے افسر مقرر کیا جاتا ہے۔ دو چار بیانات جاری کیے جاتے ہیں اور بڑی گرما گرمی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ انکوائری افسر کی طرف سے گواہی گذارنے پر زور دیا جاتا ہے۔ دو چار دن یا ہفتے عشرے کے اندر جب لوگوں کا غصہ کم اور جذبات کو ہر مکھی یا گلمرگی ہوا کی لہر ٹھنڈا کر دیتی ہے تو انکوائری افسر فائل کو محافظ خانے میں جمع کراتا ہے اور اُدھر سے سرکار معاملے پر بڑی مہارت کے ساتھ 'ژاس' کرتی ہے اور ایک خوبصورت سا سٹیر یوٹائپ بیان داغ دیتی ہے کہ مقتول دہشت گرد تنظیم کا فعال اور سرگرم رکن تھا۔

اب اِسی بات کو لیجیے کہ نویں جماعت کی ایک طالبہ ایک معصوم اور کمسن بچی کی ہندوارہ میں دن دہاڑے آبروریزی کر کے قتل کر دیا گیا۔ تب سے اب تک تو کافی دن ہو گئے۔ اُس اندوہناک بربریت پر زمین و آسمان نے گریہ کیا، شہروں نے رویا، گاؤں نے آنسو بہائے، سکولی بچوں نے آہ وزاری کی۔ جس نے سُنا سینہ کوبی کرنے لگا۔ قاتل درندوں میں سے ایک ریاستی اور دوسرا غیر ریاستی تھا۔ تابندہ غنی کی روح سالہا سال سے آہ و فغان کر رہی ہے، اُسے انصاف کب ملے گا، ملے گا بھی یا نہیں، اُس کی کوئی گارنٹی نہیں کیونکہ ہر سنجیدہ معاملہ پر جب 'ژاس' ہی ہوتی ہے تو راوی ہر طرف امن وسکون ہی لکھتا ہے۔ بقول اخلاق سہسوانی ؎

قتل و خوں کے دوسرے دن پہ پڑھا اخبار میں
آج کل اس شہر میں ہر ایک بشر محفوظ ہے

قطع نظر اس کے لطف کی بات یہ ہے کہ ہم لوگ آج بھی کھیت کھلیانوں پر

اور پھلوں کے باغوں میں اپنی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ہاتھ غیر ریاستی مزدوروں کو چائے کھانا بھیج دیتے ہیں، یہ جان کر بھی کہ ہماری کتنی لڑکیاں آج ہندوستان کے مختلف گاؤں میں گگریا اٹھا کر کنویں پر پنیاں بھرن کو جاتی ہیں اور کھیتوں میں بوائی، نلائی، کٹائی، چھٹائی بڑے آرام سے کرتی ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا کرالہ ٹینگ ہندوارہ میں فوج کے ایک کیپٹن نے دس سالہ معصوم بچی کو آبرو باختہ کیا۔ دو چار دن بڑی گرما گرمی رہی۔ 'برف کے بوجھ تلے دبی شاخ' میں آتشِ چنار بھڑک اُٹھا۔ حکومت کی حزبِ اختلاف نے تو وہاں خیمے ہی گاڑ دیے۔ ہر طرف جلسے جلوس اور ہاہا کار مچی۔ مگر آخر میں نتیجہ یہ نکلا، وہی ڈاک کے تین پات۔ اُس درندے کو ننگا نہیں کیا گیا۔ اُسے قرار واقعی سزا نہیں ملی۔ مگر ملتی بھی کیسے۔ وہ تو فاتح قوم کا ایک با اختیار عساکر تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں آگ و آہن برسانے والی بندوق اور دوسرے ہاتھ میں افسپا کا کالا علم تھا مفتوح کے لیے کوئی راحت نہیں ہوتی۔ اُس کے لیے فقط بیگار، ڈنڈا، عزت نفس کی پامالی اور آخر میں ''مرگِ مفاجات'' ہوتی ہے۔ انصاف کا لفظ مفتوح کی ڈکشنری سے حذف کیا جاتا ہے۔ یہی ہم نے دیکھا ہے، یہی ہم دیکھتے آرہے ہیں۔ آخرش اُس معاملے پر بھی ''ٹراس'' کی گئی اور وہ معاملہ بھی دفتری اور عدالتی طوالت کی وجہ سے ''سرد خانے'' میں نیند لینے چلا گیا۔ مارک ٹوین کا کہنا ہے کہ سچ چلنے کے لیے جب تک جوتے پہنے، جھوٹ آدھی دنیا کا چکر کاٹ سکتا ہے اور اُسی طرح ایک کہاوت ہے کہ عدالتوں سے انصاف حاصل کرنے کے لیے تین چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ عمر نوحؑ، گنج قارون اور صبرِ ایوبؑ۔ بہر حال اس معاملے پر بھی لوگ بھاگ پھر اپنی اپنی دلچسپیوں میں کھو گئے اور معاملہ آیا گیا ہو گیا۔ کیا امت مسلمہ کی اور وہ بھی ایک معصوم نابالغ بچی کی عفت و عصمت اتنی ستی ہو گئی ہے۔

(۲)

افسوس ہے قوم کے اُن حاکموں اور سربراہوں پر جو اسلامی وضع قطع اختیار کر کے محفلوں، ایوانوں اور جلسوں میں بڑی لمبی چوڑی تقریریں کرتے ہیں، بڑی لچھے دار باتوں سے سامعین کو خوابوں کی دنیا میں لے جاتے ہیں، آستانوں پر حاضری دیتے ہیں، مزاروں پر فاتح خوانی کے لیے جاتے ہیں اور ہمیشہ ''قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں''۔ مگر قوم کی نیا کیسے ڈوبتی ہے اُس کا صرف نظارہ کرتے رہتے ہیں۔

شوپیاں کی دو لڑکیوں کو کس نے بے عزت کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چلو مان لیتے ہیں کہ ریگولر آرمی کے جوانوں نے نہیں۔ سی آر پی ایف کے جوانوں نے یہ فعل شفیع کیا، انہوں نے بھی نہیں، لوکل پولیس کے اہلکاروں نے کیا۔ انہوں بھی نہ سہی گاؤں کے لڑکوں نے کیا۔ انہوں نے بھی نہیں تو بدیسی مزدوروں نے کیا۔ آخر کیا تو کسی نے ہے۔ کیا لڑکیاں خود اپنی عزت لوٹ کر خود ہی مر بھی جاتی۔ جس نالے کے کنارے سے اُن کی لاشیں برآمد ہوئی تھیں اُس سے تو چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جانے کی مثال سچ ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ وہاں صرف ایک انگلی کے برابر پانی تھا۔ کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ آخر قاتل کون ہے لوگ جانتے ہیں اور اُس کے ساتھ قوم کے وہ خیر خواہ اور غمگسار بھی جانتے ہیں مگر کیا کر سکتے ہیں، کر ہی نہیں سکتے۔ ضمیر کُرسی کے بوجھ تلے دب چکا ہے۔ جذبات نوٹوں کی گڈیوں کے سایے تلے دفن ہیں اور انسانیت عیش و عشرت کی قبا میں ملبوس ہو کر چمچماتی موٹر گاڑیوں کی آرام دہ اور گداز نشستوں پر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہے وہ بیچارے کیا کریں۔

بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

راز پر تو کیا بلکہ گھناؤنے فعل شیطانی اور مکروہ پُشت پناہی پر پردہ پڑا ہوا ہے اور وہ پڑا ہی رہے گا، کیونکہ مجرموں کو، فاجر قاتلوں کو کیونکر بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔ کیا مور کے پر لگی اور ڈبل ڈیکر ٹوپیاں اوندھی نہیں ہو جاتیں۔ کیا بھرم نہیں کھل جاتا ''قاتل کی قامت درازی کا''۔ ان حالات میں بے بس قوم کی کسمپرسی دیکھ کر شاعر کو اپنا گریباں پھاڑنے کے سِوا اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا ہے

منصف کے آستیں میں ہے خنجر چھُپا ہوا
انصاف کرنے والا ہی قاتل ہے آج کل

ابھی حال ہی میں فوج کے دو سپاہیوں نے ایک شادی شدہ لڑکی کو اغوا کر کے دو دن تک اُس کی عزت کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ پہلے پہل تو بہت شور شرابہ ہوا، جلسے جلوس ہوئے، ہڑتالیں ہوئیں، اخباروں میں صحیح صورت حال پیش ہوئی اور ہر ایک نے اپنے اپنے حدود میں رہ کر حسبِ معمول خون کے آنسو بہائے۔ مگر کچھ ہی دنوں کے اندر فوج نے اپنے افسپا کے ووٹ کا بلکہ ٹرمپ کارڈ کا استعمال کر کے مغویہ کی ساس اور شوہر کو بندوق کی نوک پر اور کچھ لالچ دے دلا کر بلکہ دھاڑ امار کر اُن سے ایسے بیان دلوائے جن سے مغویہ کی عفت و عصمت ایک مذاق بن کر رہ گئی اور اُمت مسلمہ کی ایک اور بیٹی کی آبرو کی جھولیں دھول میں بکھر کے رہ گئیں۔ خیال کرنے کی ضرورت ہے کہ گجر پٹی، بستی یا آبادی جہاں آدھے کلومیٹر کے بعد ایک کوٹھا یا گھر آباد ہوتا ہے۔ جہاں بجلی، پانی، سڑک وغیرہ کی کوئی بھی سہولیت دستیاب نہیں ہوتی ہے۔ جہاں کے مکین روز کنواں کھود کر پانی پیتے ہیں۔ مطلب جان جوکھوں کی زندگی ہے اُن کی، جہاں دس کلو مکی پیسنے کے لیے اُنہیں

میلوں چل کر گراٹھ تک جانا پڑتا ہے۔ وہاں کیا ہوتا ہوگا خود اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے، کچھ بھی کیا جاسکتا ہے، کچھ بھی کرایا جاسکتا ہے، کچھ بھی منوایا جاسکتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اِس معاملے پر بھی آخرش ''ژاس'' ہی کی گئی، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں جموں میں بھی ایک سپاہی نے راجستھان کی ایک طالبہ کو صرف دھوکہ دیا، اُس کی عزت کے ساتھ کوئی اتیا چار نہیں کیا، اُس معاملے پر سارا ملک ہل کے رہ گیا اور اُس عسا کر کو با قاعدہ کفیر کردار تک پہنچایا گیا۔ اُس معاملے پر نام نہاد ''قومی پریس'' اگر چیخ و پکار کر رہا تھا تو کشمیر کے معاملے پر کان کیوں بہرے اور ہاتھ اپاہج ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے غور کرنے کا مقام ہے کہ ہم کیا ہیں اور کیا ہماری بساط ہو کے رہ گئی۔

ابھی تازہ ترین حال حال ہی میں سوپور کے جوانِ رعنا ناظم رشید کا ہی معاملہ دیکھیے ۔ اُس کے بعد پلوامہ کے نوجوان کی مرگِ مفاجات کے معاملے پر غور کریے تو آپ کو پہلے رونا آئے گا کیونکہ قوم کی بڑے طرحدار اور میٹھے انداز کے ساتھ نسل کشی کی جارہی ہے۔ اُس کے بعد ہنسی بھی آئے گی کیونکہ اس معاملے میں استغاثہ اور مستفیث ایک ہی شخص ہے۔ اب مجرم کون ہے اور قاضی کون ہے۔ کون دعویٰ دائر کرے گا اور کون انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے گا۔ کیا اس بارے میں کچھ حتمی طور پر کہا جاسکتا ہے۔ البتہ اس بارے میں یہ ہم برملا کہہ سکتے ہیں کہ ۔

قافلے وہاں کیسے گذریں سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن و راہنما ایک ہی شخص

اور جیسا کہ دنیا جانتی ہے کہ اس معاملے پر بھی ''ژاس'' ہی کی گئی۔ گذشتہ سال کے ستمبر، اکتوبر مہینوں کے چند روزہ اسمبلی سیشن میں کچھ عوام سے متعلق، کچھ تعمیر وترقی سے متعلق اور مجموعی طور پر ریاست سے متعلق امورات پر غور وفکر ہونا

تھا۔ مگر دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی اخباروں اور ریاست سے شائع ہونے والے مختلف اخباروں سے معلوم ہوا کہ ممبران اسمبلی نے ودھان کی ضمانت یعنی جمہوریت کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ شور و ہنگامہ برپا کر کے، چیخ و پکار میں یہ معلوم نہیں پڑتا تھا کہ کون کیا گوہر فشانی کر رہا ہے یا کر رہی ہے۔ عوام کے چُنے ہوئے نمائندے جو ماشاء اللہ پڑھے لکھے بھی ہیں اور دو دو منزلہ ٹوپیاں اور پھولے ہوئے صافے بھی پہنتے ہیں نے عوامی معاملات اور عوامی مفادات کی خوب مٹی پلید کی۔ اختلافات اس قدر ہنگامہ خیز ثابت ہوئے کہ لگ رہا تھا کوئی سٹنٹ اور مار دھاڑ والی ہندوستانی فلم کی شوٹنگ یا نمائش ہو رہی ہے۔ کیا نظارہ رہا ہوگا جب کسی نے دوسرے پر کُرسی اُچھالی تو جواب میں اُس نے مائیکروفون اُکھاڑ کر اپنی شیر دلی کا ثبوت دیا۔ اور وہ بھی دیکھنے والا سین رہا ہوگا جب ایک ''شیر'' نے دوسرے ایک ''شیر'' پر پنکھا پھینک دیا۔ چُننے یا ووٹ کرنے کا مطلب ہوتا ہے کہ جس شخص کو آپ ہر اعتبار سے اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں تو اُسی کو آپ ایوان میں اپنی وکالت کرنے کے لیے آگے لاتے ہیں۔ کمال ہے صاحب کمال ہے۔ کیا آپ کے کوفر (زیورات کا صندوقچہ) میں یہی اور ایسا ہی وِبھوشن اور مال و متاع تھا۔ ٹھیک ہے صاحب ہم تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

جیسی روح ویسے فرشتے

ایسی صورت حال جب ہمارے سب سے معزز مجلس کی ہو تو باقی انتظامیہ میں اگر ہر ایک معاملے پر ''تراس'' کی جائے تو افسوس یا حیرانگی کی کیا بات ہے۔

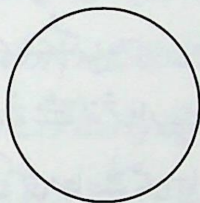
محکمہ خوراک کا وارڈ نمبر ۲ کے ایک پیارے ایم ایل اے کی ایک پیاری سی ''کنس چوونسی'' میں چند پنشن یافتہ بوڑھے لوگ پنڈتوں کا چھوڑا ہوا ایک اسکول چلا رہے تھے۔ سکول کی زمین اُسی علاقے کے ایک دیالو نے سن ۱۹۳۵ء میں محلے

کے نام سکول بنانے کے لیے حبہ کی تھی۔سکول میں پچھڑے طبقہ جات جیسے بوٹ مین، ریڑھ پُلر، صفائی کرمچاری، سبزی فروٹ سیلر وغیرہم کے بچے زیرِ تعلیم تھے۔ واللہ کچھ بچوں کی فیس یہ بوڑھے ازخود ادا کرتے تھے۔اچانک ٹارزن کی طرح ہا ہو کرتا ہوا پھُدکتا اور کودتا ہوا مالکِ سکول بن کر ایک جعلساز ٹپک پڑا۔ مایا کے چونکہ پاؤں ہوتے ہیں، اُنہی پر چل کر اُس نے سکول پر تالا ڈلوایا۔ بچے پھر سڑک پر آ گئے اور بوڑھے متعلقہ علاقے کے غریب، نادار اور آنے والی نسل کی تعلیم کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہے ہیں۔ایوانوں میں جا کر کاغذاتِ ملکیت دکھا کر بھی جھڑکیاں کھاتے ہیں اور ہر جگہ معاملے پر ''ژاس'' ہی کی جارہی ہے۔اُن بوڑھوں کو ذاتی ملکیت کے بجائے قوم کی سرمائے کا تحفظ آخر کہاں سے ملے گا۔کوئی جگہ ہوگی ____ پر ہے نہیں۔

مندرجہ بالا مثالیں میں نے مشتے از خروارے دیں ہیں۔نہیں تو ساری قوم واقف ہے کہ کہاں کہاں اور کس کس معاملے میں ہماری دادرسی کرنے کے بجائے انصاف دینے کی بجائے، ہمارے رستے ناسوروں کو مزید کُریدا جاتا ہے اور پھاہا رکھنے کی بجائے ''ژاس'' کی جاتی ہے۔ذرا اپنی حالت دیکھیے۔ مجھے یقین ہے کہ شاعر نے ضرور یہ آپ ہی کے لیے کہا ہوگا ؎

ذرا اپنا ذوقِ اسیری تو دیکھو
چمن بیچ کر ہم قفس مول لائے

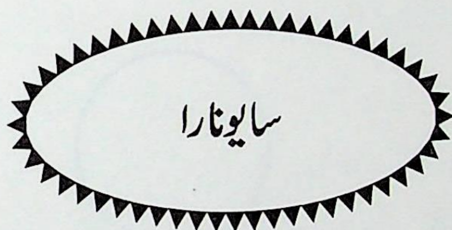




سایونارا

یہی بدلا ہوا چہرہ تو اب پہچان ہے اپنی
ہمارا اصل چہرہ کھو گیا آئینہ خانوں میں

(طاہر تلہری)


سایونارا

یہ آج سے چند سال اُدھر کی بات ہے۔ تب اپنے وطن کی صبحیں ملجگی اور دن کُہر آلود نہیں ہوا کرتے تھے۔ تب شامیں غمگین اور راتیں پُر ہول نہیں ہوا کرتی تھیں۔ تب الم زدہ لب پر یاس وحسرت کی گھٹائیں چھائی نہیں رہتی تھیں بلکہ مستانہ ہوائیں چلتی تھیں۔ باغوں میں بہاروں کے ڈیرے اور وادیوں میں حسین نظارے کھکھلاتے تھے۔ تب خوش رنگ پھول جولانیوں پر ہوتے تھے اور ہوائیں عطر چھڑک کر تتلیوں کو لُبھاتی تھیں۔ تب سر سبز لہلہاتے کھیتوں کے حُسن کی رنگ آمیزی کچھ اور ہی طرح کی ہوتی تھی۔ تب گاتی اٹھلاتی ندیاں نغمے بکھیرتی تھیں۔ تب کسان فصل کی کٹائی پر اپنا خون دے کر بابا جیتو کی المیہ داستانیں نہیں دُہراتا تھا۔ تب مدھ بھری راتوں میں جنگ نامے اسلاف کے کارنامے دہرائے جاتے تھے اور عشق الٰہی کی داستانیں پڑھی جاتی تھیں، سُنی جاتی تھیں اور سُنائی جاتی تھیں۔ تب عورتیں نلوں، ندی کے گھاٹوں، کنوؤں اور چشموں پر گاگریں گھڑے اور مٹکے لے کر پانی بھرنے آتی تھیں، چُہلیں کرتی تھیں، تیکھے شرارتی فقرے ایک دوسرے پر کستی تھیں اور ہرنوں کی طرح کلیلیں بھرتی، گھڑے اور برتن سنبھالتی ایک ناز وادا کے ساتھ گھروں کو لوٹ جاتی تھیں۔ اُن دنوں پانی بھرنے کی وہ جگہیں مورچوں اور بنکروں میں تبدیل نہیں ہو چکی تھیں۔ عورتوں کے عبور ومرور میں کوئی قدغن یا اڑچن حائل نہ تھی۔ عورت کی عزت وعصمت محفوظ تھی اور قبل از وقت حمل جانچنے کا دستور تھا نہ سہولیات تھیں۔ لڑکی کو گھر کی لکشمی مانا جاتا تھا اور اُس کی پیدائش باعث برکت تصور ہوتی تھی۔ تب ایک فرد اطمینان اور آزادی کے ساتھ سوچتا اور بلا خوف وخطر اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا۔ تب وحدانیت کی اذانیں گونجا کرتی تھیں، قول واقرار کی صدائیں سُنائی دیتی تھیں اور سرمدی نغمے فضاؤں کے ساتھ بغل گیر

ہوا کرتے تھے۔

تب شاداب گھٹائیں جھومتی تھیں، مستانہ ہوائیں لہراتی تھیں، رنگین فضائیں گاتی تھیں، کیف آور دن ہوا کرتے تھے اور مستی بھری راتیں ہوتی تھیں۔ دور دیہاتوں میں کئی اطراف سے پن چکی کی صدائیں آتی تھیں اور چرواہے بے فکر ہو کر دور دور تک ریوڑ لے کر نکل جاتے تھے۔ گوالے گائیوں اور گھوڑوں کو بغیر کسی ڈر کے جنگلوں تک ہانک کر لے جایا کرتے تھے۔ تب جنگل چوروں نے جنگلوں کی صفائی نہیں کی تھی اس لیے جنگلی جانور بھی بستیوں کا رُخ نہیں کرتے تھے اور حملہ آور بھی نہیں بنتے تھے۔ نہ ہوائیں قفس میں تھیں، نہ فضائیں اسیر تھیں، نظارے پابہ جولاں تھے نہ بہاریں زیرِ زنداں تھیں۔ دن مقفل تھے نہ راتیں مقید تھیں۔

یہ تب کی بات ہے جب سدھ مہادیو کے ٹیلوں سے بڑے بڑے ہی دانوں سے خوشبوئیں اُڑ کر بھدرواہ کے حسن پر نثار ہوتی تھیں اور غزال بھدرواہی گلعذاروں سے شرما کر دُور بن کی طرف کوچ کر جاتے تھے۔ یہ تب کی بات ہے جب ضلع اودھم پور کی ''روسلیاں تاراں'' سے پرے ایک دور دراز گاؤں میں ____ میں نے ایک مفلوک الحال گوجر لڑکے، جس کے پرانے بوسیدہ پاجامے پر کئی دھجیاں لگی ہوئی تھیں ____ سے پوچھا تھا:

''بچے اس چٹان پر بیٹھ کر یہ بنسری کسے سُناتے ہو''۔

جواب میں فرشتہ صفت معصوم چہرہ بولا تھا:

''بابو جی میری ماں ایک دور دیہات (انگلی سے سلال پروجیکٹ ریاسی کی جانب اشارہ کیا تھا) پنچاری میں رہتی ہے۔ اُسے میری بنسری اچھی لگتی ہے۔ اُسے ہی سُنا رہا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے یہ بہنے والی ہوائیں میری بنسری کی آواز ضرور اُس تک پہنچاتی ہوں گی۔ ہم

غریب لوگ ہیں، میں یہاں کام کرتا ہوں پتہ نہیں ماں سے ملنا کب نصیب میں ہوگا''۔

جنگلی کبوتروں کا ایک جھنڈ ہمارے اوپر پر پھڑ پھڑاتا ہوا آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھو گیا۔ اُس وقت وہ بھولا بھالا معصوم فرشتہ بھی بے خوف وخطر ویرانوں کا شہزادہ تھا اور اُس کی بنسری نہ پابند سلاسل تھی اور نہ اُس کی تانوں پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ یہ تب کی بات ہے جب ہم اُس طرف پہاڑی لوک گیتوں کی تلاش میں تھے۔ میرے دوسرے ساتھی میرے دوست اند و بھوشن شرما نے اُس بچے کا ماتھا چوما تھا اور بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی، پتہ نہیں کیوں؟ بچے کی معصومیت یا غربت کی وجہ سے، اُس کی سادہ خیالی کی وجہ سے یا درد کے رشتے کی وجہ سے ______ درد جو مشترک ہے، ٹیس جو ہمدم ہے، احساس جو ساجھا ہے، چھبن جو ہمجولی ہے اور رنگ ونسل سے بالاتر ہے۔

یہ تب کی بات ہے جب سجے سجائے ہاؤس بوٹ جھیلوں کے ٹھہرے پانیوں میں پرے باندھے استقبالی انداز سے کھڑے تھے۔ سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ دنیا کے کونے کونے سے بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے لوگ گلمرگ، پہلگام، سونہ مرگ، یوس مرگ اور نہ جانے کہاں کہاں اپنے تپتے ہوئے جسموں کو راحت دینے اور گرم گرم سانسوں کو خارج کر کے اپنے دل و جگر کو ٹھنڈے میٹھے عطر بیز ہواؤں سے آسودہ کرتے تھے۔ اُنہی دنوں باقی ہزاروں آنے والے سیاحوں کی طرح ایک جاپانی سیاح بھی وادی میں چند روز کے لیے سیر و سیاحت کی غرض سے آیا تھا۔ ہاؤس بوٹ میں ٹھہرا تھا اور واپس لوٹنے سے دو روز قبل اپنے میزبان بوٹ والے سے کہا تھا کہ اُسے کوئی خریداری نہیں کرنی ہے صرف اُسے ایک چھوٹے سے قالین کی ضرورت ہے۔ میزبان اُسے ''اپنے''

دوکانداز کے پاس لے گیا جس نے سیاح کے سامنے کئی نمونے کھول کر دکھائے۔
کئی ایک پیس دیکھ کر آخر میں جاپانی سیاح نے ایک چھوٹا سا قالین منتخب کیا اور دوکاندار سے اُس کی قیمت پوچھی۔ دوکاندار نے دام بتائے تو جاپانی نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا کلکولیٹر نکال کر اُس پر حساب جوڑنے کے بعد کہا کہ وہ قالین خریدنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ وجہ پوچھنے پر جاپانی نے بتایا کہ اُس کے پاس قالین کی قیمت ہے مگر واپس لوٹ کر اپنے ملک میں دینے کے لیے اُس کے پاس پورا ٹیکس کا پیسہ نہیں ہے۔ اُس پر دوکاندار نے مسکراتے ہوئے سمجھایا کہ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ قالین کی پوری قیمت ادا کرے جب کہ بل آدھی قیمت کا کاٹا جائے گا۔

معصوم جاپانی کچھ دیر تک تذبذب کے عالم میں رہا، اُس کے بعد اُس نے بڑی معصومیت کے ساتھ دوکاندار سے دریافت کرلیا کہ ایسا کرنے سے کیا فرق پڑے گا جب کہ قیمت تو اُسے پوری دینا پڑے گی۔ دوکاندار نے مزید ریشہ خطمی ہو کر کہا کہ بل پر جب آدھی قیمت درج ہوگی تو ٹیکس اُتنے پیسے پر لگے گا۔ اس طرح وہ من چاہا قالین بھی خرید سکتا ہے اور ٹیکس بھی بچا سکتا ہے۔ اب سیاح دوکاندار کی شاطری کو سمجھ گیا اور زور سے چیخا______ نُو، نُو، نُو______ یہ آپ لوگ مجھے کیا سکھا رہے ہیں۔ کیا میں اپنے ملک سے ٹیکس چور بن کر غداری کا مرتکب ہوجاؤں۔ نہیں مہربان من نہیں۔ میرے ٹیکس سے میرے ملک میں ہسپتال چلتے ہیں، سڑکیں بنتی ہیں، پُل تعمیر ہوتے ہیں جس سے عوام کو راحت ملتی ہے۔ میرے ٹیکس سے کئی اولڈ ایج ہوم، یتیم خانے اور نادار بیواؤں کے گھر پلتے ہیں۔ کیا آپ مجھے اُن سب کا حق مارنے کو کہتے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ مجھے قالین کی ضرورت نہیں ہے، میں اُس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔ اب یہ رقم جو میں نے قالین خریدنے کے لیے رکھی تھی، اپنے ملک کے تعمیراتی اور خیراتی فنڈ

میں جمع کرادوں گا۔اچھا چلتا ہوں ______ گڈ بائی ______ سایونارا ______

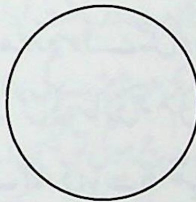
دوکاندار ہونقوں کی طرح اپنے سے دور جاتے ہوئے اُس ٹھگنے قد مگر قد آور محبِ وطن اور وسیع الذہن نوجوان کو دیکھ رہا تھا جس کی ایک ہی بات سے اُسے ایسا جھٹکا لگا کہ اُس کو وہ تمام تارے نظر آئے جو وہ تب تک دوسروں کو دن کے دوران ہی دکھا چکا تھا۔ جاپانی سیاح میں اپنے ملک کے تئیں جذبہ وطنیت ، نیک نیتی اور خلوص تھا جب کہ دوکاندار کی نیت اِس بارے میں مشکوک تھی کیونکہ جائز ٹیکس کی چوری کرنا یا دوسرے کو اُس کی ترغیب دے دینا دونوں غیر مہذب حرکات ہیں۔ اپنے جمے جمائے چالو اور مہذب پیشے کو ایک معمولی غلط سوچ سے یوں بھی بدنام کیا جاسکتا ہے۔کاروبار میں خاطر خواہ نفع کمانا گناہ نہیں ہے مگر کاروبار میں مخلص نہ ہونا بے شک گناہ ہے۔ حالانکہ مذکورہ سودے میں کوئی دھاندلی نہیں تھی مگر ایک غلط مشورہ بھی پیشہ ور کے ساتھ ساتھ اُس کی ساری قوم کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ دنیا کے لوگ ہماری بات کا اعتبار نہیں کرتے ہیں اور سودا میں مول تول بہت زیادہ کرتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ ہم میں سے ہی کچھ لوگوں نے خود اپنے معزز پیشوں اور عزت دار کاروبار کو معمولی سی لغزشوں سے بدنام کر کے رکھ چھوڑا ہے۔ پیسہ کمانا گناہ نہیں ہے کیونکہ زندہ رہنے کے لیے سو طرح کی ضروریات ہوتی ہیں ۔مگر یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ پیسہ بہت کچھ ہے مگر سب کچھ نہیں ہے۔ انہی معمولی لغزشوں کی وجہ سے آج صورت حال یہ ہے کہ۔

یہی بدلا ہوا چہرہ تو اب پہچان ہے اپنی
ہمارا اصل چہرہ کھو گیا آئینہ خانوں میں

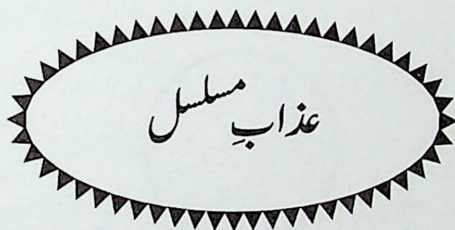
(طاہر تلہری)

☆☆☆



عذابِ مسلسل

زندگی سے اب تو آزاد شرم آنے لگی
میں بھی آ کر عمر کے کس دور میں رسوا ہوا
(جگن ناتھ آزاد)


عذابِ مسلسل

وڈیا دھر سورج پرشاد نائپال جو وی ایس نائپال کے قلمی نام سے انگریزی ادبی دنیا میں معروف ہے کا جنم سن ۱۹۳۲ء میں ہوا تھا۔ اُس کا باپ یا دادا بھارت سے ہجرت کر کے ''ٹری نی ڈاڈ'' چلا گیا تھا اور مستقلاً وہیں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ہندوستانی نژاد نائپال گذشتہ چھ دہائیوں سے انگریزی زبان کے ایک جانے مانے ادیب کی حیثیت سے جانا جاتا ہے جس کا سن ۱۹۶۱ء میں لکھا ہوا ناول ''اے ہاوس فار مسٹر بسواس'' (A House for Mr Biswas) آج تک مصنف کے شاہکار کے طور پر پڑھا جا رہا ہے۔ مصنف کا یہ ناول ''ٹری نی ڈاڈ'' کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے اور (غالباً) اُس کے والد کے سوانحی حالات پر مبنی ہے۔

نائپال کو اپنے ابتدائی ادبی دور میں اپنے عقل پرست (Rationalist) رویے کی وجہ سے کافی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ اُس کا وہ دور تھا جب وہ ہر مذہب کے ساتھ بیزار تھا۔ اُسی دور میں اُس نے ہندوستان کا دورہ کیا اور بعد میں اس بات پر اظہار افسوس بھی کیا کہ وہ یہاں آیا ہی کیوں تھا۔ واپسی پر اُس نے ایک کتاب ''این ایریا آف ڈارک نیس'' (An Area of darkness) لکھی جو بھارت سے متعلق تھی۔ اُس نے اپنی اُس کتاب میں ہندوستان کو ایک پچھڑا ہوا، توہم پرست ملک قرار دیتے ہوئے ہندوستان کی سخت تنقید کی تھی اور ہندوستان کو ایک اندھیرا علاقہ (برِ ظلمات) قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کو یہ صورت حال کیونکر پسند آئی ہوگی۔ اس لیے کتاب پر ملک میں کافی شور شرابہ ہوا۔ کتاب کی کاپیاں جلادی گئیں اور اُس پر پابندی لگانے کی حکومت سے مانگ کی گئی۔

نائپال کی تحریروں میں اسلام اور اسلامی ممالک کے تئیں غصہ (Bias) بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ دانشوروں کا خیال ہے جو مبنی بر حقیقت ہے کہ ایک مصنف میں

غصے کا عنصر کم سے کم ہونا چاہیے تا کہ اُسے حقیقت تک پہنچنے کے لیے اُس کی راہیں ہموار ہوں۔ غصہ فی الحقیقت اُسے واقعیت پسندی یا معروضیت (objectiveism) تک جانے میں سدِ باب بنتا ہے۔ جو خود مصنف کے لیے صحیح فیصلہ لینے میں مشکلات کھڑی کر دیتا ہے۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات سے متعلق اُس کی بھڑاس اُس کی تحریروں میں بہت زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اُس نے اسلام سے متعلق جانکاری حاصل کیے بغیر ہی اسلام، مسلمان، اسلامی تعلیمات اور اسلامی سلطنتوں پر قلم اٹھا کر بے سرو پیر باتیں اور لایعنی مفروضات بلکہ مبنی بر بکواس تحریرات منصۂ شہود پر لائیں ہیں۔

مصنف مذکور کو اسلام کے ساتھ خاص طور پر یہ شکایت ہے کہ اسلام، ماقبل اسلامی تہذیب کی تہذیبی شناخت کو برباد کر دیتا ہے اور اس مفروضے کو وہ بار بار لکھتا رہا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہ صرف اُس کی کوتاہ اندیشی پر ماتم کرنے کے لیے کافی ہیں بلکہ ایسی سوچ ہی غلط، بے بنیاد اور ایک غلط اندازے پر قائم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج بنیادی اعتقاد اور دینی تعلیمات کو چھوڑ کر انڈونیشائی اور عربی، ہندوستانی اور ایرانی مسلمانوں کی معاشی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی ایک جیسی ہوتی۔ اُن کی ملکی شناخت الگ الگ نہ ہوتی، اُن کا لباس الگ الگ نہ ہوتا۔ عرب توپ اور انڈونیشائی تہمد یا دو پلی ٹوپی نہیں پہنتا، مصری لمبا کُرتہ اور ایرانی چوغہ نہیں پہنتا۔ کشمیر فرن اور روسی مرغل نہیں پہنتا۔ نائپال نے اسلامی ممالک اور اُن کے تہذیب و تمدن کا بغور مطالعہ کیے بغیر ہی غلط اندازے اور سطحی مفروضے قائم کیے ہیں بلکہ اُن کو بار بار دہرایا بھی ہے۔ وہ اپنی کتاب "امنگ دی بلی ورس" (Among the Beliivers) میں اسلام سے متعلق تذکرہ یوں کرتا ہے:

"مجھے اسلام سے متعلق اتنا ہی معلوم تھا جتنا اوروں کو، یہ کہ اُن کا ایک

پیغمبر ہے اور ایک کتاب، وہ ایک خدا کو مانتے ہیں اور تصویروں کو پسند نہیں کرتے ۔ وہ جنت اور جہنم پر عقیدہ رکھتے ہیں جس کو تسلیم کرنا میرے لیے ہمیشہ مشکل رہا ہے ۔ یہ کہ اُن کے اپنے شہداء ہیں اور وہ سال میں ایک بار نقلی تربت (تعزیہ) نکالتے ہیں اور مرد و زن ہلال دار علم ہاتھ میں لے کر ناچتے ہیں اور ہلال کو کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف جھکاتے ہیں اور ڈھول بجاتے ہیں اور کبھی کبھی لاٹھی کا کرتب بھی دکھاتے ہیں"۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ اسلام سے متعلق جس مصنف کے کُل معلومات ایسی اور وہ بھی اتنی ناقص ہوں اُس سے اسلامی سماج کے تجزیے کے بارے میں کیا توقع کی جاسکتی ہے اور اُس تجزیے کے اظہار کا انداز کیا ہوگا وہ اظہر من الشّمس ہے۔ ایسے ہی متعصب و کوتاہ اندیش منصفین نے ہمیشہ اسلام کے خلاف لکھ کر اسلام کی درخشاں شبیہ بگاڑنے کی کوششیں کی ہیں۔ نائپال کا الزام ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کی قبل از اسلامی تہذیب کو نیست و نابود کر دیا ہے اور یہ کہ اسلام قبول کرنے سے مسلمان بے جڑ (Root less) ہو جاتا ہے۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے یہ۔ ایسا ایک کٹر اسلام دشمن اور ایک یہود بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیا ایک اسلام دشمن یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد ایک عرب گھوڑ اسواری ترک کر دیتا ہے، اونٹ کو گھر سے باہر کر دیتا ہے، مہاجر کاروبار چھوڑ دیتا ہے اور ایک انصار کھجور کی کاشت موقوف کر دیتا ہے۔ ازبیک فرغل پہننا چھوڑ دیتا ہے اور تاجک پنیر کا استعمال ترک کر دیتا ہے۔ کشمیری نمکین چائے اور چینی سویابین کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ ہندوستانی مکی، جوار، گندم اور کویتی ثرید کا استعمال روک دیتا۔ آخر اسلام میں داخل ہونے کے بعد ایک انسان بے جڑ کیسے ہو جاتا ہے۔ ہاں! یہ بات ہے کہ اسلام میں داخل ہونے

پر اسلام لاریب جہالت کی رسمیں عورتوں کا استحصال، بُت پرستی، سود خوری اور دیگر مشرکانہ افعال پر روک لگا کر معاشرے کو صاف ستھرا کر کے صرف ایک رب کی بندگی کی تلقین کرتا ہے۔ اگر نائپال اُس کو بے جڑ ہونا کہتا ہے تو پھر اُس کی سطحی سوچ قابل صد افسوس تھی۔ دوسروں کی ڈفلی پر ناچنے والے ایسے شہرت یافتہ بندروں کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کِیا جا سکتا ہے۔

نائپال کی متعصّبانہ دورخی پالیسی یا دوہرا رویہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اسلامی بنیاد پرستی کو مذہبی جنوں قرار دے کر اُس کی بھرپور مذمت کرتا ہے جب کہ دوسری جانب ہندو بنیاد پرستی کو یہ کہہ کر جائز قرار دیتا ہے کہ یہ صدیوں کی غلامی کے بعد اُن کی قومی شناخت کا احیاء ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اُس نے رام جنم بھومی تحریک کی بھی یہ کہہ کر پُر زور حمایت کی ہے کہ ہندوؤں میں اب بیداری پیدا ہوئی ہے اور اس تحریک کو ہندوؤں کی سیاسی، مذہبی اور قومی بیداری کا ثبوت قرار دیا ہے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ شری نائپال کا اسلامی ملکوں کا اور خصوصاً ہندوستانی مسلم سماج کا مطالعہ بہت ناقص، غلط، سطحی اور متعصّبانہ ہے۔ اُس کی عقل پرستی بھی سطحی تھی اور عمر کا ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد وہ ہندو احیاء پرستی کا حمایتی بن کر سامنے آیا تھا اور اگر یوں کہا جائے کہ وہ شروع سے ہی ایک غلط، تنگ نظر اور متعصّبانہ راستے کا راہی تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ ظہور اسلام سے قبل معمولی معمولی باتوں پر نسل در نسل جنگیں لڑا کرتے تھے جس میں قبیلوں کے قبیلے موت کے گھاٹ اترتے تھے (جیسے حرب بسوس، حرب داحس) جو بقول مولانا حالی ؎

چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر ایک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ

فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ

اور پھر جس دین نے لوگوں کی کایا پلٹ دی۔ وہی وحشی پھر ادب، اخلاق، شائستگی اور انسانی اعلیٰ قدروں کے نمونے بن گئے جو مولانا کے الفاظ میں ۔

وہ دین جس نے اعداء کو اخواں بنایا
و حوش و بہایم کو انسان بنایا
درندوں کو غمخوار دوراں بنایا
گڈریوں کو عالم کا سلطان بنایا

اُس دین کے بارے میں ایک عالمی شہرت یافتہ ادیب ایسی بے سروپا باتیں تحریر کرے یقیناً افسوس ہوتا ہے۔ افسوس ہوتا ہے اُس کی تنگ نظری اور متعصّبانہ سوچ پر۔ دُکھ اور افسوس تو ہوتا ہے مگر حیرانگی نہیں کیونکہ..........

(۲)

اِس دوہری شخصیت اور دوہرا رویہ اپنانے والے جانبدار ادیب کو سال ۲۰۰۱ء کا نوبل پرائز دیا گیا اور ہر طرف بلکہ ادبی حلقوں میں خاص طور پر حیرت و استعجاب دیکھنے کو ملا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ انعام نائپال جیسی شخصیت اور ادیب کے حق میں کیونکر ممکن ہوا جب کہ اُس کی شہرت اور قدر و قیمت تمام حلقوں میں یکساں طور قابل قبول نہیں تھی ۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ وہ اپنے اشتعال انگیز خیالات اور متعصّبانہ سوچ کی بنا پر اس قابلِ قدر انعام کا مستحق نہیں تھا۔ بعض لوگوں کا یہاں تک بھی کہنا تھا کہ یہ انعام نائپال کو اُس کے اسلام مخالف رویے کی وجہ سے اُس وقت دیا گیا جب امریکی جھوٹے پروپیگنڈے کے مطابق ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر اُسامہ

بن لادن کے حامیوں نے حملہ کیا۔ موخر الذکر خیال رکھنے والے لوگوں کے ساتھ اتفاق کرنا ہی حق وانصاف کا متقاضی ہے کیونکہ انعام کی سفارش کرنے والے اور انعام دینے والے ہی کیا بلکہ سارا یورپ اول سے ہی مسلم دشمن رہا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ نوبل انعام طے کرنے کی جیوری میں یہود عنصر کا ہونا ہی نائپال کے انعام کی ضمانت بن گیا تھا۔ کیونکہ یہودی ہر اُس بات کی تائید میں ہوتے ہیں جس میں مسلمانوں کا نقصان اور اسلام دشمنی کی بُو آتی ہو۔

یہ بات کافی عرصہ سے مشہور چلی آ رہی تھی کہ اسلام دشمن عناصر کا ایک خفیہ سنگٹھن ہے اور یہ بات مسلمان اور اسلام کے ساتھ ہو رہے کھلم کھلا مظالم، ناانصافیاں، معاندانہ رویہ اور ہتک آمیز سلوک دیکھ کر پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ واقعتاً اسلام دشمن عناصر کا ایک خفیہ سنگٹھن ہے جو اسلام اور مسلمان دشمنی کی خاطر صدیوں سے برسرِ پیکار ہے۔ اسلام مخالف بات جس کونے کھدرے سے کی جائے وہ اُس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ بات یوں بھی عیاں ہے کہ جب کوئی اسلام مخالف کتاب چھپ جاتی ہے یا پیسہ دے کر لکھوائی جاتی ہے تو اُس کا خوب چرچا کیا جاتا ہے۔ چونکہ بدیشی پرنٹ اور الیکٹرانگ میڈیا پر زیادہ تر اُسی سنگٹھن کا کنٹرول ہے اس لیے اُسے خوب مشتہر کیا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ بیشتر جرائد ورسائل، ریڈیو اور ٹی وی سٹیشن وغیرہ بھی اُسی گروہ سے وابستہ لوگوں کی ذاتی ملکیت میں ہیں، اس لیے اسلام کے خلاف بولنے میں نہ اُنہیں کوئی روک ہے نہ ٹوک۔ قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ سابقہ ایک دہائی میں جب بھی کہیں کوئی واقعہ ہوا، انسانی جانیں تلف ہوئیں تو بغیر کسی تحقیق وتفتیش کے منٹوں کے اندر اندر ہی مسلمان تنظیموں کا نام لیا گیا اور بعد میں وہ کسی اور کی کارستانی ثابت ہوئی۔ جب مسلمانوں کا نام لیا گیا، اہانت اور حقارت کے ساتھ لے کر خوب اچھالا گیا مگر جب کسی اور کا نام آیا

تو وہ دبی زبان سے لیا گیا۔

خفیہ سازشیں اسلام کے خلاف نہ ہو رہی ہوتی تو اسلامی خلافت، سازشی عناصر کی سازش کا شکار نہ ہو جاتی۔ آدھی سے زیادہ دنیا پر راج کرنے والے عثمانی ترک جانباز طوفان زدہ بالو کی طرح نہیں بکھرتے۔ ہندوستانی ناکام جنگِ آزادی میں مسلمانوں کو عرش سے فرش پر نہ ٹپکا جاتا۔ تبت اور لداخ میں مسلمانوں کی ہڈیاں توڑ کر اعضاء کاٹ کر، انہیں ناخیز بنا کر سڑکوں پر انہیں گداگری کے لیے مجبور نہیں بنایا جاتا۔ تقسیم ملک کے موقعہ پر ساڑھے سات لاکھ مسلمانوں کو گھروں اور زندگی سے محروم نہیں کیا جاتا۔ ریاست جموں و کشمیر کے خالی صوبہ جموں میں ڈھائی لاکھ مسلمانوں کا کوئی تو نشان ملتا۔ وہ کون سے نام ونشان والے قبرستانوں کی زینت بنے، نہ جنازہ ہی اٹھا نہ فاتحہ ہوئی، نہ لوحِ مزار بنا اور نہ چراغ ہی جلے اور اُن کے علاوہ مزید دس لاکھ مسلمانوں کو رات کے اندھیروں میں سراسیمگی کی حالت میں اپنے گھروں کو چھوڑنا نہیں پڑتا اور صوبہ کشمیر میں صرف بائیس سال کے عرصہ میں ڈیڑھ لاکھ طایرانِ چمن اپنے گلستانوں او آشیانوں سے نیست ونابود نہ ہوتے۔ ایران کا مسافر بردار جہاز سمندر کے اوپر سے پرواز کے دوران توپ سے نہیں اڑایا جاتا۔ اگر سربراہانِ ایران ورلڈ پولیس مین کا دھاڑ انہیں مانتا تو اُس میں عام شہریوں اور دوسرے ممالک کے سیاحوں کا کیا قصور۔

کوسووا میں لگ بھگ ڈھائی لاکھ مردوزن ملاسووچ کی عصبیت کی بھینٹ نہ چڑھتے۔ امت مسلمہ کی بیٹیوں کی عصمت وعفت سے کھلواڑ نہ ہوتا اور معصوم بچوں کو پانی کی پاپیوں میں گھٹ گھٹ کر مارا نہ جاتا۔ امریکہ اور دوسرے یورپی ممالک کے مسلم ممالک خاص طور سے عرب، ایران اور دیگر مشرقی وسطی کے چھوٹے بڑے ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہوتے۔ وہ اِن ممالک کے

اندرونی معاملات میں مداخلت بیجا کر کے مصر، لیبیا، شام، یمن، سوڈان وغیرہ میں خانہ جنگیاں نہ کراتے اور سربراہانِ مملکت کو قتل نہ کراتے یا جیل میں نہ ڈلواتے۔ افغانستان، عراق جیسے مستحکم و مضبوط مسلمان ممالک میں قتل عام کر کے زندہ بچے لوگوں کو خاک نہ چٹاتے۔

سلمان رشدی جس نے عامتہ المسلمین کو زبردست روحانی ٹھیس پہنچائی تھی کو بیس کروڑ مسلم آبادی والے ہندوستان میں مہمان نہیں بنایا جاتا۔ تسلیمہ نسرین کو پناہ نہ دی جاتی اور اُس کی کتابوں کو یا دنیا میں کہیں بھی چھپنے والی اسلام مخالف کتابوں کو غیر مسلم علماء کو بغیر نام پتہ ظاہر کیے تحفے میں نہیں بھیجا جاتا تا کہ وہ اُن پر تجزیہ وتبصرہ کر کے مزید دل آزاری کا سامان فراہم کرسکیں اور اُسی تسلمیہ نسرین جس نے برملا طور پر مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی کو یورپی ادبی انعام سے نوازا نہیں جاتا۔ کیا یہ یورپین اُسی لکھی ہوئی چیز کو ادب مانتے ہیں جس میں مسلمانوں کے لیے اہانت اور دل آزاری ہو۔ فلسطین کا مسئلہ ہوتا اور نہ وہاں قتل عام ہو رہا ہوتا۔ کشمیر کا مسئلہ ہوتا اور نہ یہاں نسل کشی ہو رہی ہوتی۔ عراق کی دو نسلوں کو تباہ کر کے خوراک کے دانوں اور دوا کے قطروں کے لیے تڑپایا نہیں جاتا۔ افغانستان میں عامتہ المسلمین کو مہلک ہتھیاروں کی آزمائش کی تجربہ گاہ نہیں بنایا جاتا۔ طالبان کی حکومت کا سرو ناش کر کے ہزاروں طالبان جوانوں کو تڑپا تڑپا کر نہ مارا جاتا۔

تھائی لینڈ اور کمبوڈیا میں، فلپائن اور چین میں مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی سزا نہیں ملتی۔ روس میں علماء، فضلاء کے علاوہ عام مسلمانوں کو لادین انقلابیوں کے ہاتھوں بے دریغ قتل عام نہ ہوتا۔ پچھتر ہزار علماء و فقہاء، محدثین اور مبلغین کا کہیں نام ونشان تو ملتا۔ الجزائر میں سوا پانچ لاکھ مسلمان غلام رکھنے کی خاطر ذبح

نہیں کیے جاتے اور آزادی وطن کی خاطر لڑنے والی اُمت مسلمہ کی شیر دل بیٹی جمیلہ بو پاشا کے ساتھ فرانسیسی جیلوں میں وہ سب کچھ نہ ہوتا جس کو لکھنے کے لیے ہاتھ کانپتا ہے اور قلم پر رعشہ طاری ہوتا ہے۔ وہ اگر ضبط تحریر میں لایا جائے تو نہ جانے کتنے نوجوان جذبات میں آکر اپنے گریبان چاک کر ڈالیں گے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت اور اپنے گنگا جمنی دیش میں پنسٹھ سال میں زائد از چھتیس ہزار دنگے کرا کر مسلمانوں کو چُن چُن کر ہدف نہیں بنایا جاتا اور چند سال قبل ہی گجرات میں وہ سب کچھ نہ ہوتا جس کو لکھنے کے لیے بڑے بڑے انشا پردازوں کے کلیجے دہل جاتے ہیں اور وہ سب کچھ کرنے کے بعد گورو یعنی فخر ومباہات کی یاترا نہ نکالی جاتی۔ اسی گجرات کے حوالے سے ایک نظم کے مقطعے میں جگن ناتھ آزاد مرحوم تاسف کا اظہار اس طرح سے کرتے ہیں ؎

زندگی سے اب تو آزاد شرم آنے لگی
میں بھی آکر عمر کے کس دور میں رسوا ہوا

اگر ہم خفیہ سازشوں کے ہدف نہ ہوتے تو موجود دور میں مسلمان ہونا ہی گناہ نہ بنتا۔ بھارت میں پلاسٹک چپلوں کے تلوؤں پر اور امریکہ میں فٹ بالوں پر متبرک نام چھاپ کر رب کائنات کے ساتھ سرکشی کا ارتکاب نہیں کیا جاتا۔ ثقافتی ٹکراؤ پیدا کر کے اسلامی دینی سرمایہ، تشخص اور تاریخ کو مسخ کرنے کی ہر طرف سے سازشیں نہیں رچی جاتی۔ بعض بزرگوں کی تصویریں ٹوائیلٹ پیپر پر چھاپ کر اپنی گلی سڑی سوچ اور گندے ذہن کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ مسلمانوں کو جھوٹے مقدمات میں اُلجھا کر اُن کے جان و مال کو بغض وعناد کی بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا۔ غرض یہ کہ مسلمان مکمل طور سے ایک عذابِ مسلسل میں گرفتار ہے اور اُس پر ہر طرف سے سازشی ہتھکنڈے آزمائے جا رہے ہیں۔ اسلام کو دہشت پسند

مذہب اور مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کی بڑے پیمانے پر کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ اس میں سر فہرست امریکہ ہے جس کے سابق صدر کو نیلسن منڈیلا نے ''عالمی امن کا دشمن'' قرار دیا تھا۔ حالانکہ حقیقت بھی یہی ہے کہ انیسویں صدی اور خاص کر بیسویں صدی کی تاریخ اس بات کی مُنہ بولتی تصویر ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد بذات خود امریکہ رہا ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود مسلمان اب بھی آپس میں دست و گریبان ہیں۔ مسلمان سمجھ نہیں پا رہا ہے کہ پانی اُس کی گردن تک آ پہنچا ہے اور ایک اور ریلے میں یہ سب کچھ ہوا ہو جائے گا۔ دنیا کا دستور بھی یہی ہے کہ جو لوگ اپنی حالت بدلنا نہیں چاہتے اُن کو رب کی طرف سے بھی مدد نہیں ملتی۔ دنیاوی اعتبار سے رب کی طرف سے مسلمان کو ایک خاص چیز ودیعت ہوئی تھی جس کی بناء پر وہ دنیا کو اپنے زیر نگین کر سکتا تھا مگر اُسے وہ ''کالا پانی'' استعمال کرنا نہیں آیا۔ مسلمانوں کو سنبھلنا چاہیے اس سے پہلے کہ وقت کا پنچھی اُڑان بھرے۔ آج مسلمان کی وہی حالت ہے جو مولانا حالی کے الفاظ میں۔

نہ ثروت رہی اُن کی قائم نہ عزت
گئے چھوڑ ساتھ اُن کا اقبال و دولت
ہوا علم و فن اُن سے ایک ایک رخصت
مٹیں خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت
رہا دین باقی نہ اسلام باقی
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی

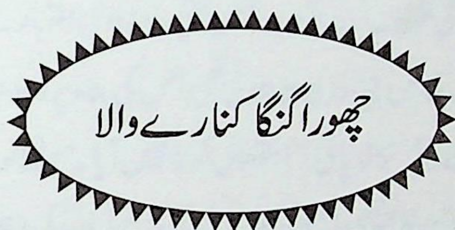


(فروری ۲۰۱۲ء)

چھورا گنگا کنارے والا

اسی طرح گنگا کبھی فلک سے اُتری تھی
ملی تھی شِو کی جٹاؤں میں پہلی جائے قرار

(فراقؔ گورکھپوری)


چھورا گنگا کنارے والا

ایک انسانی جسم میں جو اہمیت و افادیت ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے وہی افادیت و اہمیت گنگا ندی ہندوستان کی لیے رکھتی ہے۔ اس ندی کا پانی نہ صرف نہانے، دھونے، پینے اور آب پاشی کے لیے استعمال ہوتا ہے بلکہ کچھ چھوٹے چھوٹے بجلی گھر اور پہاڑی علاقوں میں ہزاروں پن چکیاں اس کے پانی سے چلتی ہیں۔ ندی نہ صرف آبی نقل و حمل کے لیے کار آمد ہے بلکہ اس کے گھاٹوں پر بنے کئی دھارمک تیرتھ استھان اور سینکڑوں مندر استھاپن ہیں جن سے کروڑوں روپیہ دان پن کی صورت میں متعلقہ گروہوں، سماجی و دھارمک تنظیموں اور انفرادی طور پر پنڈوں کی معاشی حالت سُدھارنے میں مدد و معاون بنتی ہے اور زائرین کی سیاحت سے کاروبار پر خاصا منافع بخش اثر پڑتا ہے۔ ہندوؤں میں ندی کے پانی کی وہی قدر و منزلت ہے جو مسلمانوں کے یہاں آبِ زم زم کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آبِ زم زم صدیوں سے صدیوں تک کا اور آگے قیامت تک کے لیے ایک جیتا جاگتا محیر العقول معجزہ ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ہوسکتا۔ برف کے پگھلنے سے گنگا ندی معرض وجود میں آتی ہے اور پانی کی دھاراؤں کو نشیب کی طرف اُچھالتی ہیں جب کہ آبِ زم زم سنگلاخ چٹانوں کے سنگی سینے سے پھوٹنے والا اور لق و دق ریگستان کا وہ سُوتا ہے جس میں نہ صرف حیات بخش اجزائے غذا و شفا ہے بلکہ اُس چشمے کا اُس جگہ پر جہاں کوئی بھی پیداوار نہیں ہوتی ہونا ہی بذاتِ خود ایک اچھنبے میں ڈالنے والا حیرت انگیز معجزہ ہے۔ جاپان کے ایک سائنس دان نے حال ہی میں اُس پانی کا تجزیہ دوسرے بیسیوں پانی کے ساتھ کیا لیکن زم زم جیسا شفا بخش اور مقوی پانی اُسے ساری دنیا میں اور کہیں نہیں ملا۔ اور یہ اعلان کرتے ہوئے وہ غرقِ حیرت و استعجاب میں تھا کہ اتنی بڑی نعمت عربوں کو بالخصوص اور عامۃ المسلمین

کو بالعموم کس روپ میں ملی ہے۔

گنگا ندی جن علاقوں اور شہروں سے گذرتی ہے اُن علاقوں کی ساری گندگی، فُضلہ، مردہ جانور، کارخانوں اور فیکٹریوں کا زہر آلود گندہ پانی حتیٰ کہ انسانی لاشیں بھی ندی میں بہہ جانے کے باوجود گنگا کا پانی صاف وشفاف ہوتا ہے جو واقعی ایک حیران کن بات ہے۔ قنوج کے میرے ایک مرحوم دوست کا کہنا تھا کہ وہ پڑھائی کرنے کے زمانے میں گنگا کے کنارے بیس فٹ اونچائی سے بھی پانی میں ڈالا ہوا سکہ بہ آسانی دیکھ پاتے تھے۔ نیشنل جیوگرافک ٹی وی چینل کے مطابق گنگا کے پانی میں آکسیجن گیس کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس پانی میں بیکٹر یا بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے جو سیکنڈوں میں خود بخود ہی فنا ہوتا ہے جو واقعی ایک حیرت میں ڈالنے والی بات ہے اور اس بہت ساری گندگی پڑنے کے باوجود بھی اس کا پانی بہر حال صاف ہوتا ہے اور لوگ اُسے شوق وشردھا سے پی لیتے ہیں۔ فراق گورکھپوری کے الفاظ میں

گنگا وہ بدن کہ جس میں سورج بھی نہائے

کسی عالم کا یہاں تک بھی کہنا ہے کہ جنت کی دو ندیاں جو زمین کے سپرد کی گئیں ہیں جیحون اور سیحون ہیں، جن میں جیحون کا پتہ تو روس کے اطراف میں ملتا ہے اور بلاشبہ سیحون گنگا ندی ہی ہوسکتی ہے۔ بقول فراق گورکھپوری

اسی طرح گنگا کبھی فلک سے اُتری تھی

ملی تھی شِو کی جٹاؤں میں پہلی جائے قرار

بہر حال قطع نظر اس کے بہر صورت ندی لوگوں کو کھلاتی پلاتی بھی ہے اور لاکھوں لوگوں کی روزی روٹی کا سادھن بھی جُٹاتی ہے۔ ہندوؤں کے چار بڑے تیرتھ استھان کاشی، متھرا، گنگوتری اور بدری ناتھ جو چار دھار کے نام سے مشہور

ہیں ــــــــ میں سے دو اسی ندی کے کنارے پر واقع ہیں اور ایک ذرا ہٹ کر پہاڑی پر ہے مگر اُس کے عین سامنے گنگا بہتی ہے۔ مشہور زمانہ بنارسی ٹھگ بھی صدیوں سے اِسی ندی کے کنارے اپنا دھندا کر کے لوگوں کو ٹھگتے رہتے تھے اور اُسی بنارس کی ساڑھیاں اور ذربفت کا کپڑا جہاں ساری دنیا میں مشہور ہے وہیں اُسی بنارس کے بارے میں یہ مقولہ بھی بہت مشہور ہے :

رانڈ ، سانڈ ، سیڑھی ، سنیاسی
اُن سے بچے تو سیوے کاشی

رشید احمد صدیقی مرحوم نے کہا تھا کہ مغلوں کی دین ہندوستان کو تاج محل ، اُردو اور غالب ہیں۔ اس میں کیا کلام ہے جب کہ میرا ماننا یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دین ہندوستان کو اور باتوں اور نعمتوں کے علاوہ گنگا ندی بھی ہے۔ اہل ہنود کے نزدیک اس ندی کی اتنی تعظیم ہے کہ وہ مرنے والے کے مُنہ میں گنگا جل کے قطرے ٹپکاتے ہیں تا کہ مرنے والے کی موت آسان ہو جائے اور مرنے کے بعد وہ اپرم پار ہو جائے۔ یہ بھی عقیدت کا ہی ایک پہلو ہے کہ بھارتی عوام میں بلا تخصیص مرد وزن گنگا دونوں کا نام رکھا جاتا ہے جیسے گنگا ، گنگا بائی ، گنگاوتی ، گنگا پُتری وغیرہ اور مردوں میں گنگا ، گنگارام ، گنگاداس ، گنگاپرساد ، گنگاسنگھ ، گنگاناتھ وغیرہ۔

قومی شاعروں نے جہاں گنگا کی تعریف وتوصیف میں قصیدے لکھے ہیں وہیں فلم کے تخلیق کاروں اور فلم کے لیے لکھنے والے شاعروں نے اس کی جانب کچھ زیادہ ہی توجہ دے دی ہے۔ فلم نرماتاؤں نے کئی فلمیں گنگا کے نام سے بنائیں جیسے گنگا کی سوگندھ ، جس دیش میں گنگا بہتی ہے ، گنگا تیرا پانی امرت ، گنگا جمنا ، رام تیری گنگا میلی ہوگئی ، گنگا دھیرے بہو ، گنگا کے کنارے ، گنگا کے اُس پار وغیرہ وغیرہ۔ اِسی طرح فلم سے وابستہ شعراء نے اپنے اشعار میں خاص توجہ اس

جانب مبذول کر کے نہ صرف اپنی محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے بلکہ اِس کی اہمیت وافادیت اورلوگوں کے دلوں میں اس کی عظمت کا احساس بھی دلایا ہے۔ چنانچہ اسی احترام وشردھا کی پاداش میں بیسیوں نغمے تخلیق ہوکر مقبول عام اور زبان زدخاص وعام ہوگئے ہیں جیسے....

یہ گنگا آئے کہاں سے
یہ گنگا جائے کہاں سے

ہم اُس دیش کے باسی ہیں
جس دیش میں گنگا بہتی ہے

رام تیری گنگا میلی ہوگئی
پاپیوں کے پاپ دھوتے دھوتے

گنگا میاں میں جب تک یہ پانی رہے
میرے سجنا تیری زندگانی رہے

گنگا میری ماں کا نام
باپ کا نام ہمالیہ

وغیرہ وغیرہ۔

تقسیم ملک سے پہلے کا ایک عبرت ناک واقعہ سُناتے ہوئے کشمیر کے ایک مسلمان بزرگ، ماہر تعلیم جناب فاضلی صاحب مرحوم ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر جن کا انتقال کبرسنی میں سن ۲۰۰۳ء میں ہوا، نے فرمایا کہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں جموں کے پرنس آف ویلز کالج (موجودہ سائنس کالج جموں) میں اساتذہ کی ایک پارٹی زیر

تربیت تھی۔ تربیت کے اختتام پر آنجہانی جیالال کول ناظر (جون ۱۹۵۴ء کے آس پاس بحیثیت ہیڈ ماسٹر اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے) کی قیادت میں اساتذہ کی یہ پارٹی ہندوستان کے مختلف شہر گھومنے گئی۔ چونکہ پروگرام میں تاج محل دیکھنا شامل تھا مگر کول صاحب نے از خود پروگرام میں تبدیلی لائی اور وہ پارٹی کو آگرہ کی بجائے ہردوار لے گئے۔ وہاں پر ہندو اساتذہ نے گنگا میں اشنان کیا اور مسلمان اساتذہ ایک مکان کی بالائی منزل سے اُنہیں نہاتے دیکھتے رہے۔ اگر چہ ملک کو عملی طور پر تقسیم ہونے میں ابھی سات آٹھ ماہ باقی تھے مگر فرقہ وارانہ فساد شروع ہو چکے تھے اور مسلمانوں کا ہندوستان میں ہر جگہ قتل عام ہو رہا تھا اور وہ ہر جگہ اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کر رہے تھے۔

وہاں سے واپسی پر ریل کسی جگہ رُک گئی اور ہندو اساتذہ ریل سے اُتر کر لوٹ کھسوٹ کے مشاہدے میں محو نظارہ ہو گئے مگر مسلمان اساتذہ کو ریل میں ہی دُبک کر اور چھپ کر رہنا پڑا کیونکہ اُن پر حملہ ہو سکتا تھا اور ایسے حملے آئے دن ریلوں پر شروع ہو چکے تھے۔ اسی دوران صاحبِ موصوف کو خوف کی وجہ سے حاجت بشری محسوس ہوئی اور وہ چپکے سے ریل کے باتھ روم میں جا کر جب فارغ ہو کر آنے لگے تو اچانک اُنہیں سنڈاس کی دیوار پر کچھ شعر لکھے نظر آئے، وہ شعر یوں تھے ۔

گنگا یہ قیامت یہ ستم خیز نظارے
مسلم کا لہو یوں بہے تیرے کنارے
گنگا تجھے محشر میں بیان دینا پڑے گا
جو کچھ ہوا جس کی طرح ہوا تیرے کنارے
اے یاتریو جور و ستم کے یہ نمونے
عصیاں کے سیاہ داغ ہیں ہاتھوں پہ تمہارے

(۲)

اِس واقعے کا تذکرہ کر کے میرا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی گنگا ندی کی توقیر کرتے رہے ہیں تبھی تو کسی مصیبت زدہ مظلوم نے ظالم کو مخاطب کرنے کی بجائے گنگا کو ہی اپنا ہمدرد جان کر اور مخاطب ہو کر اپنے دل کے پھپھولے دکھائے ہیں۔

ہندو دیو مالا کی پراچین کتھاؤں کے مطابق گنگا ندی کا رُخ ہندوستان کی طرف نہیں تھا بلکہ یہ چین کی جانب بہتی تھی مگر رام چندر جی کے خاندان کے ایک بادشاہ راجہ باگیرتھ جب بادشاہ بنا تو پھر تخت نشین ہوتے ہی اُس نے بے انتہا دولت صرف کر کے اور ہزاروں لوگوں سے محنت و مشقت کرا کر اُس ندی کا دھارا شمالی ہند کی جانب موڑ دیا۔ اس بات میں کہاں تک سچائی ہے وہ تو ہم نہیں جانتے مگر اتنا ضروری بتا سکتے ہیں کہ جنوبی ہند کے ایک انجینئر نے کچھ عرصہ قبل تحقیق کر کے یہ بات بتائی کہ اُسے ایسے کچھ آثار ملے ہیں جن سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ندی کا رُخ دوسری یعنی بھارت کی جانب موڑ دیا گیا ہے جب کہ پہلے ایسے نہیں تھا ویسا ہی لگتا ہے۔

اِسی گنگا کے کنارے بہار کی راجدھانی پٹنہ کے آس پاس ایک بگھڑا ہوا ہندو فرقہ آباد ہے جنہیں لوگ اوگھڑ کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ لوگ گنگا کے کنارے جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اور ایک سردار کی سرداری میں اپنا سماجی نظام بنائے ہوئے ہے۔ یہ لوگ شیطان اور ظلمات کی پوجا کرتے ہیں اور اُسی بحرِ ظلمات میں ڈوب کر مست و مگن رہتے ہیں اور مردار کھاتے ہیں۔ جب لوگ مردے کو چتا میں جلا کر اُس کی استھیوں کو گنگا میں بہاتے ہیں تو یہ لوگ اُس جلے ہوئے مردے کا سر

حاصل کر کے، کھوپڑی توڑ کر اُس کا مغز حاصل کر کے بھُنا ہوا مغز بڑے چاؤ سے کھا لیتے ہیں یا پھر کسی قبرستان سے مردہ لاش چُرا کر اُس مردے کا گوشت بڑے شوق سے نوشِ جان کر لیتے ہیں۔ گنگا ندی میں اکثر لاشیں بہتی رہتی ہیں۔ کوئی واردات کی نذر ہو جاتا ہے، کوئی عورت خودکشی کی غرض سے ندی میں کُود جاتی ہے، کسی کا پاؤں پھسل جاتا ہے یا کوئی تیرنے نہانے کے دوران ڈوب جاتا ہے، کسی کو قتل کر کے ندی کو سونپ دیا جاتا ہے، کوئی بھاڑ میں بہہ جاتا ہے۔ ایسے مواقع اُوگھڑ لوگوں کے لیے مسرت خیز اور فرحت آگیں ہوتے ہیں۔ وہ ایسے موقعوں پر خوب مردہ گوشت کھا کر خوب جشنِ لحم خوری کرتے یں اور اوپر سے تاڑی کے دو گھونٹ گنگا پُتروں اور گنگا پتریوں کو کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور اُن کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں خوب رقصِ ابلیس ہوتا ہے۔ اور کسی موقعہ پر اگر ایک جوان عورت یا لڑکی کی لاش مل جائے تو اُس وقت خوشی دوبالا بلکہ سہ بالا ہو جاتی ہے اور نوجوانوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ اُس مردہ عورت کا باقاعدہ ہار سنگار کر کے اُسے نئے جوڑے پہنا کر بلکہ دلہن بنا کر اُس کے ساتھ شادی رچائی جاتی ہے اور پھر اُس ٹھنڈے گوشت کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی قائم کیے جاتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد اُس مردہ دلہن کو بھی ہڑپ کیا جاتا ہے۔ وہ کیا کرتے ہیں، کیا کھاتے ہیں، بساند بھرا سڑا گوشت اُن کو کیسا سواد دیتا ہے، اُس کے ساتھ اُن کا کوئی سروکار نہیں۔ اس فعلِ شنیع کے کر گذرنے کے بعد اُن کے ماتھے پر کبھی بل نہیں پڑتا کیونکہ یہ چیزیں سامری کی اولادوں کی فطرت ثانیہ بن چکی ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کے پارلیمنٹری منصب کے دوران ایک بار لحم البقر پر پابندی کا بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا تھا جس کی ہر طرف سے پذیرائی ہوئی تو مولانا مرحوم نے کھڑے ہو کر پنڈت

نہرو سے کہا تھا:

''پنڈت جی آپ لحم بقر کھانے والوں سے اُن کا حق چھین رہے ہیں''۔

بل نا منظور ہوا، مگر آج تک کسی پارلیمنٹ ممبر نے مردہ انسانوں کی بے حرمتی ہونے کے خلاف کبھی کوئی بل سبھا کے سامنے پیش نہیں کیا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے، وجہ فقط اتنی سی ہے کہ :

نگاہیں جب بھی اُٹھتی ہے اُسی نقطے پہ رُکتی ہیں

چند سال قبل بھارتی ٹیلی ویژن نے ایک مفصل ڈاکومینٹری فلم بنا کر ایشیا سیوا کی چینل پر اُسے پرسارت بھی کیا تھا اور دنیا جہاں نے اس بات کا مشاہدہ کیا جس سے وہ تب تک غیر واقف تھے۔ سات آٹھ سال قبل ریاض سعودی عربیہ میں اپنے آٹھ ماہ کے قیام کے دوران راقم الحروف نے بھی یہ بائیسکوپ شاید دوبئی ٹراول چینل یا کسی اور چینل سے مشاہدہ کیا تھا کیونکہ دوسو چینلز میں دیکھی ہوئی چیز اور وہ بھی کافی وقت گذرنے کے باعث پھر طاقِ نسیاں ہو جاتی ہے اس وجہ سے میں حتمی طور نہیں کہہ سکتا کہ کس چینل سے دیکھی تھی۔ بہر حال حیرانگی اس بات پر نہیں ہوتی کہ میں نے کیا دیکھا تھا، حیرانگی اس بات پر بھی نہیں ہوئی کہ وہ لوگ کیا کرتے ہیں اور کیسے کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں اور کب سے یہ پرم پرا چلی آرہی ہے لیکن یقیناً حیرانگی اس بات پر ہے کہ اتنی مقدس دھارا، اتنی پوتر ندی، اتنے عظیم دریا، جس کا تقدس ہندوؤں کی نس نس میں بسا ہوا ہے اور اعتقاد والوں کے لیے جس میں صرف نہانے سے ہی وارے نیارے ہو جاتے ہیں، پاپ دُھل جاتے ہیں، اسی پوتر ندی کے گھاٹوں یا کناروں پر ایسی گھناؤنی اور حیا سوز حرکات کی جاتی ہیں اور الیکٹرانک میڈیا نے اِسے پرسارت یا مشتہر کر کے آخر کیا ثابت کرنا چاہا تھا۔ ایک عجیب وغریب حیران کُن ایونٹ، انفارمیشن بلیٹن یا اپنی کوتاہیاں،

کمزوریاں، شرمندگیاں ____ کمال ہے صاحب۔ گندھے تھان یوں سب کی نظروں کے سامنے دھوئے نہیں جاتے۔ جس نے بھی اس بات کی اجازت دی ہوگی اُس کا مواخذاہ ہونا چاہیے، نہیں تو بھارت دیس مہان کا نعرہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔

اوگھڑ قبیلے کے سردار نے میڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

''ہم کسی زندہ انسان سے اُس کا زندہ رہنے کا حق نہیں چھینتے، کسی جیو (زندہ شے) کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے ہیں۔ ایک مردہ انسان جس کا کریا کرم بھی ہو چکا ہو۔ اُس کے ساتھ بعد میں کسی کا کچھ لینا دینا نہیں ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد ایک انسان کو آگ میں بھسم کریں، مٹی میں فنا کریں، چیل کوؤں کے آگے ڈال دیں یا درندوں کی خوراک بنائیں، اُس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ مردہ جسم ایک بیکار شے ہوتا ہے۔ اگر ہم اُس کا ماس کھاتے ہیں تو کیا بُرا کرتے ہیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ مردہ انسانوں کا گوشت کھانے سے ہمارے اندر ایک مہان شکتی آجاتی ہے اور ہم مافوق الفطرت صلاحیتوں اور طاقتوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ ندی میں بہتی ہوئی ایک بیکار لاش جو کسی کام کی یا مصرف کی نہیں ہوتی مگر وہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے''۔

ہمارے بھارت کی ایک نہیں انیک تصویریں ہیں۔ کئی چہرے ہیں، کئی شکلیں ہیں، یہاں کئی رنگ وروپ کے لوگ ہیں اور طرح طرح کے پہناوے پہنتے ہیں۔ یہاں کئی زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ یہاں گورے بھی ہیں اور کالے بھی، سانولے بھی ہیں اور شام رنگ بھی، یہاں سنگ دل بھی ہیں اور دل والے بھی۔ یہاں تنگ دل بھی ہیں اور فرزانے بھی۔ دنیا میں کہیں اتنی شرابیں نہیں پی جاتی ہیں جتنی یہاں ڈکار لی جاتی ہیں۔ مغرب ممالک میں فیکٹریوں اور کارخانوں میں بنی

ہوئی صاف ستھری شراب ہی پی جاتی ہے جب کہ یہاں حوضوں اور گڑوں میں واہیات اشیاء سے کشید کی ہوئی شراب غلاظت اور کیڑوں مکوڑوں کے ساتھ ہی نوشِ جاں کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں سالانہ ہزاروں لوگ حرام موت کے ساتھ ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ مغرب میں عورتیں بلاشبہ شراب نوشی کرتی ہیں مگر تعداد دیکھی جائے تو یہاں کروڑوں عورتیں شغل مے نوشی میں ملوث ہیں۔ ناجائز استحصال، بلات کار اور اپنے قریبی رشتہ داروں ک ساتھ زنا بالجبر کے واقعات جتنے یہاں ہوتے ہیں، مغربی ممالک میں اتنے نہیں ہوتے۔ ناری کلیان کیندر اور آشرم وغیرہ جو اصل میں ''اونچے لوگ'' اور نام نہاد دھرماتماؤں ک رکھیل خانے اور عیاشی کے اڈے ہیں کے علاوہ جتنے قحبہ خانے، جتنے فحاشی اور جسم فروشی کے بازار یہاں ہیں، کُل دنیا میں اُتنے کیا ہوں گے۔ یہاں صرف عرصہ پنسٹھ سال میں چیاسٹھ ہزار سے زیادہ دنگے کرا کر سماج دشمن اور ملک دشمن عناصر نے مسلمان بچیوں کی بے حرمتی کر کے موت کو گلے لگانے پر مجبور کر دیا۔ یہاں سابقہ تین برسوں میں (۱۱-۲۰۰۹ء) ڈھائی ہزار فرقہ وارانہ فساد کرا کے اقلیت کو خاک چٹائی گئی۔

(۳)

یہاں بالعموم مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا گیا ہے۔ یہاں جھوٹے مقدمات میں مسلمانوں کو پھنسا کر مختلف بہانے تراش کر اُن کی زندگی ختم کرنا ایک عام سی بات ہے۔ یہاں مسلمانوں کو پھانسی کی سزا سنائے جانے پر مسلم دشمن عناصر ڈھول تاشے بجا کر پٹاخے چھوڑتے ہیں۔ یہاں چند سال قبل گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ وہ کچھ کیا گیا جس کی مثال صفحہ گیتی کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور وہی انسانیت سوز مظالم ڈھانے میں جس کا ڈائرکٹ ہاتھ تھا اور جس نے مسلمانوں کی

وہ حیا سوز گت بنتے دیکھ کر مٹھائیاں بانٹی تھیں اور خوشی سے جھوم کرناچنا شروع کیا تھا، اُسی ملک دشمن عنصر کو ہماری ریاستی سرکار نے ریاست میں فرقہ وارانہ آگ بھڑکانے کی اجازت دی۔ کتنی افسوس ناک صورت حال ہے یہ یہاں کے ستم رسیدہ لوگوں کے لیے۔

پنڈت نہرو نے تقسیم ملک کے موقعہ پر مسلمانوں کا پاکستان ہجرت کرنا پسند نہیں کیا تھا کیونکہ وہ اُن سے تیسرے درجے (Menial labour) کا کام لینا چاہتے تھے، گرچہ آج ویسا ہی ہو رہا ہے مگر مسلمان تیسویں (3oth) درجے سے بھی گئے گذرے بنا دیے گئے ہیں۔ یہاں بے گناہ مسلمانوں کو قاتل اور دہشت گرد کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بغیر عدالت میں پیش کیے جیلوں میں سڑایا جاتا ہے اور حقیقی دہشت گرد اور قاتل کو حکومت کی چشم پوشی کی وجہ سے مزید ایذا رسانی کا موقعہ فراہم ہوتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے دین اور مذہبی کتابوں کی اہانت کی جاتی ہے مگر کسی کو کچھ کہنے، کچھ کرنے کا یارا نہیں ہے۔ کوئی احتجاج کرے بھی تو اُس پر کالے قانون نافذ کر کے اُسے مال و جان سے ہی ہاتھ دھونا پڑتا ہے یا احتجاج کے دوران ہی گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے لیے رجعت پسند گروہوں کی جانب سے یہ حکم ہے کہ وہ تب تک ہی بھارت میں رہ سکتے ہیں جب تک وہ اُن کے حکم پر عمل درآمد کرتے رہیں گے۔

یہاں ابھی حال ہی میں راجوری جموں کے مقام پر ایک جمہوریت دشمن، ملک دشمن، انسان دشمن اور خاص طور پر مسلم دشمن، زبان دراز نے وہ زہر افشانی کی کہ ملک کی انسان دوست جنتا دھنگ ہو کے رہ گئی۔ کیا ہندوستان کے سیکولر مرحومین کی روحیں بے چین اور زندہ دعویداروں کے اجسام پر رعشہ طاری نہیں ہوا ہوگا جب اُس بے ہودہ یاوہ گو نے کہا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے اور

اگلے پانچ دس برس تک یہ خواب مکمل طور سے پورا کیا جائے گا۔ تو اُس کا کیا مطلب ہوا، گویا اگلے پانچ دس برسوں میں مسلمانوں، سکھوں، ہریجنوں، عیسائیوں، پارسیوں، یہودیوں، چینیوں، بودھوں اور دیگر چھوٹی چھوٹی جماعتوں، ذاتوں اور اعتقاد رکھنے والے جو تعداد میں کسی طرح سے ستر کروڑ لوگوں سے کم نہ ہوں گے کا قلع قمع کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ اُن کو نابود کرنے والے ہی زعفرانی طاغوتی جماعت ہی ہوگی۔ کمال ہے شداد نے بھی جنت بنائی تھی اور فرعون ونمرود نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ کیا یہ عقل کا کورا سفلہ ذہن اس قدر تعصب میں اندھا ہو چکا ہے کہ ہٹلر وبُش اور چنگیز وہلاکو بن کر اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اس بات کو بھول جاتا ہے کہ جب تک اُس کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا (جو انشاء اللہ کبھی پورا نہیں ہوگا) تب تک انہی اقلیتوں میں اور بیس کروڑ لوگوں کا اضافہ ہوا ہوگا اور بلا شبہ اُن میں ضرور ایک ایسا جیالا بھی پیدا ہوگا جو اپنی چپل سے نمرود کے علاج کی طرح اُس مُنہ پھٹ کے سر پر سات سُروں کی ملہار میں ڈھول بجائے گا۔

اُسی کجرو، کج فہم اور مخبوط الحواس نے یہ بھی چیتاونی دی تھی کہ ہندوستان کے چھ لاکھ گاؤں میں بسنے والے مسلمانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی۔ ٹھیک ہے لیکن جب تک اینٹ بھٹے سے باہر آئے گیا تب وہ کروڑوں لوگ اُس کا پتھر سے پتھر نہیں بجادیں گے۔ حیرانگی ہوتی ہے کہ یہ بے علم جاہل ایسی بے سروپا باتیں کر کے مسلمانوں کے ہندوستان پر احسانات کیوں بھول جاتا ہے۔ جب محمد بن قاسمؒ مسلمان قیدیوں کو چھڑانے کے لیے وارد سندھ ہوا تھا جہاں راجہ داہر نے اپنی ہی بہن کو اپنی زوجیت میں رکھا تھا تو اُن کا مقابلہ جس فوج نے کیا تھا____ مورخوں نے لکھا ہے کہ وہ تنگ ڈھڑنگ خالی ایک لنگی یا دھوتی میں ملبوس تھے۔ کیا یہ اسلام دشمن بھول گیا کہ مسلمانوں نے آکر لوگوں کو لباس پہننا سکھایا، کیلے یا دیگر

پتوں پر کھانا کھانے کی بجائے ظروف کا استعمال سکھایا، محفل نشینی اور مجلس آرائی سکھائی، زراعت، مال گذاری اور ریونیو کے قانون دیے، رسل ورسائل کے طریقے سکھائے۔

جب اشوک، چندر گپت اور بکرما دتیہ جیسے بادشاہوں کے نافذ کردہ سیاسی و سماجی بلکہ مذہبی اصول اور طرز وفکر وعمل، طریقہ معاشرت اور انسانی اقدار کو لوگ پس پُشت ڈال کر لہو ولہب، آوارگی اور پھوہڑ پن میں مبتلا ہو چکے تھے اور عورت اپنی عفت وعظمت کے منصب سے کافی نیچے گر چکی تھی، اتصال واختلاط کے مختلف طریقے مذہبی شکل اختیار کر چکے تھے اور جن کی پاداش میں کھجراہو جیسے منادر وجود میں آچکے تھے۔ اُس دورِ ابتلا میں جنگل کے وحوش بھی اُس وقت کے ہندوستانی کی کھِلی اڑا رہے تھے۔ کیا ایسے وقت میں ہندوستان کو مسیحاؤں اور ریفارمروں کی ضرورت نہیں تھی جو انسانیت کے رستے ناسور پر پھاہا رکھتے اور عزت وآبرو کے چلن سکھا کر، انسان کو انسانیت کے دائرے سے یہ روشناس کراتے۔ یقیناً ہندوستان کو وہ مصلح مسلمان بادشاہوں کے روپ میں ملے۔ مسلمانوں نے آتے ہی عورت کے مراتب اور عظمت وعزت کو بحال کیا۔ دیوداسی اور ستی جیسے حیا سوز اور ننگِ انسانیت رسوماتِ بد پر ممکن حد تک قدغن لگادی اور ایک عدل وانصاف بھرا ماحول اور معاشرہ پیدا کیا جس میں رعایا کے علاوہ تمام امراء ووزراء حتیٰ کہ بادشاہ کے لیے بھی ایک ہی قانون تھا، مشترکہ قانون تھا اور سزا بھی سب کے لیے یکساں تھی۔ اگر یہ سب گپ ہے، جھوٹ ہے تو پھر بتائیے کہ بادشاہ محمد تغلق جسے متعصب مورخوں نے بیوقوف ثابت کرنے کی از حد کوشیں کیں ہیں، کیا بھرے دربار میں اپنی رعایا کے سامنے کوڑے کھاتا، کیا وہ سزا سُنانے والے قاضی کو قبل از وقت یہ اطلاع کراتا کہ ''میں ایک ملزم کی حیثیت سے داخل عدالت ہوں گا، کوئی میری پیشوائی نہ

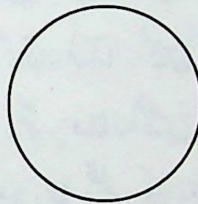
کرے اور نہ کوئی احتراماً کھڑا ہو جائے''۔ سزا کے دوران (بقول ابن بطوطہ) بادشاہ کی کلاہِ شاہی عام لوگوں کے پیروں میں جا گرتی ہے مگر بادشاہ اُس کا کوئی ملال نہیں کرتا اور لوگ اُس کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ کیا شیر شاہ سوری گھر کی عزت کو عدالت میں کھڑا کرتے اور جہانگیر بادشاہ ملکہ ہند کو بھرے بازار میں کٹھرے میں ایستادہ کرتے۔

افسوس ہوتا ہے اُس دریدہ دہن، سیاہ دل و دماغ والے مقرر پر۔ اُس کو مسلمان دورِ اقتدار میں غیر ملکی حملہ آور نادر شاہ (۱۷۳۹ء) اور احمد شاہ ابدالی (تیسرا حملہ ۱۷۵۶ء) یاد رہے مگر فیروز شاہ، علاؤالدین، محمد تغلق، التمش، شیر شاہ سوری، جہانگیر، اکبر اور اورنگ زیب یاد نہیں رہے۔ مسلمان دورِ اقتدار میں ہندوستان کا عالم دنیا میں ایک عظیم المرتبت درجہ حاصل رہا اور یہی وہ نو سو سالہ دور تھا جب سچ مچ ہی شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ مذکورہ زبان دراز کو جان لینا چاہیے کہ مسلمان بادشاہوں نے اِسی ہندوستان میں عدل و انصاف کی عظیم مثالیں قائم کیں ہیں۔ رواداری اور بھائی چارے کے درس دیے ہیں اور سچی جمہوریت کی ترجمانی کی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اِسی ہندوستان میں معمولی باتوں کے لیے اور غیر مسلموں کی شکایتوں اور نالشوں پر، قاضیٔ شہر کے حکم پر عوام کے روبرو خود سزائیں قبول کی ہیں، اُٹھائیں ہیں، کوڑے کھائے ہیں اور خزانہ عامرہ کو ہاتھ لگائے بغیر ٹوپیاں بنا بنا کر اپنی شاہانہ پوزیشن میں فقیری کی زندگی گذاری۔ مندروں کے لیے جاگیریں واگذار کیں اور مندروں کے چراغوں کے لیے گھی کی فراہمی خزانہ عامرہ سے جاری رکھی۔ کیا اُن ہی منصف مزاج، خداترس، سچے سیکولر اور عظیم لوگوں کی اولادوں کو اب اس میں ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر مسلمان غیر ملکی ہیں تو آریہ بھی تو غیر ملکی ہی تھے۔

اصلی ہندوستانی تو دراوڑ قوم کے لوگ ہیں جو جنوبی ہند کے اطراف واکناف میں محدود ہو رہ گئے ہیں ۔ اگر مقرر مذکور کو غیر ملکی ہو کر یہاں رہنے کا حق بنتا ہے تو مسلمانوں سے یہ حق کیوں چھینا جا رہا ہے۔ اُس کو ساحر لدھیانوی کے الفاظ میں نوشتہ دیوار پڑھ لینے کا ہم مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں جو اس طرح سے ہے۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچۂ بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ کہیں نعرہ کہیں پتھر بن کر
خون چلتا ہے تو رُکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے
ظلم کی بات ہی کیا ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تک
خون پھر خون ہے سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

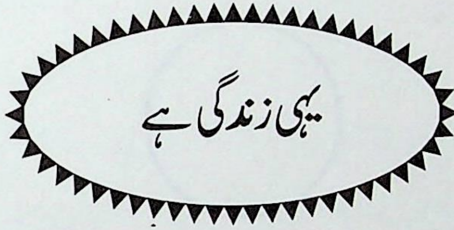




یہی زندگی ہے

یہی دنیا یہی دنیا کے عیشِ بیکراں ہوں گے
یہ سب ہوگا مگر اے عمر فانی ہم کہاں ہوں گے

(ریاض الدین ریاضؔ)


یہی زندگی ہے

سازٹوٹ جاتے ہیں ____ راگ پھوٹ جاتے ہیں ____ نغمے بکھر جاتے ہیں ____ گیت کھو جاتے ہیں ____ راگنیاں معدوم ہو جاتی ہیں ____ خوش گلو آوازیں بے نوا ہو جاتی ہیں ____ رقص تھم جاتے ہیں ____ پیشوازیں تار تار بکھر جاتی ہیں ____ سازندے اپاہج ہو جاتے ہیں ____ صدائیں گونگی ہو جاتی ہیں ____ ساتھ چھوٹ جاتے ہیں ____ محبتیں خواب و خیال ہو جاتی ہیں ____ راحتیں روٹھ جاتی ہیں ____ وفائیں بے وفائی کا جامہ زیب تن کرتی ہیں ____ قول و قرار قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں ____ چاہتیں یادِ ماضی ہو جاتی ہیں ____ دل کی دنیا ویران ہو جاتی ہے ____ رنگ و نور کی بہاروں پر اوس پڑ جاتی ہے ____ پیار کا مخمور جہاں بے آب و گیاہ صحرا ہو جاتا ہے ____

امارت کا عصاء پر کاہ ہو جاتا ہے ____ تاج گر جاتے ہیں اور سلطنتیں مٹی میں مِل جاتی ہیں ____ تخت ڈھے جاتے ہیں ____ اور کج کلاہیں ڈھیر ہو جاتی ہیں ____ حکمرانی مُنہ پیٹتی ہے ____ اور جاہ و جلال دھول چاٹتا ہے ____ شبستان، شمشان بن جاتے ہیں ____ کاشانے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں ____ حویلیوں میں چمگادڑ ڈیرہ جماتے ہیں ____ اور محلوں پر اُلو بولنے لگتے ہیں ____ گنبد اوندھے اور کنگھورے زمین بوس ہو جاتے ہیں ____ بالا خانے سونے اور ایوانوں پر مکڑی کے جالے تن جاتے ہیں ____ تابدار موئے اسود اور عنبریں کاکلیس بے کشش اور پھیکے موئے ابیض میں تبدیل ہو جاتے ہیں ____ زلفیں زِشت رو ہو جاتی ہیں ____ سرو جیسے قدِ بالا کمان ہو جاتے ہیں ____ روئے

گلنار پر آڑھی ترچھی جھریاں ڈیرہ ڈال دیتی ہیں ____ حُسن ماند پڑ جاتا ہے ____ عشق واویلا کرتا ہے ____ خوبصورتی دہائی دیتی ہے ____ نغمگی سے معمور کوئل کی کوک جیسے میٹھے بُلاوے ____ پوپلے مُنہ سے سمع خراش آوازیں بن کر آتی ہیں ____ خوش گفتاری پر ہکلاہٹ اور نسیاں کی چھب بسیرا کرتی ہے ____ دلکش طرحداری لاٹھی کی مرہونِ منت ہو جاتی ہے ____ یادداشت طاقِ نسیاں کی زینت بن جاتی ہے ____ دلکش و پُر کشش رنگ واعضاء لکڑی کے لٹھ ہو جاتے ہیں ____ چتون، چیتھڑا ہو جاتی ہے ____ لبِ لعلین سوکھے پھول ____ اور ستوان ناک گورغریباں ہو جاتی ہے ____ پُر جلال و جمال چہرے چرمی تھوتڑے ہو جاتے ہیں ____ غزالی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں ____ چمکدار اور روشن جبینیں سلوٹوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔

موتیوں کا آب اُتر جاتا ہے ____ گوہر کی چمک جاتی رہتی ہے ____ ہیرے پتھر اور جواہر خاک ہو جاتے ہیں ____ نگینہ نیم اور نتھ نعل ہو جاتی ہے ____ نگار خانے آہ وحسرت کے مرکز بن جاتے ہیں ____ فروزاں شمعیں سیاہ دھبے ہو جاتے ہیں ____

اسی کا نام دنیا ہے ____ اور یہی زندگی ہے ____ ایسی ہی دنیا کی ریت ہے اور اگر یہی دنیا کی ریت ہے ____ اور یہی زندگی ہے ____ جو بے رحم اور بے مروت ہے ____ تو ____ تو ہم اُس کے پیچھے دیوانے بنے کیوں پھرتے ہیں ____ دنیا کے پیچھے کیوں بھاگتے رہتے ہیں ____ فانی زندگی کو کیوں سجاتے اور سنوارتے ہیں ____ کیوں نہ راحت والی ابدی زندگی کی طرف کچھ توجہ کی جائے ____ بلکہ اُس طرف بھر

پورتوجہ کرنا ہی صحیح سمت اور فرزانگی کے تقاضے ہیں ______ لمبی نیند لینے سے پہلے ______ دوسرے کے کندھوں پر سواری کرنے سے قبل ______ یہ دیکھنا ضروری ہے ______ کہ ہم ساتھ کیا لے کر جا رہے ہیں ______ ہماری جھولی میں کیا پس انداز ہے ______ اُدھر شہر خموشاں میں ______ لالہ وگل ______ شاہ وگدا ______ اعلیٰ وادنیٰ ______ امیر وغریب ______ پارسا و بدکار ______ کے مدفن میں ______ پھولوں کا بستر بچھا ہے ______ یا کانٹوں کی سجی بھی ہے ______ راحت کے ہنڈولے ہیں ______ مستی کے جھولے ہیں ______ طراوت کی پینگیں ہیں ______ خوشبو کے جھونکے ہیں ______ یا اذیت کے سامان ______ آگ کی لپیٹیں ہیں ______ بدبو کے بھبکے ہیں ______ یا شکنجے ک ایذا رسانی ______ عزت کا استقبال ہے ______ یا بے عزتی کی دُھتکار ______ گھور اندھیرا ہے ______ یا روشن قندیلیں ______ ہیبت ناک ہیولے ہیں ______ یا معصوم نورانی فرشتے ______ جنت کے نظارے میں ______ یا جہنم کے شعلے ______

سوچیے ______ سوچیے ______ غور کریے ______ مگر پلیز جلدی کیجیے ______ ایسا نہ ہو ______ کہ دیر ہو جائے ______ وقت نکل جائے ______ دنیا کی محبتیں سدراہ بن جائیں ______ مال وزر ______ آل و اولاد ______ خاندانی حشمت و رعونت ______ کرسی و قلم ______ منصب و مصاحبت ______ سوداگری و تجارت ______ مصروفیت و مشغولیت ______ لیڈرانہ طمطراقی آڑے آجائیں ______ اور ______ اِسی غفلت میں سب دھرے کا دھرا رہ جائے ______ اور اجل ______ یعنی

مقررہ پل ______ سفر کی گھڑی ______ کوچ کرنے کا سمے ______
دنیا کو چھوڑ دینے کا وقت ______ آن پہنچے ______ تو پھر ______ پھر کچھ بھی نہیں ہوسکتا ______

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل زمرد سیم و زر
جب پونجی بات میں بکھرے گی تو پھر آن بنے گی جان اوپر
نقارے نوبت بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکان کیا چوکی کرسی تخت چھپر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارا

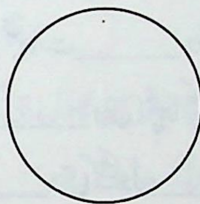
(نظیرؔ)

ارے ہاں! ایک بات بتانا تو میں بھول ہی گیا ______ آپ کے چلے جانے سے ______ دنیا کو چھوڑ کر جانے سے ______ کچھ نہیں ہوگا ______ آپ کے عزیز ______ آپ کے بچھڑ جانے کے غم میں ______ چار دن آنسو بہائیں گے ______ اُن چار دنوں میں روز رات کو ''واز وان'' (خوش لذت پکوان) کھاتے رہیں گے ______ اور پھر سب آپ کو بھول جائیں گے ______ دنیا کی نیرنگی دلچسپیاں اُن کو اپنے اندر مدغم کرلیں گے ______ دنیا کاروبار ______ حسبِ معمول چلتا رہے گا ______ بابو دفتر کو اور دوکاندار ہٹی پر چلا جائے گا ______ مزدور روزی روٹی جٹانے چل پڑے گا ______ کسان ہل لے کر کھیتوں کی جانب دوڑے گا ______ بھیڑ بکریوں اور گائیوں بیلوں کے ریوڑ ______ چراگاہوں کی جانب جائیں گے ______ چرواہوں کی مُرلی کی تانیں بکھریں گی ______ چرواہنوں کی پازیبیں جھنجھا اُٹھیں گی

______ گوالنیں دودھ کے گھڑے لے کر شہر کا رُخ کریں گے ______ گوالے گھوڑا گھوڑی جوتنے میں لگ جائیں گے ______ ہر اہلِ فن اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے مستعد ہو جائے گا ______ اور ہر کاروان اپنی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جائے گا ______ رات کو قمقمے جل اُٹھیں گے ______ اور دن کو اُجالے میں آپ کی یاد کی طرح بجھ جائیں گے ______ بدلے گا کچھ بھی نہیں ______ وہی دن ______ اور وہی رات ______ وہی شام وسحر کے اوقات ______ وہی دھوپ چھاؤں ______ وہی چاندنی ______ اور وہی اماوس کی رات ______ وہی بہار وخزان کی سوغات ______ وہی گریشم ______ وہی گھن گرج ______ اور وہی برسات ______ وہی پھول اور وہی پات ______ وہی نور اور وہی ظلمات ______ وہی محفل ______ وہی مجلس ______ اور وہی ملاقات ______ وہی اِچھائیں ______ وہی آرزوئیں ______ اور وہی صدمات ______ وہی کشکول ______ وہی جھولیاں ______ اور وہی خیرات ______ وہی قانون ______ وہی لاٹھی ______ اور وہی الزامات ______ وہی بیڑیاں ______ وہی سلاسل ______ وہی کال کوٹھری ______ اور وہی حوالات ______ وہی بھونرے ______ اور وہی باغات ______ وہی محل وایوان ______ اور وہی کھنڈرات ______ وہی راستے ______ اور وہی حادثات ______ وہی دل ______ وہی دنیا ______ اور وہی جذبات ______ یہی وجہ ہے کہ ریاض الدین ریاض کا شعر اپنی طرف توجہ مبذول کراتا ہے

یہی دنیا یہی دنیا کے عیشِ بیکراں ہوں گے
یہ سب ہوگا مگر اے عمر فانی ہم کہاں ہوں گے

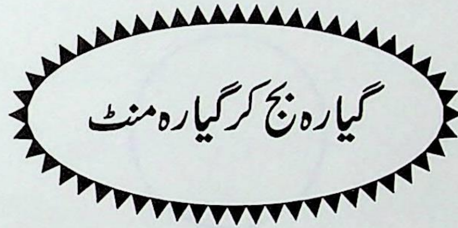
☆☆☆



گیارہ بج کر گیارہ منٹ

کبھی شور قیامت سے سکوں برہم نہیں ہوتا
کبھی راتوں کے سناٹے قیامت بن کے آتے ہیں

(آوارہ سلطان پوری)


گیارہ بج کر گیارہ منٹ

اکیس دسمبر سن ۲۰۱۲ء دن کے گیارہ بج کر گیارہ منٹ پر آنے والی مفروضہ تباہی کے حوالے سے سابقہ دو تین سال سے لگ بھگ ساری دنیا حیران و پریشان ہے اور سمجھ نہیں پا رہی ہے کہ آخر کیا ہونے والا ہے اور کیا ہوسکتا ہے مگر وادی میں اس کا کوئی خاص ردِ عمل دیکھنے میں نہیں آ رہا ہے۔ سابقہ دو برسوں میں لگ بھگ بیس کتابیں اس سلسلے میں مارکیٹ میں آ گئیں ہیں جن میں خاص طور پر مایان تہذیب کیلنڈر اور ہم عصر سائنس دانوں کے نظریات پر تذکرہ ملتا ہے جب کہ کچھ دانشوروں کے نقطہ نظر پر بھی وضاحت ملتی ہے۔ خیال کیا جاتا کہ مذکورہ تاریخ پر اگر قیامت (Doomis Day) تو نہیں مگر کم از کم ایک ہولناک تباہی (Catastrophe) ممکن ہے جس میں دو تین ارب لوگوں کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس سلسلے میں مختلف نظریات اور آراء پر مشتمل چند سطور قارئین کرام کی نذر ہیں:

''ہندو دھرم میں چار ویدوں کو الہامی یا آسمانی کتابیں تصور کیا جاتا ہے جبکہ وید ویاس کو اُن کا مؤلف (Compiler) مانا جاتا ہے۔ مذکورہ کُتب میں سے دھیان گیان، پوجا پاٹھ اور منتر وغیرہ کے حوالے سے رگ وید کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، اُسی وید میں ایک شلوک ہے:

مژھا ، رکرما ، وراہا ثرے

نرسینہہ وامنے........

رامو راما کرشنا ثرے

بدھا گارگی تتھو ثرے

شلوک کی پہلی لائن کا مطلب ہے مچھلی، کچھوا اور سُور ______ مراد اس

سے تین زمانوں کا ورنن یا اشارتی انداز سے تین زمانوں کی نشاندہی ہے۔ پہلا زمانہ مچھلی سے منسوب، مراد ستیہ یگ سے ہے، مچھلی ایک فائدہ مند شے ہونے کے ساتھ ساتھ شریف، حلیم الطبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا جانور ہے۔ گویا ستیہ یگ یعنی سچائی کا وہ زمانہ ہے جس میں دھرم کے کام دھام اور دھرماتماؤں کی عزت ہونے کے ساتھ اپنے دھارمک کاموں میں مگن رہ کر دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑانا بھی شامل ہے۔ اپنے دھرم کرم کے کاموں کے ساتھ ہمہ تن مشغول ومصروف رہ کر ایشور کی خوشنودی حاصل کرنے کی طرف ایک اشارہ ہے۔ اس یگ میں ہر اعتبار سے شانتی ہی شانتی ہوتی ہے۔

کچھوا یعنی دواپر یگ یا دوسرا دور۔ اس زمانے میں دھرم کے کام سُست رفتاری کے ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ دھرم کرم، گیان دھیان اور ریاضت وعبادت میں سُستی آجاتی ہے۔ برہمنوں اور دھرماتماؤں کی عزت کم ہو جاتی ہے۔ کچھوا چونکہ ایک سُست رو جانور ہے مگر ضرر رساں بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس سے یہ مطلب ہے کہ اس زمانے میں گرچہ برائیاں شروع ہو جاتی ہیں مگر مجموعی طور سے عوام الناس محفوظ وماموں ہی رہتے ہیں۔ یہ زمانہ زیادہ ہانہ کارک یعنی نقصان دہ نہیں مانا گیا ہے گرچہ برائیوں کی نیب پڑ چکی ہوتی ہے۔

سُور: یہ تیسرے زمانے یعنی ترتھیہ یگ کی طرف ایک اشارہ ہے۔ مطلب یہ کہ سور کی گردن میں چونکہ لچک دار ہڈی نہیں ہوتی ہے اس لیے وہ دائیں بائیں دیکھے بغیر اپنی ناک کی سیدھ میں آگے ہی آگے کو بڑھتا ہے۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں، کیا اچھا ہے، کیا بُرا ہے اُس سے قطع نظر وہ مُنہ اُٹھائے سامنے کی جانب ہی نظر رکھتا ہے۔ اس سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں برائیاں اور بُرے کاموں کو عروج ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ آدمی یہ نہیں دیکھتا کہ کیا اچھا ہے کیا بُرا ہے۔ اُس

کے دائیں اور بائیں کیا ہے۔ کیا لینا ہے اور کیا چھوڑنا ہ اُس سے قطع نظر وہ صرف مُنہ اٹھائے ادھرم گناہ اور گندگی کی جانب ہی اپنی توجہ مبذول رکھتا ہے۔ برہنموں اور دھرماتماؤں کی عزت خاک میں ملنے لگتی ہے اور دنیا مصیبت کی جانب جانے لگتی ہے۔

شلوک کے الفاظ میں یہ تین زمانے اپنی رفتار سے گذرتے جائیں گے۔ پھر نرسنگھ اور وامن اوتار آئیں گے۔ راموکا ظہور ہوگا، اُس کے بعد رام آئیں گے اور پھر کرشنا کی آمد ہوگی۔ اُس کے بعد مہاتما گوتم بدھ آئیں گے اور ازاں بعد گارگی کی آمد ہوگی اور یہ سلسلہ اِسی طرح چلتا رہے گا۔ حتیٰ کہ کل یُگ کا آغاز ہوگا۔ چونکہ مجھے شلوک کے باقی حصے کی تفسیر وتشریح اس وقت مقصود نہیں اس لیے میں مطلب کی طرف آ کر عرض کرنا چاہوں گا کہ مذکورہ تین زمانے گذرنے کے بعد کل یُگ کا آغاز ہوگا جس میں واضح طور پر ہر سُو اندھکار ہی اندھکار ہوگا۔ ادھرم یعنی لادینیت عروج پر ہوگی۔ دھرم کو نقصان پہنچے گا اور گناہ کی رغبت اور بدچلنی کا راج ہوگا۔

ہندو دھرم کی ایک روایت کے مطابق کل یُگ کا آغاز سن ۳۰۱۲ ق م میں ہو چکا تھا اور ہر یُگ کی عمر پانچ ہزار سال بتائی جاتی ہے۔ چونکہ اگر کل یُگ کی عمر بھی پانچ ہزار سال مان لی جائے تو اُس حساب سے کل یُگ سن ۲۰۱۲ء میں ختم ہو جاتا ہے اور اُس حساب سے اُس کے بعد پرلی یعنی (Devastation) ہو کر پھر سے ستیہ یُگ کی ستھاپنا ہو جاتی ہے۔ یعنی پھر سے ایک اچھے زمانے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ہندو دھرم کی مشہور کتاب کے مطابق ایسا ہوا ہے اور ہوتا آیا ہے کیونکہ ہم گیتا میں پڑھتے ہیں:

یدا یداہ در مسیئے

گلانر بو تہ بھارتے

ابھیو تھانم اور میسئے

تدا آتما نم سر جاہم

پری تری آنا یہ سادھو نام

وناشا یہ چہ دُھشکر نام

دھرم سنتھا پنارتھا یہ

سنمبوائے یُگے یُگے

اس شلوک کے بعد بھگوت گیتا کے مشہور مترجم شان الحق حقی نے یوں نظم کیا ہے:

جہاں میں دھرم جب بگڑے

استیہ کا جب بھی ہو غلبہ

تو آتا ہوں میں ارجن

بول کرنے دھرم کا بالا

چلا آتا ہوں میں بھگتوں کو

ہر یگ آسرا دینے

بڑھانے دھرم کی شکتی

شریروں کو سزا دینے

تو مطلب ہوا کہ جب جب دھرم کو مخالفت کا سامنا ہوتا ہے اُسے نقصان پہنچتا ہے اور ادھرم یعنی لادینیت بڑھ جاتی ہے۔ گناہ، فحاشی، بدکاری عام ہو جاتی ہے تب تب میں یعنی بھگوان (بلا شبہ انسانی روپ میں) دنیا میں آ کر ادھرمیوں یعنی منکرین و کافرین کا ناش کرتا ہوں اور دین کو پھر سے ستھاپن یعن مستحکم (stable) کرتا ہوں اور شلوک کی آخری والی لائن جو ہے اُس میں بھی بتایا گیا ہے

سنمبوائے یُگے یُگے یعنی ایسا یگوں یگوں سے ہوتا رہا ہے۔ ایسا زمانوں سے ہوتا آیا ہے۔ یہاں اس بات کو بھی نوٹ کرنے کی حاجت ہے کہ ادھر بھی قیامت کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہی تاثر ملتا ہے کہ لادینیت اور منکرین کو ختم کر کے پھر سے صحیح دین قائم کیا جاتا ہے۔ گویا پھر سے ستیہ یگ کی شروعات ہوتی ہے پھر سے ایک اچھے زمانے کا آغاز ہوتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو زمانہ قدیم کی تاریخ کے ہر صفحے پر ہمیں اِس بات کے اشارے ملتے ہیں۔ ایرانی، یونانی، رومی، مصری اور ہندی تہذیبوں اور ادیان کا خلفشار دیکھیے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہی دنیا کی عظیم تہذیبیں تھیں پھر اِن ممالک کے تہذیبی، تمدنی اور مذہبی ورثے کو دیکھیے کہ دنیا کی حالت کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ ہر سُو جہالت اور دیوانگی کا ایک مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کائنات کی سب سے قیمتی شے عورت کو بھیڑ بکری کی طرح بیچا اور خریدا جاتا تھا اور ایک جوتے کی طرح بدلا جاتا تھا۔ اُس پر مستزاد عرب کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور اخلاقی حالت پر غور فرمایئے جس کو بتانے کے لیے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ بقول مولانا حالیؔ

قبیلے قبیلے کا بُت اک جُدا تھا
کسی کا ہُبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزیٰ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا
اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
چلن اُن کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر ایک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ

نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
جوا اُن کی دن رات کی دل لگی تھی
شراب اُس کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا ، غفلت تھی ، دیوانگی تھی
غرض ہر طرح اُن کی حالت بُری تھی

اور پھر جب دنیا مکمل طور سے بحر ظلمات میں ڈوب چکی تھی تو رحمت حق جوش میں آ گئی اور دنیا میں ایک بار پھر بلکہ آخری بار حق سبحانہ کی جانب سے رحمتوں کی بارش برسنے لگی ۔

ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نوید مسیحاؑ

اور اللہ تعالیٰ نے اس عصیاں زدہ بندے پر کرم فرما کر ارشاد کیا:

ترجمہ: وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اُسے سب (تحریف شدہ اور خودساختہ) دینوں پر غالب کرے چاہے پھر منکرین و مشرکین اس بات کو ناپسند ہی کریں۔

(القرآن:۹:......۲۸)

تو پھر جہاں ایک طرف وحشیانہ پن ، جہالت اور دیوانگی دور ہوئی ، ظلمات کے بادل چھٹ گئے ، آفتاب عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگشت مبارک (سبابہ اور بڑی انگلی) دکھا کر فرمایا کہ قیامت اور میں اس طرح سے ہیں۔

(۲)

گویا اُن کا مطلب تھا کہ قیامت بہت قریب ہے۔ مگر صحیح تاریخ، سن، زمانہ نہیں بتایا۔ البتہ مختلف مواقع پر مختلف آثارِ قیامت بیان فرمائے جن کا مفصل ذکر احادیث کی مختلف کتابوں میں ہے اور جن کے بارے میں آئے دن ممبروں اور ٹیلی ویژن چینلوں سے تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں پیس ٹی وی قابل ستائش ہے کہ جس کے منتظموں نے اس بارے میں باقاعدہ ایک سلسلہ وار پروگرام کر کے ناظرین کو روشناس کرایا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہندو دھرم کے حوالے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ سن ۲۰۱۲ء میں ایک بہت بڑی تباہی (Mass destruction) ہو سکتی ہے۔ اُس کو ہم قیامت (Dooms Day) اس لیے نہیں کہہ سکتے کیونکہ بتایا گیا ہے کہ اُس کے بعد پھر سے ستیہ یگ شروع ہو جائے گا۔ ''تتھوڑ ے'' کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اس ضمن میں اب دوسرے حوالوں کی طرف آتے ہیں۔

مایان:۔ دنیا میں کئی ایک قوموں اور تہذیبوں کی طرح مایان تہذیب بھی ایک زمانے میں اس دنیا میں اپنی ذہنی، علمی، جسمانی اور عقلی موشگافیاں کر کے اور اپنے پیچھے کچھ آثار چھوڑ کر اُسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ گئی جس طرح یونانی، مصری، رومی تہذیبیں قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط اور اصحابِ حجر وغیرہ اساطیر الاولین بن کے رہ گئیں۔ مایان تہذیب کا عروج موجودہ لاطینی امریکہ میں سن ۲۰۰۰ ق م سے ۲۵۰۰ تک رہا۔ وہ قوم علم ریاضی میں طاق اور علم فلکیات کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں تین کیلنڈر بنائے تھے۔ جن میں ایک کیلنڈر کی ابتداء ۱۳/ اگست ۳۱۱۴ ق م سے ہو کر ۲۱/دسمبر ۲۰۱۲ء پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ کیلنڈر نظام

شمسی کے مطابق ۳۶۵ دنوں پر مشتمل ہے اور اُس کی بنیاد اجرام فلکی یعنی سیاروں کی گردش پر رکھی گئی ہے اور مایان لوگوں کے مطابق ۲۱ ردسمبر دن کے گیارہ بج کر گیارہ منٹ پر زمین اور کہکشاں ایک لائن میں آجائیں گے جس سے کرۂ ارض پر بڑی تبدیلیاں رونما ہوں گی اور اُس کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ گویا مایان کی یہ پیش گوئی اوپر مذکور ہندو دھرم کی پیشن گوئی ''پھر سے ستیہ یگ شروع ہو جائے گا'' کے ساتھ مطابقت (Coincide) رکھتی ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مایاں تہذیب کا یہ علم یا یہ پیشن گوئیاں اُن کے اپنے پیچھے چھوڑی ہوئی وراثت تصاویر اور پتھروں کے کتبوں میں کندہ آثار کی صورت میں موجود ہیں۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ ۲۱ ردسمبر ۲۰۱۲ء کے بعد اُنہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے اِسی لیے اُن کا شمسی کلینڈر اِسی تاریخ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔۔ اس کلینڈر کے مطابق وہاں سے ایک نئے دور کا آغاز ہو جائے گا۔ جان میجر جنکنس نے مایان کے نظام کائنات سے متعلق اُن کے خفیہ پیغامات کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مایان نے اپنے علم ہیئت اور علم ریاضی کی بنیاد پر یہ بات دریافت کر لی تھی کہ ہماری کہکشاں کے مرکز میں سورج کی سیدھی گردش یا دونوں کا ایک سیدھ میں آنا نسل انسانی کی ارتقائی عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سیاروں کا اس طرح سے ایک دوسرے کی سیدھ یا بالمقابل آنا نسلِ انسانی کے کئی ادوار کے خاتمے کا پتہ دیتی ہے اور اِس طرح سے چوتھی انسانی نسل ۲۱ دسمبر کو ختم ہو رہی ہے جب انسانی تاریخ کا ایک اور دور اختتام پذیر ہوگا۔ مایان کلینڈر کے مطابق وقت کی نوعیت ایک دائرے (circle) جیسی ہے جس کا نقطہ آغاز و انجام ایک ہی ہے۔ اِسی طرح اِس سلسلے کی ایک اور کتاب ''روحوں کی جنگ'' میں مرقوم ہے:-

۲۱/دسمبر ۲۰۱۲ء انسانی تاریخ میں ایک انتہائی حساس دن ہوسکتا ہے جس پر دنیا کے لوگوں کی دھڑکتے دلوں کے ساتھ نظریں مرتکز ہوچکی ہیں۔ ہر چھبیس ہزار سال کے بعد سیارہ اراض ہماری کہکشاں کے مرکز کی سیدھ میں آجاتا ہے۔ ۲۱/دسمبر ۲۰۱۲ء کے دن کے گیارہ بج کر گیارہ منٹ پر ایسا پھر ایک بار روبہ عمل آئے گا اور قدیم مایان نے اس تاریخ کو دنیا کا خاتمہ مانا ہے ـــــــ نہ صرف موجودہ انسان کا بلکہ اُس کے علم و آگہی کا، اُس کے حاصل کردہ سائنسی و ٹیکنالوجی علم و عمل کا بھی۔

اسی سلسلے کی حالیہ شایع شُدہ ایک اور کتاب بہ عنوان ''قدیم پیشن گوئی'' میں مصنف رقمطراز ہے:۔

''سیارہ ارض سن ۲۰۱۲ء میں ایک ناگہانی آفت سے دوچار ہونے والا ہے۔ اس کی کشش ثقل ناگہانی آفت کی نذر ہوکر ایک جھٹکے میں درہم برہم ہوجائے گی۔ غیر معمولی بھونچال اور سمندری لہریں ہماری نسل انسانی کو مکمل طور سے نیست و نابود کردیں گی۔ یورپ اور شمالی امریکہ ہزاروں میل شمال کی جانب کِھسک کر قطبی موسم میں آجائیں گے۔ تقریباً ساری دنیا کی آبادی ان غیر معمولی مظاہر قدرت کی نذر ہوکر فنا ہوجائے گی۔ یہ دہشت ناک پیشن گوئیاں مایاں اور مصری نسل کے اساطیری لوگ اٹلانٹس سے وابستہ ہیں۔ اٹلانٹس نے علم فلکیات میں یدطولیٰ حاصل کیا تھا اور یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے سن ۹۷۹۲ ق م میں آنے والی عالمِ آب یا طوفانِ نوح کی قبل از وقت اور صحیح صحیح پیش گوئی کی تھی۔ سال ۲۰۱۲ء میں زہرہ، مشتری اور دوسرے کئی سیارے

اُسی حالت میں آئیں گے جیسے وہ سن ۹۷۹۲ ق م میں آئے تھے۔

جب سابقہ جہاں گیر تباہی وقوع پذیر ہوئی تھی۔

معاصر سائنس دانوں نے مارچ ۲۰۰۴ء میں ہمارے نظام شمسی میں دسویں سیارے کی دریافت کی تھی جس کا نام انہوں نے سیڈنا (Sadna) رکھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ سن ۲۰۱۲ء میں یہ سیارہ مریخ اور مشتری کے درمیان سے گذرے گا اور اُس وقت اُس کا فاصلہ زمین سے قریب ترین ہوگا جس کی وجہ سے زمین میں خطرناک اُتھل پُتھل ہوسکتی ہے۔ یہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ امریکی خلائی تحقیقی ادارہ ناسا (Nasa) نے ایک جوہری میزائل پر کافی عرصے سے کام شروع کر رکھا ہے جس کا نام ڈیپ امپکیٹ (Deep Impact) رکھا گیا ہے۔ یہ میزائل مقررہ وقت پر سیڈنا سیارے پر داغا جائے گا جس سے اُس کے ٹکڑے تو ہوسکتے ہیں مگر یہ بھی امکان ہے کہ اُس کا ایک ٹکڑا زمین کے ساتھ ٹکرا کر ایسی تباہی لائے گا کہ زندہ بچنے والے لوگ پھر سے ویل ایجاد کرنے کی فکر میں جٹ جائیں گے یا بہ الفاظ دیگر غیر معتمدن زمانے میں لوٹ جائیں گے۔

ناسا کے مطابق سورج اپنے مدار کے گرد گیارہ سال میں ایک چکر مکمل کر لیتا ہے اور سن ۲۰۱۲ء میں ایرس (Eris) نامی سیارہ سورج کے قریب آجائے گا جس کی کشش ثقل کی وجہ سے سورج اپنا رُخ تبدیل کرے گا۔ ایسا کرنے سے سورج کی منفی تابکاری لہریں زمین کو اپنے حصار میں جکڑ لیں گی جس سے زمین پر شمسی طوفان آئیں گے۔ یہ سیارہ گردشِ نجوم کے مطابق ہر تین ہزار چھ سو سال کے بعد سورج کے سامنے آتا ہے۔

بعض سائنس دان یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک سیارہ نبرو (Nibru) یا پلینٹ ایکس (Planet-x) سن ۲۰۱۲ء میں زمین کے قریب سے گذرے گا اور اپنی کشش

ثقل سے زمین کے محوروں یعنی پولز (poles) کو تبدیل کر دے گا۔ جس سے قطب شمالی منطقہ باردہ شمالی اور اعلیٰ ہندالقیاس قطب جنوبی منطقہ حارہ میں تبدیل ہو جائے گا اور زمین کافی حد تک یعنی ۱۸۰ ڈگری تک گھوم جائے گی۔ مزید برآں اس سیارے کے زمین کے قریب گذرنے سے طوفانی لہریں اُٹھ اُٹھ کر ساحلوں اور ساحلی آبادیوں کو تباہ کر دیں گی۔ آتش فشاں پہاڑ پھٹ جائیں گے اور زلزلے برپا ہوں گے۔ بعض ماہرین سائنس یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ سیارہ جنوب کی جانب سے ہمارے نظام شمسی میں داخل ہو چکا ہے اور اُس کے اثرات جنوب میں واقع بر اعظم آسٹریلیا پر پڑنے شروع ہو چکے ہیں۔

یہودی روایات یعنی توراۃ کے مطابق یہودیوں کی جب سرکشی اور بدکرداری حد سے زیادہ تجاوز کر گئی تو بابل کے ایک آشوری بادشاہ بنوکدنضر، عربی علماء کے مطابق بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کیا اور یہودیوں کو تتر بتر کر دیا۔ کچھ مارے گئے، کچھ ملک سے بھاگ گئے اور کچھ قیدی بنا کر بابل پہنچائے گئے۔ اُنہی قیدیوں میں ایک بنی اسرائیلی پیغمبر حضرت دانیالؑ بھی تھے۔ تب بادشاہ بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر حضرت دانیالؑ کے سِوا کوئی نہ بتا سکا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ بابل اُن دنوں ایک عظیم الشان سلطنت تھی اور پرانے سات عجائبات میں سے ایک عجوبہ یعنی بابل کے لٹکتے باغ______ (Hanging Gardens of Babilonia) بھی اُسی ملک سے وابستہ تھا۔ اس کے علاوہ جن چار بادشاہوں نے آج تک پوری دنیا پر حکومت کی ہے بخت نصر اُن میں سے ایک بادشاہ تھا۔ بہر حال عرض کر رہا تھا کہ اُس کے بعد بذاتِ خود حضرت دانیالؑ اور اُس کے کچھ عرصہ بعد بخت نصر کے بیٹے بیل شنزر نے بھی خواب دیکھے جن میں آخری زمانے تک کے حالات کے بارے میں پیشن گوئیاں

ملتی ہیں مگر جو پردۂ راز میں رہ گئیں ہیں۔ چند اشارات توراۃ میں بلا شبہ ہیں مثلاً.....

''اور تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور بیل کی طرح گھاس کھائے گا اور سات دور تجھ پر گذریں گے''۔ (دانی ایل ب،۴، آیت ۳۲)

''جو کچھ تیرے لوگوں پر آخری ایام میں آنے کو ہے تجھے اُس کی خبر دوں کیونکہ ہنوز یہ رویا (خواب) زمانہ دراز کے لیے ہے''

(دانی ایل ب،۱۰، آیت ۱۴)

''اُس نے کہا اے دانی ایل تو اپنی راہ لے کیونکہ یہ باتیں آخری وقت تک بند اور سر بمہر رہیں گی''۔ (دانی ایل ب،۱۲، آیت ۹)

(۳)

مذہبی صحائف میں اور علماء کی بتائی ہوئی پیشن گوئیاں بہت کٹھن اور پیچیدہ الفاظ میں گھما پھرا کر کہی جاتی ہیں۔ اس لیے اُن کا سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ جہاں تک مندرجہ بالا حوالہ جات کا تعلق ہے اگر پہلی پیشن گوئی پر بات کریں تو سمجھنا مشکل نہیں ہے اُس کے ڈانڈے سائنس دانوں کی اُس بات سے ملتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ سیڈنا سیارے پر میزائل داغنے سے جو ایک ٹکڑا زمین کے ساتھ ٹکرائے گا اُس سے ایسی تباہی متوقع ہے کہ انسان پھر پتھر کے زمانے کی طرف لوٹ جائے گا اور جہاں تک دوسرے حوالے کا تعلق ہے اُس بارے میں کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی دور خلافت میں شام کے ایک علاقے میں حضرت دانیالؑ کی میت کے ساتھ ایک صحیفہ ملا تھا۔ حضرت عمرؓ نے میت کو بیری

کے پتے ملے، پانی سے غسل دینے کے بعد دفنانے کا حکم دیا تھا اور صحیفے میں مستقبل سے متعلق پیشن گوئیاں کے علاوہ یہ پیشن گوئی بھی مذکور تھی کہ ایک ناپاک ریاست پنتالیس سال تک قائم رہے گی پھر تباہ ہو جائے گی۔ توراۃ کے اوپر مذکور دوسرے حوالے پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہودیوں اور یہودی ریاست کی تباہی سامنے نظر آتی ہے کیونکہ ریاست کو وجود میں آئے زائد از پنتالیس سال ہو چکے ہیں۔ اصولی طور پر پیشن گوئیوں کے بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ واللہ عالم

اس سلسلے میں عالمی شہرت یافتہ مستقبل شناس اور حیرت انگیز پیشن گوئی کرنے والے ناسٹرڈیمس کی سنچری ،۳، قسط ۹۷، کو بھی اگر ملحوظ نظر رکھیں تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ وہ کہتے ہیں:

> A new law will occupy a new land around syria, Judea and palastine. The great babarian empire will crumble before the centary of the sun is finished.

اس پیشن گوئی کے معنی واضح ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ شام، جودیہ اور فلسطین کے آس پاس ایک نئی حکومت قائم ہوگی۔ جابر و ظالم عظیم سلطنت سورج کی صدی ختم ہونے سے قبل ہی ملیامیٹ ہو جائے گی۔

چونکہ عالم الغیب وشہادہ صرف رب کائنات ہی ہے اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک پیش بین خدا کے دیے ہوئے علم اور کشف و کرامات سے جو پیشن گوئی کرے وہ سو فی درست ثابت ہو جائے۔ اور اُسی وقت پوری ہو جائے جو وقت اُس نے اُس کے لیے متعین کیا تھا۔ اب اِسی پیشن گوئی کے لیے اس میں صدی ختم ہونے سے قبل ہی یعنی سن ۱۹۹۹ء میں ہی اسرائیل کی بربادی مقدر بتائی گئی تھی

اور نئی سلطنت غالباً حکومت فلسطین وجود میں آنے کی بات کہی گئی تھی۔ مگر یہ ربِ کائنات، خالق کون و مکان ہی جانتا ہے کہ کب کیا ہونا ہے، کب کیا کرنا ہے کیونکہ وہی مالک وخالق علیٰ کُل شیٍ قدیر ہے۔ مگر بہر صورت یہ عندیہ اس قطعے سے ملتا ہے کہ بکری کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ سن ۲۰۱۲ء ہی سہی انشاء اللہ اسرائیل کے دن اب گنے چُنے ہی ہیں کیونکہ یہود نے اسلام کی بیخ کنی کے لیے ساری دنیا میں فساد بہت دیر ہوئی شروع کر دیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ابتدائے اسلام سے ہی یہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ بقول قرآن حکیم:

ترجمہ: فساد نمایاں ہو گیا ہے۔ بر میں بھی اور بحر میں بھی لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ مزہ چکھائے اُن کے بعض اعمال کا شاید وہ سُدھر جائیں۔ (سورۂ روم، ۴۱)

جہاں تک اسلامی نقطہ نظر کا تعلق ہے اُس بارے میں ایک اجمالی ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے بہت قریب ہونے کے بابت تو فرمایا مگر حتمی طور سن، وقت یا زمانے کے بارے میں کوئی برملا ذکر نہیں فرمایا۔ البتہ قیامت بر پا ہونے سے قبل تین سو کے قریب آثارِ قیامت ارشاد فرمائے جن میں دو سو سے زیادہ آثار تو آ گے ہی پورے ہو چکے ہیں مگر جو خاص آثار مثلاً دابتہ الارض کا نکلنا، امام مہدی کا ظہور، دجال کی فتنہ سامانیاں اور حضرت عیسیٰؑ کا ظہور وغیرہ ابھی ہونا باقی ہے۔ اس لیے اُن نظریات یا آثار کے روبرو قیامت ضرور بہ ضرور ہوگی ایسا ہمارا ایمان ہے مگر بہت جلد ہوگی ایسا ممکنات میں سے نہیں ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ جب جب انسان کی جانب سے سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن لوگوں پر یا من حیث جماعت قوموں پر عذاب کا کوڑا برسا ہے۔

اہلِ مغرب خاص طور پر یہود نصاریٰ اور سائنس دان مذکورہ ممکنہ تباہی کو اپنے اپنے نقطہ نظر اور علم نجوم و علم ہیئت کی رُو سے دیکھ کر اُس کو ایک سائنسی تبدیلی کے طور پر لے رہے ہیں۔ جب کہ اجرام فلکی کی گردش سے کرۂ ارض پر آئے دن مختلف موسمی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بھونچال آتے ہیں، آتشی لاوے کا اخراج ہوتا ہے اور کبھی کبھی سونامی یا سائیکلون بھی آتے ہیں۔ مگر ہم کو بحیثیت مسلمان قرآن شریف میں مذکور اُن بستیوں اور قوموں کا حال بھی نظر میں رکھنا لازمی ہے جو صفحہ ہستی سے اس لیے نیست و نابود ہوگئیں کیونکہ انہوں نے دنیا میں مظالم اور سرکشی پھیلائی، بدی اور بداطواری کے مرتکب ہوئے۔ اس لیے جب ظلم و سرکشی حد سے تجاوز کرتی ہے تو رب کی پکڑ لازماً ہوتی ہے۔ قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں اہل مغرب نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا اُس سے قطع نظر تقریباً سابقہ ساٹھ برس سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ مغرب نے خصوصی طور پر مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور کیسا معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ اس لیے اگر آنے والی ممکنہ تباہی خاص طور پر اہل مغرب کے لیے ہو تو کوئی حیرانگی کی بات نہیں ہے۔

جب ہم سابقہ ایام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ محض بغض و عداوت کی وجہ سے تختِ خلافت پر اہل مغرب نے آرا چلوا دیا۔ عثمانی خلافت کی قلمرو کے تقریباً پچھتر فی صد ریاستیں، ملک اور شہر اور علاقوں کو اہلِ مغرب نے بندر بانٹ کیا اور اُسی طریقے سے عربوں یا اہلِ فلسطین جو اُس سے قبل خلافت کے زیرِ نگراں تھے کو ایک آزاد ملک بنانے کا فریب دے کر اُن سے ملک ہتھیا لیا اور یہود کو 'ہوم لینڈ' دیا گیا۔ وہاں صدیوں سے مقیم عربوں پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے گئے تا کہ وہ وطن چھوڑ کر بھاگ جائیں اور جنہوں نے ایسا نہیں کیا یا ٹیکس ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکے اُن سے مقرر کردہ افسران کے ذریعے نجی زمین زبردستی

چھین کر یہودیوں میں تقسیم کی گئی۔ اِسی طرح جن عرب بستیوں کو آگ لگا دی گئی یا لام سے لوٹے یہودی سپاہیوں کے ذریعے قتل کروایا تھا، سوچنے کی بات ہے کہ اُن سے ایک فی بھی خدا کا مقرب بندہ نہ تھا۔ جن بچوں کو سابقہ ساٹھ برس میں نیپام بموں سے بھون دیا گیا اور گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا کیا اُن بچوں کی ماؤں میں سے کوئی ایسی ماں نہیں تھی جس کی آہ ''فلک پر رحم کرلانے کے لیے'' نہ گئی ہو۔ کیا امت مسلمہ کی اُن بیٹیوں جو اسرائیلی جیلوں میں نا کردہ گناہوں کی پاداش میں ٹھونس دی گئی ہیں، کوئی ایسی بچی نہیں ہے جس کی عفت و عصمت لُٹ جانے پر فرشتوں تک نہ بین کیا ہو۔ کیا غزہ میں بھوکے، ننگے اور دوا کے قطروں کے لیے ترستے اُن مرد وزن، کبیر و صغیر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کی آہ و بکا رب نے نہ سُن لی ہو۔ کیا دیارِ غیر میں فلسطینیوں کے مہاجر کیمپوں میں تپش و پیاس سے بے حال بھوکے تڑپتے انسانوں میں سے کسی کا ''نالۂ نیم شبی'' مستجاب نہیں ہوا ہوگا۔ کیا آئے دن کی بمباری سے بے گھر و خانماں برباد ہونے والوں میں سے کوئی بھی ایسا سفید ریش بوڑھا نہیں رہا ہوگا جس کے آنسوؤں سے تر داڑھی کو دیکھ کر آسمان کے فرشتے بھی تڑپ نہ اٹھے ہوں گے۔

مغربیوں نے مل جُل کر افغانستان اور عراق پر حملہ کر دیا۔ افغانستان پر دہشت گرد تنظیموں کی آبیاری کا الزام لگایا اور عراق پر پسِ پردہ جوہری ہتھیار تیار کرنے کا الزام عائد کر دیا گیا۔ دنیا نے دیکھ لیا، بلکہ چند انصاف پسند مغربی دانشوروں نے بھی دونوں الزامات مسترد کر دیے اور یہ سارا کھڑاگ جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوا۔ سازش صرف یہ تھی کہ اُبھرتی ہوئی اسلامی طاقتوں کو قلع قمع کر کے اُن ممالک کے قدرتی وسائل پر قبضہ کیا جائے۔ افغانستان میں بے آب و گیاہ بنجر زمینوں تک کو بھی افغانیوں کے خون سے سیراب کر دیا گیا اور اسی طرح عراق میں

سربراہِ مملکت سمیت لاکھوں لوگوں کو خاک چٹائی گئی اور ہزاروں کو بے خانماں برباد کر دیا گیا۔ عراق سے صدیوں پرانی آثارِ قدیمہ اور قدیم تہذیبی و تمدنی وراثت جو صرف اور صرف عراق میں ہی محفوظ تھی کو یا تو لوٹ لیا گیا یا ضائع کر دیا گیا۔ اُن لاکھوں اور مہلوکین شہداء میں سے کیا کوئی بھی صحیح معنوں میں خدا کا بندہ نہ تھا۔ صوم صلواۃ اور شریعت کا پابند نہ تھا۔ کیا کسی کی ''دعائے سحر گاہی'' دربار کرم والتفات میں اپنی جگہ نہیں بناتی تھی۔

افغانی طالبان کو ٹریلروں میں بھر کر گرمی، بھوک، پیاس اور شکنجے کی سختی میں تڑپا تڑپا کر پانی کے بدلے اپنا ہی پسینہ پینے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ گونتانا موبے اور ابو غریب جیل میں عصر حاضر کے نام نہاد معتمدن، انسان دوست اور امن پسند سگ و شگالوں نے، دجال کے بیٹوں نے انسانیت کو اس طرح شرمندہ کیا کہ ہلاکو کی ایذا رسانیاں، ہٹلر کی بھٹیاں اور رومیوں کے کولوسیم کے انسانی شکار بھی اُن وحشت ناکیوں اور تعذیب رسانیوں کے آگے ماند پڑ گئیں۔ اُن مسلمان، نوجوانوں، بوڑھوں اور بچوں میں جو وہاں کی ہولناکیوں کا مشاہدہ کر کے زندہ بچ رہے یا وہ جو ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ بکھر کر شہید ہو گئے۔ کیا اُن میں سے ایک بھی ایسا خدا کا پیارا نہیں تھا، خالقِ کون و مکان کا محبوب اور مخلص بندہ نہ تھا۔ کیا اُس مستجاب الداوات نے اُن کی دلخراش چیخیں اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنا نہیں دیکھا۔ کیا اُن بے قصوروں اور مظلوموں کی وہ آہ و فغان عرشِ بریں پر اپنے لیے کوئی جگہ نہ بنا سکی؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔

تیونس، مصر، شام، لیبیا اور یمن ________ یہ سارے مسلمان ممالک ہیں۔ اِن ممالک میں خانہ جنگی کس نے کرائی۔ بہت پُرانا حربہ ہے یہ مغربیوں کا۔ آج بارہویں صدی عیسوی کا وہ دور پھر سے شروع ہو گیا ہے جب مسلمانوں کو

یہود ونصاریٰ آپس میں لڑاتا تھا اور خود الگ کھڑا ہو کر تماشہ دیکھا کرتا تھا۔

(۴)

بلکہ طرفین میں دوست بن کر حوصلہ بڑھاتا تھا اور ہر طرح کی مدد بھی کرتا تھا۔ ایسی مدد جس سے بھائی بھائی آپس میں ہی لڑ مر کز فنا ہو جائیں۔ اس وقت مجھے مجاہد اسلام حضرت صلاح الدین ایوبیؒ کی ایک تاریخی بات یاد آ رہی ہے۔ انہوں نے مغربیوں کے ساتھ صلیبی جنگ و جہاد (Crusades) میں نبرد آزمائی کے دوران ایک بار فرمایا تھا:

میری بات غور سے سنو اور یاد رکھو تاریخِ اسلام وہ وقت جلد دیکھے گی جب مسلمان رہیں گے مسلمان ہی لیکن اپنا ایمان بیچ ڈالیں گے اور صلیبی اُن پر حکومت کریں گے۔ لیکن انہیں قرآن کے وہ ورق یاد دلاتے رہنا جنہیں صلیبیوں نے پاؤں تلے مسلا تھا اور انہیں وہ مسجدیں یاد دلاتے رہنا جن میں کفار نے گھوڑے اور مویشی باندھے تھے اور باندھ رہے ہیں۔ انہیں مسلمان بیٹیوں کی عصمت یاد دلاتے رہنا جن بیٹیوں کو مسلمانوں کے قافلوں سے لوٹ کر اور یہود ونصاریٰ بنا کر حرموں میں داشتائیں بنا کر چھوڑا جاتا تھا۔ بیٹی کی عزت اور مسجد کا احترام مسلمان کی عزت کے نشان ہوتے ہیں۔ انہیں بتاؤ کہ جس روز تم عصمت اور مسجد کو ذہن سے اُتار دو گے اُس روز تم اپنے لیے جہنم بنا لو گے اور آخرت میں جو عذاب ہے اُس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

دیارِ مغرب کے اُن رجعت پسندوں، استعماری قوتوں، کالونسٹوں اور اسلام دشمنوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ”خدا کی بستی دوکان نہیں ہے“۔ یہ کیا سینہ زوری ہوئی

کہ جس ملک پر چاہا حملہ بول دیا، جس شہر پر چاہا قبضہ کر دیا، جس چیز کو چاہا اپنا لیا اور جو انسان ناپسندیدہ ٹھہرا اُسے جھوٹے مقدمات میں الجھا کر جیلوں میں ڈال دیا اور جس اسلامی مملکت کے سربراہ کو چاہا معزول یا قتل کر ڈالا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ضیاء الحق بُرا تھا تو کیا ذوالفقار علی بھٹو بھی بُرا تھا۔ اگر وہ بُرا تھا تو کیا شاہ فیصل بھی بُرا تھا۔ چلو وہ بُرا ہی سہی تو صدام حسین کو کس قصور میں پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اگر وہ بُرا تھا تو ظاہر ہے کہ کرنل قذافی بھی بُرا ہی ہوسکتا ہ۔ یہ یورپی اور مغربی طاقتیں ایک نیک اور محبِّ وطن مسلمان کو ساری دنیا میں ذلیل کر کے، اُس کے سر ناکردہ گناہ تھوپ کر اُسے یا تو پبلک سے مرواتے ہیں یا خود ہی خدائی فوجدار بنتے ہیں۔ صدام حسین نے گریٹر عراق کے خواب دیکھے تھے مگر طاغوتی طاقتوں کو وہ بھلا کیونکر مرغوب ہوسکتے تھے۔ کیا کرنل قذافی کے معاشقے بھی اُسی طرح ٹی وی سے لایو (live) مشتہر ہوئے جس طرح بل کلنٹن کے ہوئے تھے۔ کیا مرحوم بھٹو بھی کسی واٹر گیسٹ سیکنڈل کے ساتھ ملوث تھا۔ کیا شاہ مسعود کے ساتھ بھی کوئی کرسچین کیلر (نعوذ باللہ) وابستہ تھی۔ کیا عافیہ صدیقی نے واقعتاً افغانستان میں بندوق امریکی فوجیوں پر تان لی تھی جب کہ وہ افغانستان میں تھی ہی نہیں۔ ایک شائستہ شریف گھرانے دھان پان سی عورت کیا ایسا کرسکتی ہے۔ اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ اُسے سلاخوں کے پیچھے ڈال کر اُس کی اجتماعی آبروریزی کی گئی۔ کیا اس لیے کہ وہ ایک مسلمان عورت ہے اور شیطان کو شیطان کہتی ہے۔ (Calls a spade a spade)

انصاف کی بات ذرا خدا را بتایئے کہ اگر امریکہ کے مشہور تحقیقی ادارے نیویارک کولیشن فار اکاونٹ بلٹی فار نائن الیون دوسرے اسی فیلڈ کے ادارے آرکیٹکٹس اینڈ انجینئرس فار ٹروتھ آف نائن الیون اور یو ایس ملٹری آفیسرس فار نائن الیون ٹروتھ جیسے اداروں اور تنظیموں کے علاوہ امریکہ کے مشہور دانشور نوم

چومسکی، مصنف ڈیوڈرے گرفن، صحافیہ ایون، ریڈلی، ہزاروں انصاف پسند شہریوں اور برازیل، ارجنٹینا، جاپان اور ایران کی حکومتوں کے ذمہ داروں نے اس بات کا علی الاعلان دعویٰ کیا اور تحقیقی اداروں نے ثبوت وشواہد پیش کیے کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرانے والے جہازوں میں موجود پیٹرول سے ایسی ہمالیائی عمارتیں زمین بوس نہیں ہوسکتی تھیں بلکہ وہ اُن بموں سے ڈھے گئیں، خاکستر ہوئیں اور زمین بوس ہوگئیں جو اس مقصد کے لیے پہلے ہی سے نصب کیے گئے تھے اور ظاہر ہے کہ اُن کو سرکاری چھتر چھایا میں ہی پلانٹ کیا گیا ہوگا بالکل اُسی طرح جس طرح حملے کی سازش رچی گئی تھی تاکہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا جواز بن سکے۔ اگر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی تو مسلمانوں کو کیوں پھر بھی دہشت گرد ٹھہرا کر اُن کا ساری دنیا میں شکار کھیلا گیا اور آخر میں اُسی الزام میں اُسامہ بن لادن کو بھی شہید کردیا گیا۔ یہ ہے مغرب کا اندھا قانون، اندھا انصاف اور ورلڈ پولیس مین بن کر اجارہ داری اور سینہ زوری کا ایک ثبوت اور مسلمانوں کو یہ ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ یہ آج کی نہیں بلکہ ایک قدیم یہود سازش کے تحت یہ سب ہورہا ہے۔ اُسی سازش یا بہ الفاظ دیگر یہودی ایجنڈے کی پاداش میں سونے کے ذخائر پر قبضہ ہوا، دنیا میں بینک قائم ہوئے، سودی کاروبار شروع ہوا، سود کو مرغوب غذا کی طرح کھایا جانے لگا۔ سیکولرازم اور شوشلزم کی ترکیبیں وضع کی گئیں۔ عفت وعصمت کو پس پشت ڈال کر فری سیکس کا تصور دیا گیا۔ دنیا کی بدولت ہڑپ کرنے کی خاطر سوئزرلینڈ میں سربراہانِ مملکت اور ناجائز لین دین کرنے والوں کے لیے اپنی طرز کا انوکھا بینک قائم کیا گیا جس میں اکاؤنٹ ہولڈر کے مرنے پر اُس کی جمع شدہ ناجائز پونجی، ہیرے اور جواہرات سب آسانی کے ساتھ یہودیوں کے کھاتے میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ چونکہ اکاؤنٹ نمبر کسی کو معلوم نہیں ہوتا اس

لیے دعویدار بھی کوئی نہیں ہوتا یہ اور اس طرح کے بیسیوں کھڑاگ صرف ایک گریٹر اسرائیل بنانے کے لیے کیے جا رہے ہیں جس میں یہودی پالیسی سازوں کے بنائے ہوئے مجوزہ نقشے کے مطابق عراق، شام، اُردن اور لبنان کے پورے پورے ملک، ترکی کا جنوبی حصہ، سعودی عرب کا شمالی حصہ جس میں مدینہ طیبہ بھی آتا ہے اور فلسطین مع موجودہ اسرائیل تو شامل ہی شامل ہے۔ اس کے علاوہ مصر کے جشن کا علاقہ بھی اُس نقشے میں شامل ہے جو بہت خوبصورت اور زرخیز علاقہ ہے۔ توراۃ کے مطابق (پیدائش باب: ۴۷، آیت ۵) جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ، بھائیوں اور اُن کی ساری فیملی کو مصر بلوایا تو فرعون نے اُن کو رہنے کے لیے جشن کا زرخیز علاقہ ہی عطا کیا تھا۔

اسلام دشمنی میں یہود کس حد تک جا سکتا ہے وہ ایک بہت طویل داستان ہے مختصر طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ امریکہ کے اٹھانوے فی صد اخبارات، جرائد ورسائل کے مالکانہ حقوق یہودیوں کے پاس ہیں۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں مسلمان کو اور خاص طور پر دین اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ ریوٹر، ایسوسی ایٹڈ پریس، یونائیڈ پریس اور فرانسیسی نیوز ایجنسی موجودہ دنیا کی سب سے بڑی اور مشہور عالمی خبر رساں ایجنسیاں ہیں جو ہر دن لاکھوں اخباروں، رسالوں، ریڈیو سٹیشنوں اور ٹی وی چینلوں کو خبریں فراہم کرتی ہیں اور آپ کو یہ سُن کر حیرانگی ہوگی کہ یہ سب خبر رساں ادارے یہودیوں کی ملکیت ہیں۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں دنیا کے لاکھوں رسائل و جرائد اور الیکٹرانک میڈیا میں مسلمانوں کی شبیہ بگاڑ دیتے ہیں اور اُن کا مواخذہ اور اعتراض کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ ساری دنیا کا میڈیا ایک من گھڑت خبر کو بھی نہیں جھٹلا سکتا کیونکہ وہ ایک معتبر خبر رساں ایجنسی سے آئی ہوتی ہے۔ دنیا کی دولت پر قبضہ، دنیا کے سونے پر قبضہ اور دنیا کے پرنٹ و الیکٹرانک

میڈیا پر قبضہ یہودی ایجنڈے کی خاص شقیں ہیں۔

یہود جس میں یا جس جگہ چاہتے ہیں کسی بھی مسلمان سربراہ جماعت کو اپنے دجالی فورس موساد کے ذریعے قتل کروا دیتے ہیں۔ انہوں نے مصر میں حکومت، فوج اور جماعت میں گھُس بیٹھ کر کے اخوان المسلمین کی اینٹ سے اینٹ بجوا کر سرزمین مصر کو مومنین کے خون سے لالہ زار کروا دیا۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں ٹی وی چینلوں کے مالک یہودی ہیں اور وہ ہر گندہ پروپیگنڈہ مسلمانوں کے سر تھوپ کر مشتہر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں بشمول بھارت جب بم بلاسٹ ہوتا ہے تو ٹی وی نیوز اور اخبارات کی شہ سرخی مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے اور بصورت دیگر اگر بعدازاں وہ خبر جھوٹی ثابت ہوئی تو اُس کی تردید نہیں کی جاتی اور نہ ہی ادارتی سٹاف معذرت کرتا ہے۔ فلم دیکھنے والے شائقین نے دیکھا ہوگا کہ جو بھی فلم یہود بناتے ہیں اُن میں عربی لباس میں ملبوس ایک یا ایک سے زیادہ کرداروں کو شیطان صفت ثابت کیا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جن حضرات نے بائبل نام کی یہودیوں کی بنائی ہوئی فلم دیکھی ہوگی انہوں نے ضرور اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ فلم میں ذبیح اللہ حض اسحاقؑ کو دکھایا گیا ہے اور حضرت اسمٰعیلؑ کا فلم میں ذکر تک موجود نہیں۔ ذاتی طور پر مجھے اُس وقت بے حد حیرانگی ہوئی جب میں نے رائیڈر رہیگرڈ کی لکھی ہوئی ایک ایڈونچر ناول پر مبنی فلم دیکھی تو اُس میں یہود پروڈیوسر نے دو عربوں کو بھی ڈال دیا ہے۔ حالانکہ ناول میں اُس طرح کا کوئی بھی کردار نہیں ہے۔ مگر مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے اُن عربوں کو ایک انگریز لڑکی کی عزت پر حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک معمولی شیطنت ہے، اُن کے شیطانی حربوں کی داستان کافی طویل ہے۔ جن لوگوں نے خرطوم، چارپر، لارنس آف عربیہ، قلعہ ساگان، جنرل ڈکورٹا، پردار بلی اور اسی قبیل کی

فلمیں دیکھی ہوں گی انہوں نے مسلمان مرد زن سے متعلق فلمائی گئی گندی، شبیہہ دیکھ کر ضرور آنسو بہائے ہوں گے۔ مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے ورنہ اگر صرف مسلمانوں کے خلاف یا مسلمانوں کی کردار کشی پر بنائی گئی چند فلموں پر بھی تبصرہ کیا جائے تو کم از کم دو ہزار صفحات درکار ہوں گے۔

یہود اتنی گندی اور بدکردار قوم ہے کہ انہوں نے جنگ عظیم دوم کے دوران کنسنٹریشن کیمپوں اور جنگی قیدی کیمپوں میں اپنی بہو بیٹیوں اور ماں بہنوں کے ساتھ بھی بدکاری کی۔ اس قوم کے لیے دو اولوالعزم پیغمبروں حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بددعا کی تھی۔ (القرآن سورہ مائدہ، آیت ۷۸) اور یہی وہ قوم ہے جو دو عالمی جنگوں کی باعث بنی تھی۔ یہود کے حیوانی وجود کو صرف انسان کی تباہی (خاص کر مسلمانوں کی) اور بہتا انسانی خون مرغوب ہے۔ آج کل شام میں کیا ہو رہا ہے۔ بشارالاسد کی حکومتی فوج نے ہزاروں لوگوں کا قتل عام کیا جن میں بچے بھی شامل ہیں۔ املاک کی بربادی کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ اس ڈکٹیٹر کو بھی یہود کی مدد مل رہی ہے اور خون اُن کی منشاء کے مطابق بہہ رہا ہے۔ اسرائیل کو خدشہ لاحق ہے کہ اگر وہ اخوان المسلمین کی حکومتوں کے گھیرے میں آ گیا تو وہ ایک کمزور مملکت بن کے رہ جائے گا۔ اس وقت مغرب اور ورلڈ پولیس مین حقوق البشر کے پامالی کی بات کیوں نہیں کر رہا ہے۔ جرمنی کے قہر انداز حکمران ہٹلر نے غلط نہیں کہا تھا کہ یہود ایک ذلیل ترین گندی قوم ہے اس کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالو۔

جہاں تک مسلمان کی بربادی اور ہلاکت کا تعلق ہے یہ بلاشبہ اُسے اُس کے گناہوں اور نافرمانیوں کی سزا مل رہی ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ ہم اپنی گم گشتہ راہ پر پھر سے لوٹ آئیں۔ خالق و مالک سے سچے

دل سے معافی طلب کر کے آئندہ کے لیے صحیح معنوں میں تائب ہو جائیں۔ یقیناً ہمارا پروردگار رحمان و رحیم اور غفور و کریم ہے۔ اُس کی طرف صرف قدم بڑھانے کی دیر ہے وہ بندے کی جانب دوڑ کر آتا ہے۔ رہا مغربیوں بشمول یہود کا سوال تو یہ بات حتمی ہے کہ وہ ظلم و جبر، بربریت و استحصال میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اس لیے بروئے قرآن وہ بہت جلد رب کی پکڑ میں آ کر اپنے دردناک انجام کو پہنچ جائیں گے اور آنے والی تباہی بھی ضرور بہ ضرور انشاء اللہ اُنہی کے لیے ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

> اور آپ کے رب کی پکڑ ایسی سخت ہے جب وہ کسی بستی والوں پر دارو گیر کرتا ہے جو ظلم اور کفر کیا کرتے ہوں، بلاشبہ اُس کی دارو گیر اور پکڑ بڑی سخت اور الم رساں ہے (سورہ ہود: آیت ۱۰۲)

چھوٹی چھوٹی باتیں

جہاں روٹی کے ٹکڑوں کے لیے انسان ترستے ہیں
وہاں ساقی کے میخانوں کی باتیں کون سمجھے گا
(آوارہ سلطان پوری)

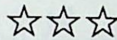
چھوٹی چھوٹی باتیں

آپ دن بھر دفتر کے مختلف معاملات میں اُلجھے رہتے ہیں۔ کاغذوں کے ڈھیر، فائلوں کے انبار، سُستانے اور دم لینے کی بات ہی نہیں آپ کو سر بلانے تک کی فرصت نہیں ملتی۔ اُس پر بڑے افسروں کے بُلاوے۔ یس سر نو سر کہتے کہتے دن بیت جاتا ہے۔ شام کو آپ تھکے ہارے بوجھل قدموں کے ساتھ کچھ سُستانے اور کچھ فریش ہونے کے لیے ہوٹل کی راہ لیتے ہیں۔ ہوٹل میں آپ پاؤں پھیلا کر اور کبھی کبھی جوتے اُتار کر اپنے تمام اعضاء کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ کو راحت ملتی ہے۔ اُس کے بعد آپ بٹر ٹوسٹ، سموسے، کانتی یا کباب اور خوشبودار گرم گرم چائے کی کئی پیالیاں نوشِ جاں کرتے ہیں۔ آپ بالکل فریش ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں۔ بل کی ادائیگی کے ساتھ آپ بیرے کو بیس روپیہ ٹِپ میں بھی دے دیتے ہیں۔ دفتر کے لیے نکلنے سے قبل صبح کو آپ نے بیوی کو ساگ باجی کے لیے بیس روپے دیے ہوتے ہیں۔ حالانکہ آپ یہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ بیس روپے میں وہ دھوئے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ اتنی مہنگائی کا زمانہ ہے بیس میں کیا آتا ہے۔ رات کو کھانے میں پھیکی ساگ کی سبزی آپ کے گلے میں اٹک جاتی ہے کیونکہ آپ کی ٹنکی فُل ہوتی ہے مگر آپ کے بیوی بچے سر جھکائے وہی کچھ کھا لیتے ہیں جو آپ نے اُن کے لیے مہیا رکھا ہوتا ہے۔ اب سارے بچے مُنہ پھٹ اور گُستاخ بھی نہیں ہوتے۔ یہ ماحضر کھا کر وہ رب کا شکر ادا کرتے ہیں اور آپ کے نتھنوں میں ہوٹل والے روسٹ گوشت کی اشتہاء انگیز خوشبو لہرا رہی ہوتی ہے۔ کل مالکِ یوم دین کے سامنے کون سا تھوبڑا لے کے جائیں گے۔ اپنی پسند اور اپنی مرغوب غذا کو اگر عیال کی پسند کے مشترکہ پلیٹ فارم پر لایا جائے تو کیسا رہے گا۔ اُن کا نان ونفقہ تو آپ ہی کے ذمہ ہے۔ اُن کی

منتظر نگاہیں آپ سے ایک خاموش گلہ کرتی ہیں۔ کیا آپ ایک اچھے باپ اور ایک اچھے شوہر ثابت نہیں ہونا چاہتے اس میں دونوں جہانوں کی سرخروئی ہے۔

بھئی سوچو ــــــ ذرا غور کرو ــــــ کیا کر رہے ہو ــــــ یہ کباب کھاتے، تکے اڑاتے، چٹنی چکھتے اور چائے پیتے کہیں دیر نہ ہو جائے اور آپ کا پتہ کٹ جائے۔ عیال کی دلبری بھی ایک عبادت ہے تو پھر اس عبادت کے آپ ساجھی دار کیوں نہیں بنتے۔ ہاں! ہاں ــــــ سوچیے ــــــ سوچیے مگر پلیز ذرا جلدی کیجیے۔

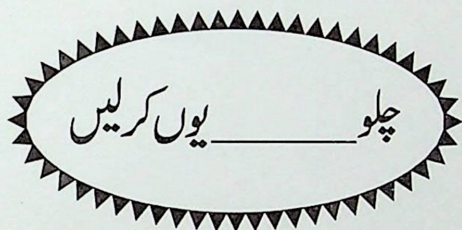
وقت کا دھارا تیزی کے ساتھ بہتا ہے۔



چلو ـــــــــ یوں کرلیں

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں
جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اُس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے
اُس وقت یہ شبنم موتی ہے

(مجازؔ)


چلو_____یوں کرلیں

پُرانے قصے کہانیوں میں آیا ہے کہ کسی ملک میں ایک حجام روز صبح سویرے محل میں بادشاہ کی حجامت بنانے کے لیے جایا کرتا تھا۔ فارغ ہونے کے بعد اُسے محل سے رات کا بچا ہوا کھانا جس میں مختلف پکوان ہوتے تھے، اور ایک روپیہ نقد ملتا تھا۔ حجام اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ضیافتیں اڑاتا تھا، دن بھر حسب معمول اپنا کام کر کے اور بھی کچھ کما لیتا تھا اور بادشاہ کا دیا ہوا روپیہ پس انداز کر لیتا تھا۔ حجامت بنانے کے دوران اُسے بادشاہ نے کئی بار پوچھا کہ شہر اور رعایا کا کیا حال ہے تو حجام نے جواب میں کہا:

"بادشاہ کا اقبال بلند ہو۔ شہر میں امن وامان ہے، لوگ خوش ہیں، اچھا کھاتے ہیں، پیتے ہیں اور روز کا ایک روپیہ بچا بھی لیتے ہیں"۔

کہانی معمولی سی ہے مگر اس سے یہ نتیجہ بخوبی نکالا جا سکتا ہے کہ حجام خود خوشحال تھا۔ اُسے اچھا کھانا پینا مل رہا تھا اور بادشاہ کا روز دیا ہوا روپیہ وہ بچا بھی لیتا تھا، اُس لیے اُس کی نظروں میں اُس شہر کے سب لوگ اُسی جیسے تھے جب کہ حقیقت اُس کے برعکس تھی۔ یہ فطری تقاضا ہے کہ انسان ہمیشہ دنیا کو فقط اپنی ہی عینک سے دیکھتا ہے، اپنی ہی نظروں سے پرکھتا ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا فرمانا ہے کہ۔

اے سیر شکم تُرا نانِ جویں خوش نمی آید

مطلب یہ کہ ایک بھرپور شکم سیر شخص کے سامنے جو کی روٹی کیا وقعت رکھتی ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر موجودہ دور میں ایک شخص ایک دعوت سے لوٹا ہو، اُس نے مُسرف میزبان کے ہاں بیسوں مختلف سالنوں یا ضیافتوں کے ساتھ چاول کھائے ہوں، دہی کا ڈبہ ڈکار لیا ہو، اوپر سے کوک کا گلاس بھی نوشِ جاں کیا ہو اور گرمی ہوئی تو آئس کریم، ٹھنڈ ہوئی تو زعفرانی حلوے

کی پلیٹ بھی اپنی اندھیری کوٹھری میں ذخیرہ کی ہو تو اُس کے سامنے اُن مفلوک الحال مرد و زن اور بچوں کی کیا حیثیت ہے جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں اور گندگی، تعفن و بدبو کے انباروں سے گتے کے ٹکڑے، پلاسٹک کی بیکار چیزیں، پھٹے گلے سڑے جوتے، لوہے کے زنگ آلود کیل و کانٹے، گندے ٹوٹے ظروف اور میل و مل سے لدی بوتلیں چُنا کرتے ہیں۔ اور شام کو کاٹھ کباڑ جمع کر کے، دو پتھروں کا چولہا بنا کر اُس پر ہانڈی چڑھا لیتے ہیں۔ ایسے روز کنواں کھود کر پانی پینے والے یا وہ یتیم و صغیر بچے، بیوہ عورتیں، جن کے کمانے والے دنیاوی معاشی وسیلے مکافات عالم یا عصری کالی آندھیوں انسانی شکار کے شوقین سند یافتہ شکاریوں نے چھین لیے ہوں۔ وہ اپنی خستہ حال جھونپڑیوں میں کونوں کھدروں میں دبکے اپنی نگاہیں دروازے پر ٹکائے اس آس میں بیٹھے ہوں کہ شاید کوئی خدا کا بندہ، اُن کا درد جان کر از راہِ انسانیت چند دانوں کی خیرات اُدھر بھی ڈال دے۔

اپنا پیٹ بھرا ہو، تن پر صاف و شفاف اور خوش نما لباس ہو، جیب بھاری ہو اور ایک اچھی خاصی آسودگی بنک کی جمع شدہ پونجی سے بھی جھلکتی ہو تو اُس وقت بقول اسرار الحق مجاز ؎

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں
جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اُس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے
اُس وقت یہ شبنم موتی ہے

صورت حال ایسی ہو تو ایسا شخص بہے ہوئے آنسوؤں سے چہرے پر بنی سفید لکیر، بھوک سے بے حال ہو کر بلکنا، سردی میں تن پر نا کام چیتھڑے ہونے کی

وجہ سے ٹھٹھرنا اور لاحق عارضوں کی وجہ سے دوا دارو کے لیے تڑپنا کیا جانے۔ وہ گرم گرم شبنمی آنسوؤں کی دھارایں پھولوں پر جمنا کیا سمجھے، وہ آہ وفغانِ نیم شبی کی کسک کو کیا محسوس کرے۔ اُس کو ہر کوئی اپنا جیسا ہی لگے گا۔ ہاں! اگر کوئی تڑپ دیکھی ہو، کوئی تکلیف جھیلی ہو، کوئی مصیبت سہی ہو، کوئی چھبن لگی ہو، کوئی درد پایا ہو، غم واندوہ، ظلم وجبر اور استحصال کے ساتھ نبرد آزمائی کی ہو تو اُس صورت میں اُس میں کچھ احساس جاگنے کی توقع ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ گلستان میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اگر جہنم کے فرشتوں کو وہاں سے نکال کر اعراف میں ڈال دیا جائے تو تھوڑی سی راحت محسوس کر کے وہ اُسے ہی جنت کہیں گے اور اِسی طرح اگر جنت کی حوروں کو جنت سے نکال کر اعراف میں لایا جائے تو معمولی سی سختی محسوس کر کے وہ اُسے جہنم سمجھ لیں گے۔

آئے دن اخباروں میں آتا ہے مخیّر حضرات، انسان دوست بزرگ اور کئی والنٹیر اور اعانت کار تنظیموں سے جو کروڑوں روپیہ متاثرین اور مستحقین کی باز آباد کاری کے لیے دنیا کے کونے کونے سے وادی میں آتا ہے، اُس کے لیے الگ سوداگر متعین ہیں جو اُس مال کی سوداگری کرتے ہیں مگر ہمیں اُس سے قطع نظر نام نہاد اور فریبی سوداگروں سے الگ رہ کر ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کی خود سے دلجوئی اور دلبری کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں دفتر کھولنے اور بورڈ آویزن کرنے کی کیا حاجت ہے۔ کیا آپ کو اپنے محلے کے بارے میں واقفیت نہیں ہے۔ اپنے اردگرد پاس پڑوس میں تو آپ کے سامنے کالی اور سرخ آندھیوں نے آکر چمنوں کے چمن اور گلستانوں کے گلستان ویران کر ڈالے۔ ہنستے مسکراتے باغوں کو تاراج کر ڈالا۔ میچی آنکھوں، جھکی پشتوں اور لچکتی نازک ڈالیوں پر اتنا بوجھ آن پڑا کہ وہ تاب نہ لا کر چٹک گئیں۔

اپنا حق ادا کرتے رہے۔ روزِ محشر میں اور باتوں کے علاوہ ابتدائی انٹرویو میں ہی آپ سے آپ کے مال کے بارے میں سوال ہوگا۔ آپ اپنے دینی فرائض کو ضرور ترجیح دیجیے مگر اذان اور نماز کے درمیان میں بھی کچھ وقفہ ہوتا ہے۔ تو اُس دوران بھی انس و عافیت، دلبری و دلجوئی کے جام لنڈھائے جا سکتے ہیں۔ شاعر ندا فاضلی نے اچھا مشورہ دیا ہے ؂

گھر سے مسجد بہت دور ہے
چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

گویا ہر گام پر ہمارے کچھ کرنے اور کچھ عملانے کے لیے ایجنڈا موجود ہے۔ اگر آپ نے ایک انسان کی بہتی ہوئی آنکھ سے آنسو پونچھے تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے عالم انسانیت کی آنکھوں سے آنسو روک لیے اور اگر ایک انسان کے زخم پر پھاہا رکھا تو گویا آپ نے عالم انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھا۔ ایک انسان اور ایک حیوان میں فرق کیا ہے۔ ایک حیوان اگر دوسرے حیوان کے چارے کی طرف گردن موڑتا ہے تو وہ اُسے سینگ مارتا ہے اور زخمی ہونے پر، خون بہنے پر ایک درندہ دوسرے درندے سے لاتعلق رہتا ہے مگر انسان کا معاملہ دوسرا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت و عبودیت کے لیے ان گنت اور لاتعداد فرشتے ہمہ وقت مشغول و مصروف رہتے ہیں مگر ؂

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

کیا خیال ہے آپ کا پھر ـــــ چلو یوں ہی کر لیں؟

☆☆☆

متوالا اللہ والا

پتھر میں احساس جگانا سب کے بس کی بات نہیں
کاٹ کے جوئے شیر کا لانا سب کے بس کی بات نہیں
(عزیز بگھروی)


متوالا اللہ والا

سولہویں صدی عیسوی یعنی سن ۱۵۳۰ء سے سن ۱۵۹۹ء کے درمیان ستھر سال تک پورے مہاراشٹر میں مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ تھا۔اس دوران عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتیں مہاراشٹر پر راج کرتی تھیں ۔ اُن دونوں خاندانوں کی حکومتوں میں ہندوؤں کو درباروں میں اونچے عہدے دیے گئے تھے۔ برہان نظام شاہ نے اپنی حکومت کے دوران کنورسین نامی ایک برہمن کو اپنا وزیر اعظم بنایا تھا جس سے ہندوؤں کی عزت درباروں میں کافی بڑھ گئی تھی ۔ حکومت کسی کی بھی چاہیے ہندو، مسلمان، سکھ یا انگریز کی ہو عوام الناس کسی نہ کسی صورت میں استحصال کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے ہی وطن کی مثال کو سامنے رکھ کر دیکھیے ۔ حکومت مغلوں کی، افغانیوں، سکھوں یا ڈوگروں کی رہی، ہر وقت، ہر دور میں عوام عتاب کے ہی شکار رہے ۔ وادی کے مسلمانوں پر بیگاری کی لعنت اگر چہ سکھوں اور ڈوگروں نے مسلط کر دی تھی تو عوامی اور جمہوری راج میں عوامی حکومت نے ہم سے کیا لحاظ برتا ۔ سابقہ صدی کی آخری دہائی میں بقول محترم انجینئر صاحب ’’کانوائے ڈیوٹی‘‘ کے لیے ہانکا لگانے والوں نے اُس وقت مجموعی طور پر انسانیت اور ہمارے عزتِ نفس کی مٹی پلید کی جب پورا ایک ضلع انسانی ڈھال کے طور پر کام کرتا تھا جس میں مستورات بھی شامل ہوتی تھیں۔ ہاتھ میں ڈنڈا لے کر پوشیدہ بم یا مائن کی تلاش اور مخالف سمت سے آنے ولی گولی کی ڈھال کے طور پر اُمتِ مسلمہ کی ایک مستور، ایک صنفِ نازک رات کے اندھیروں میں ڈیوٹی دیا کرتی تھی ۔ کتنا بھونڈا انداق تھا وہ ہماری زندگیوں کے ساتھ، ہمارے عزتِ نفس کے ساتھ ہم کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ وہی صورت حال اب بھی ہے ۔ سارے ہندوستان میں بشمول ریاست انسانی شکار جاری ہے۔

تو بات مہاراشٹر کی ہو رہی تھی۔ جس زمانے کا ذکر ہو رہا ہے اُن دنوں عام طور پر حکمران طبقہ عوام پر ہونے والے مظالم کے ذمہ دار نہیں ہوتے تھے۔ عوام کو ایذا دینا یا اُن پر ظلم و جبر روا رکھنا حکمران طبقے کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا تھا۔ جب کہ جبر وقہر اور ظلم زیادتی ریاستوں کے صوبے دار یا منصب دار عوام پر روا رکھتے تھے اور اپنے حقوق کا نا جائز اور من مانا استعمال کرتے تھے۔ نظام شاہی حکومت میں ہندو عوام کو ایسی کوئی شکایت نہیں تھی اور پھر جب ہندو سرداروں اور صوبے داروں کو حکومت میں شامل کرلیا گیا تو رہی سہی شکایت بھی جاتی رہی۔ گویا کہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کا وہ دور مہاراشٹر کے لیے ایک خوشحال اور امن و آشتی کا دور تھا۔

عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں میں صوفیوں اور فقیروں کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ بہت سے ہندو بھی اُن مسلمان صوفیوں اور فقیروں کے مُرید ہو کر اُن کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ درگاہ و مسجد میں جانا، عید، معراج و میلاد کے تہواروں میں حصہ لینا وہاں کے ہندوؤں کا خاص شغل مانا جاتا تھا۔ کہتے ہیں ایک ملنگ شاہ پیر کی دُعا سے شیواجی مرہٹہ کے والد کی پیدائش ہوئی تھی اِسی لیے اُس کا نام شاہ جی رکھا گیا تھا۔ بزرگوں، صوفیوں اور فقیروں کی خدا پرستی کے اثرات کے نتیجے میں الوپنشد (اللہ کی حمد میں لکھی گئی کتاب) اُسی زمانے میں لکھا گیا۔

ایسے الوہیت اور تمجید و تمہید کے دور سرمدی میں سنت ایکناتھ کے توحیدی نغمے بھی سارے مہاراشٹر اور مہاراشٹر سے باہر گونجنے لگے۔ سنت ایکناتھ مراٹھی زبان کے صوفی شاعر تھے مگر وہ برج بھاشا، دکنی، ہندی، گجراتی اور کنڑ زبانوں میں بھی خاص واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے ہندو سادھوؤں کے لیے برج بھاشا اور مسلمانوں کے لیے اُردو، فارسی اور عربی الفاظ سے بھرپور زبان میں اپنے خیالات

واحساسات لوگوں کے سامنے رکھے۔ وہ پیٹھن کے مقام پر ایک رگ ویدی برہمن کے گھر میں پیدا ہوئے مگر اُس کے باوجود وہ عبادت کے لیے مروجہ مورتیاں جمع کرنے سے دور دور ہی رہتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ بھگت یا عابد کو ظاہری عبادت کی بجائے قلبی عبادت کو ترجیح دینی چاہیے۔ دنیا میں جو کچھ ہے بس اللہ کے نام کے سِوا کچھ بھی نہیں ہے۔

نام اللہ کا کتھا سُنتے کوں

کام کوتا کسبن کا، دن رات جاگتا ہے

اس دنیا میں آیا، بندہ، اللہ نام سودا

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا نام عظیم ترین ہے۔ رات اور دن میں ایک بندے کا کام بجز یادِالٰہی کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

سنت ایکناتھ نے عوام کو انسانیت کا درس دے کر انسانی زندگی اور فکر کو ایک نیا رُخ دے دیا۔ وہ دھرم و مذہب کے نام پر تفریق کرنے والوں کو خوب لتاڑتے تھے اور ہریجنوں کی دعوت پر اُن کے پاس جا کر کھانا کھانا اور برہنموں کے منع کرنے کے باوجود ہریجنوں کو کھانا کھلانا اُن کے انسان دوستی کے ثبوت ہیں۔ سنت جی کا سماجی برابری مساوات کا نقطہ نظر صرف ادب کی تخلیق واشاعت کی حد تک محدود نہیں تھا۔ حقیقی زندگی میں بھی وہ ذات پات کے قائل نہیں تھے۔ اُن کے خیال میں خدا انسانوں میں ہی نہیں بلکہ ہر جاندار میں موجود رہتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں کو سلجھانے کے لیے انہوں نے مراٹھی اور ہندی میں خوبصورت ڈرامائی ادب کی تخلیق کی جس کا نام انہوں نے ہندو تُرک سمواد (ہندو مسلم مکالمہ) رکھا۔ اُس ڈرامے میں ہندو اور مسلمان آپس میں الفاظ کے تیر ونشتر چلا کر خوب جھگڑا کر کے آخر میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُن کا جھگڑا بالکل

کھوکھلا اور بے بنیاد ہے۔ اس لیے اشتعال انگیزی اور کج فہمی کی بجائے صحیح سوچ کی عمل آوری اور یگانگت کے ساتھ سماجی ہم آہنگی اور بھائی چارے میں ہر فریق کے لیے کامیابی اور کامرانی ہے۔

سنت ایکناتھ کی نظر میں خودی کو پہچاننے کا سب سے سیدھا اور آسان طریقہ عبادت ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ عابد سے زیادہ خدا کو کون پیارا ہوسکتا ہے۔ وہ اس مایاوی جگت سے نکل کر دائمی مسرت یا نجات پانے کے لیے عمل، علم اور عبادت کو ضروری خیال کرتے تھے۔ انہوں نے عبادت کے لیے مسلمانوں کو اُن کی زبان میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں

بسم اللہ ہے بسم اللہ
کلمہ کہوں بسم اللہ
ہے کون ایسا مُرشد مولا
گھر مو خدا بتاوے گا
من مقامے مجھے بٹھا کر
بسم اللہ کلمہ پڑھا دے گا
بسم اللہ ہے بسم اللہ
کلمہ کہوں بسم اللہ

مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کام کی شروعات اللہ کے نام سے ہو۔ اُس کے سِوا کوئی بات دُہرانے کے لائق نہیں ہے۔ دنیا میں ذات پاک اللہ سے بڑھ کر کوئی آقا و سردار نہیں ہے۔ اس لیے اللہ کو دل میں بٹھا کر ہمیشہ اُسی کا کلمہ پڑھتے رہنا، اُسی کا ذکر کرتے رہنے میں کامیابی ہے۔

سنت ایکناتھ کہتے تھے کہ ہر مذہب والا اپنے اپنے ڈھنگ سے عبادت کرتا

رہے مگر بہر صورت ظاہری عبادت سے قلبی یادِ الٰہی ہی بہتر ہے۔ وہ کہتے تھے ۔

حضرت مولا مولا

سب دنیا کا پالن والا

دنیا کا پالن ہار اور مولا بس صرف حضرت اللہ ہی ہے۔

سنت جی تیاگ یعنی فقر پر زور دیتے تھے۔ ایسا تیاگ جس میں اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا ایک ہو جائے اور اُس میں کسی قسم کی ریا کاری نہ ہو۔ اُن کا خیال تھا کہ کیا بھی کرو، کیسے بھی رہو مگر آخر کو یہ دنیاوی زندگی چھوڑ دینی ہے، پھر جو لیکھا جو کھا ہو گا وہ اُسی اکیلے بھگت یعنی عابد کو خود ہی بھُگتنا ہے، اس لیے ۔

اندر بھگوا کیوری بابا

جوگ جگوت بھر پائی

اللہ کوں نام پو لگن لگائی

مطلب یہ آپ دنیا داری میں رہیں یا دنیا تیاگ دیں بس ہر دم اللہ سے ہی لگن لگائے رکھنے میں بھلائی ہے۔ ان دو باتوں کے علاوہ وہ فضول خرچی، ریا کاری اور دکھاوے کی بجائے، قناعت، کفایت شعاری کے ساتھ ساتھ صبر و شکر کی بھی تلقین کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا ۔

اللہ رکھے وسا ہی رہنا

مولا رکھے وسا ہی رہنا

کون دن سر پر چھتر اُڑاوے

کون دن سر پر گھڑا چڑھاوے

کون دن ترنگ اپر چھڑاوے

کوئی دن پاوسے کھاسا چلاوے

اللہ ــــــــــ اللہ ــــــــــ اللہ

مطلب یہ کہ دنیا میں ہمیں اللہ جس حالت میں رکھے اُس پر صبر و شکر کرنا۔ دنیا کے اُتار چڑھاؤ میں وہ کبھی تمہارے سر پر عزت والا سایہ کرے گا۔ کبھی میت کی سامگری اُٹھوائے گا۔ کبھی عیش و عشرت اور اعلیٰ کھان پان عطا کرے گا جب کہ کبھی غم و اندوہ سے بھی دوچار کرے گا۔ ہر صورت میں صبر و شکر ہی مناسب ہے۔

رہے نام اللہ کا



حواشی

۱۔ ایکناتھی بارُوڑ

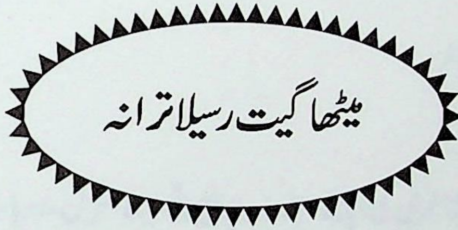
۲۔ قلندر فقیر ایکناتھی

بارُوڈ: مراٹھی شاعری کی ایک صنف ہے جیسے قصیدہ، غزل، دوہا، ماہیہ وغیرہ

میٹھا گیت رسیلا ترانہ

خدا کے واسطے مجھ کو منسٹری دے دو
کہ بچپن سے میرا مزاج لیڈرانہ ہے
(مجید لاہوری)




میٹھا گیت رسیلا ترانہ

اس بات میں ہرگز دو رائے نہیں ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے دوران ہندوستان کی تحریک آزادی اپنے پورے شباب پر تھی۔ اُس دور کو زیادہ مؤثر، زیادہ انقلابی اور زیادہ جذباتی ہونے کی خاص وجوہات تھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ لگی آگ میں انگریز حکومت کی طرف سے ایک نئے ایکٹ کے نفاذ، جلیانوالہ باغ کا المناک واقعہ یا عرف عام میں قتل و غارت گری، خلافت کمیٹی کی تشکیل، اجلاس اور کانگریس کا خلافت کمیٹی کو تعاون، عوام کی جانب سے سرکاری سکولوں کا بائیکاٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کاشی ودیا پیٹھ کی بنیاد، کھادی تحریک اور علی برادراں کی گرفتاری، سول نافرمانی کی تحریک اور گاندھی جی کی گرفتاری، جیل اور چھ سال کی قید، ترکی میں مصطفےٰ کمال کا اقتدار پر قبضہ اور خلیفہ کے سیاسی اقتدار و تخت خلافت کا خاتمہ وغیرہ ہم کئی واقعات و معاملات نے جلتی پر تیل کا کام کیا، تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ یہ اور ایسے دوسرے واقعات بذات خود ایسے تھے، جن کا پورے ملک پر بے حد جذباتی اثر پڑا اور ہندوستانی عوام کے دلوں میں انگریز کی نفرت زیادہ شدت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ملک کے سبھی طبقوں خاص طور پر ہندو اور مسلمانوں نے دل و جان سے ایک ہو کر اور قدم سے قدم ملا کر، اور قابض انگریزوں کے ظلم و ستم کے خلاف مکمل جامعیت کے ساتھ آواز اٹھائی۔ اس جدو جہد میں انہوں نے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں، اذیتیں برداشت کیں اور ملک کو غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا دلانے کی بھر پور مہم چلائی۔ اُس دور میں ہندو مسلم اتحاد و اتفاق اور بھائی چارہ اپنے انتہائی عروج پر تھا اور وہ زمانہ قومی یک جہتی کا ایک بے مثال نمونہ پیش کر رہا تھا۔ اُس کے بعد ہندوستان کی فضاؤں نے ویسے میٹھے منظر کبھی نہیں

دیکھے۔ ایسے حالات میں اُردو زبان کے اُدباء اور شعراء بھلا کیسے پیچھے رہتے یا نچلے بیٹھتے۔ انہوں نے پوری دلجمعی اور جوش و ولولہ کے ساتھ عوام کے جذبات کی عکاسی مختلف اصنافِ سخن کے ذریعے سے کی اور عوام کے دل کی دھڑکنوں کو نثری اور شعری جامہ پہنا کر انقلاب آفرین نغمات اور آزادی کے ترانے دیے۔ ولولہ انگیز جوشیلی تحریروں کو منظر عام پر لا کر ایک عام ہندوستانی کو بھی تحریک آزادی اور حصول حریت کے ساتھ باقاعدہ اور عملی طور پر جوڑ دیا۔

جدید غزل کے امام شاد عظیم آبادی کے ایک شاگرد شاہ جھبّو تھے۔ جن کا اصل نام سید محمد حسن شاہ اور تخلص بسمل تھا۔ وہ سید آل حسن شاہ کے گھر بمقام خسرو پورہ پٹنہ بہار میں سن ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر صرف دو سال کی تھی کہ آپ کے والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور دریں حالات اُن کی پرورش اُن کے نانا سید شاہ مبارک حسین اور ماموں خان بہادر سید شاہ محی الدین عرف شاہ کمال رئیس اعظم آباد نے کی۔ آپ کے ننہالی رشتے میں تصوف کے علاوہ شاعری کا چرچا بھی عام تھا۔ آپ کے نانا اور ماموں بھی دونوں اچھے شاعر تھے اور دونوں وحید الہ آبادی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ بسملؔ کی پرورش اور ذہنی نشو و نما اُسی صوفیانہ، شاعرانہ اور علمی ماحول میں ہوئی۔ اس طرح سے اُن کو اعلیٰ خاندانی روایات کے ساتھ شاعری بھی ورثے میں ملی۔ آپ نے شاد عظیم آبادی کی شاگردی اختیار کی اور بسملؔ عظیم آبادی کے نام سے دنیائے شعر و سخن میں متعارف ہوئے۔

بسمل عظیم آبادی ایک تیز و طرار نوجوان، حساس اور جذباتی انسان تھے اور مادر وطن کے ایک سچے سپوت اور انقلابی فکر سے بھرپور شاعر تھے۔ مذکورہ حالات و واقعات سے بھلا وہ کیونکر متاثر نہ ہوتے۔ حالات نے اُن کے دل و دماغ پر ایک گہرا اثر ڈال دیا۔ خاص کر جلیانوالہ باغ میں انگریز کی عملائی ہوئی سفاکی اور

درندگی نے اُن کو ہلا کے رکھ دیا۔ اُن کے دل ودماغ میں انگریز کے خلاف نفرت شدید ترین ہوتی گئی اور مذکورہ دل ہلا دینے والے واقعے اور کھادی وخلافت کے درمیانی زمانے یعنی ۲۱۔۱۹۱۹ء میں انہوں نے ایک ایسی غزل تخلیق کی جس میں انہوں نے انگریز کی ظلم وزبردستی اور جوروستم سے تنگ آ کر انگریز کو کھلا چیلنج دیا اور اپنے وطن کے لیے سر کٹانے کی تمنا کا اظہار کیا۔ کہتے ہیں ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اے شہیدِ ملک وملت میں ترے اوپر نثار
لے تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
وقت آنے دیں دکھا دیں گے تجھے اے آسمان
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

بسمل عظیم آبادی کی گیارہ اشعار پر مشتمل یہ غزل منظرِ عام پر آتے ہی بے حد مقبول اور زبانِ زدعام ہوگئی، خصوصاً اس کا مطلع سرفروشی کی تمنا......ضرب المثل بن کر ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا۔ اکثر سیاسی جلسے جلوسوں میں یہ اشعار پڑھے جانے لگے۔ انگریز سرکار کو اپنے لیے اس غزل میں ہیٹی، چیلنج اور بغاوت کی بُو آنے لگی اس لیے غزل کے تخلیق کار کے لیے وارنٹ گرفتاری جاری کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں شاہ صاحب کو روپوش ہو جانا پڑا۔ چونکہ یہ غزل عوامی جذبات و احساسات کو حقیقی روپ میں پیش کرتی تھی۔ اس لیے انگریز کی قدغن جب اس پر لگی تو جلتی پر تیل کا کام ہوا۔ غزل کی شہرت عوامی سطح پر اور زیادہ بڑھی اور پھیلتی گئی۔ ہوتا یوں بھی ہے کہ کہ کسی تقریر میں جب مقرر کسی شعر کا حوالہ دیتا ہے تو مقرر و سامعین شاعر کے نام پر کم ہی توجہ دیتے ہیں جب کہ زیادہ دھیان شعر کے متن و

مطلب کی طرف ہی ہوتا ہے۔ یہی معاملہ اس غزل کے ساتھ بھی پیش آیا۔ بسمؔل عظیم آبادی کو بھول کر کسی نے اِسے حسرت موہانی کے ساتھ منسوب کیا تو کسی نے اوم پرکاش شرما سہارن پور کے ساتھ۔ لیکن اکثر و بیشتر لوگوں نے بلکہ مختلف اخبار و رسائل کے لیے مضامین نویس حضرات نے اسے رام پرساد بسمل شاہ جہاں پوری کے ساتھ جوڑ دیا۔ حالانکہ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اُردو میں نہیں بلکہ ہندی میں کویتا کہتے تھے۔ یہ بات اُن کی آتم کتھا (سوانح عمری) سے برملا ثابت ہو جاتی ہے۔ کافی دیر تک یہ بحث و مباحثہ چلنے کے بعد آخر میں شاد عظیم آبادی کے ایک اور شاگرد عطا کاکوی نے مکمل ثبوت و شواہد کے ساتھ اِس غزل کو بسمل عظیم آبادی کا ثابت کیا۔ انہوں نے ماہنامہ آجکل ستمبر ۱۹۷۸ء میں اُس کاغذ (رف) کی ایک فوٹو سٹیٹ کاپی بھی شایع کی جس پر اُستاد شاد عظیم آبادی نے سن ۱۹۲۱ء میں اصلاح دی تھی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اُس کاغذ کا اصلی مسودہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ مندرجہ ذیل محققین نے اپنی نگارشات کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ مذکورہ غزل بسمل عظیم آبادی ہی کی ہے۔

محقق	پرچہ/حوالہ
ڈاکٹر لطف حسین ادیبؔ	روشن بدایوں، جلد ۹ و ۱۹۸۶ء
سید شاہ مصطفےٰ جعفری	امانت، پھلواری شریف آزادی نمبر ۱۹۷۳ء
عطا کاکوی	آجکل، دہلی، ستمبر ۱۹۷۸ء
مالک رام	تحریر، دہلی، اکتوبر، ۱۹۷۸ء
ڈاکٹر کے کے شرما	امر اُجالا، بریلی، ۲۳/اپریل ۱۹۷۷ء
عرش ملسیانی	ہم ایک ہیں، دہلی ۱۹۷۷ء
ابو محمد شبلی	نیا دور، لکھنؤ، اپریل ۱۹۹۹ء

افسوس اُس وقت ہوا جب قومی اُردو کونسل کے بین الاقوامی اُردو ماہنامہ 'اُردو دُنیا' میں ادارے کی طرف سے دسمبر ۲۰۱۱ء کے شمارے میں یہ نوٹ آکر سارے محققین کا مذاق اڑایا گیا:

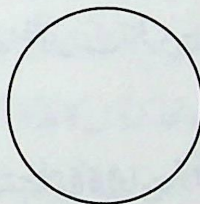
''شہید وطن پنڈت رام پرساد بسمل سے منسوب یہ غزل یا اس کے بعض اشعار اُردو کے محققین کی نظر میں کسی اور شاعر کی فکر کا نتیجہ ہو سکتے ہیں لیکن ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو بسملؔ اور اُن کے دوست اشفاق اللہ خان کی شہادت کے ۸۴ برس بعد بھی عام ہندوستانی ذہن جو زیادہ تر دل سے سوچتا ہے، یہ قبول کرنے کو تیار نہیں کہ یہ کسی اور کے شعر ہیں۔ یہ غزل رام پرساد بسمل کے نام پر ہی سجتی ہے۔ یہ ایسا ہی جیسا بہادر شاہ ظفر کی بعض متازعہ غزلوں سے مغلوں کے آخری تاجدار کی شخصیت کو الگ نہیں کیا جاسکتا''۔

اب جہاں سجنے کی بات ہے اُس کا جواب تو ادارہ ''اُردو دنیا'' ہی دے سکتا ہے۔ ہاں! سجنے کے لیے تو کچھ بھی سچ ہوسکتا ہے۔ اگر سجنے کی آڑ لے کر ہم گورنر بننے کا مطالبہ کریں تو کیا فرق پڑے گا۔ ہم میں کیا کمی ہے مگر ہم بخوبی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک مضحکہ خیز اور غیر دانشمندانہ موقف ہوگا۔ اس لیے ہمارے خیال میں یہ ویسی ہی بات ہوگئی کہ ؎

خدا کے واسطے مجھ کو منسٹری دے دو
کہ بچپن سے میرا مزاج لیڈرانہ ہے

(مجید لاہوریؔ)

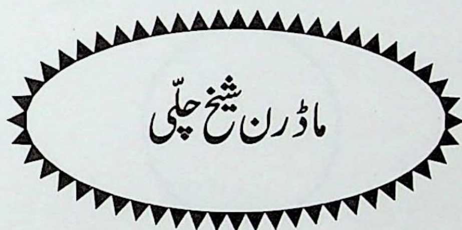
☆☆☆



ماڈرن شیخ چلّی

بس یہی دوڑ ہے اس دور کے انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے

(حفیظ میرٹھی)


ماڈرن شیخ چلّی

شیخ چلّی سے وابستہ کئی لطائف ہیں۔ یہ معلوم نہیں کہ اُن کا حقیقت کے ساتھ کوئی واسطہ ہے یا یونہی کسی نے لوگوں کو ہنسانے کے لیے ایک ہاسیہ ویَنگ کی تخلیق کی ہے۔ جو بھی ہو کچھ لطائف سے بہر حال سبق آموز باتیں بھی برآمد ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر کہتے ہیں کہ ایک بار شیخ چلّی درخت کی ایک شاخ پر بیٹھے اُسی شاخ کو کاٹ رہے تھے۔ ایک شخص وہاں سے گذرا اُس نے جو یہ کیفیت دیکھی تو اُس نے شیخ چلّی کو تنبیہ کی، اے نادان یہ کیا کر رہا ہے۔ شاخ کٹ جائے گی تو اُس کے ساتھ ہی تُو بھی زمین پر گر پڑے گا۔ ابھی وہ آدمی کچھ دور ہی گیا ہو گا، درخت کی شاخ کٹ گئی اور شیخ جی چاروں خانے چت ہو گئے۔ اُس کے بعد کیا ہوا اُس سے قطع نظر مجھے کہنا یہ ہے کہ اگر ہم اپنی طرف دیکھیں، اپنے طریقہ کار پر غور کریں، لگ بھگ ہم سے ہر ایک کسی نہ کسی صورت میں اسی صورت حال سے دوچار ہو کر اُسی شاخ کو کاٹ رہا ہے جس پر وہ بیٹھا ہے یا اُس درخت کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے جس پر اُس کا آشیانہ تھا یا جس کا اُس پر سایہ تھا۔

پہلی بات تو یہ ہوئی کہ ہم نے اپنی سونا اُگلتی زمینوں سے ناطہ توڑ لیا محنت مشقت اور کسانی کرنا چھوڑ دیا اور ہر ایک کی یہی کوشش رہی اور اس وقت بھی ہے کہ اُسے سرکاری نوکری ملے۔ اُس کو حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاتا ہے۔ بلکہ چند سکوں کی نوکری حاصل کرنے کے لیے اُس نے زمینوں کو ہی بیچ ڈالا۔ لڑکیاں اور بالیاں کھیتوں اور ساگ زاروں میں محنت کر کے اُن میں سے اپنی ضرورت کی سبزی ترکاری حاصل کرتی تھیں بلکہ روایتی انداز میں جاڑے کے لیے بھی سُکھا کر رکھتی تھیں۔ وہ بھی اُسی مایا جال میں آ کر نوکریوں کے پیچھے پڑ گئیں۔ آج ہر ایک سرکاری، نیم سرکاری یا پرائیوٹ ہسپتال، کلینک، ڈایا گونسٹک سینٹر،

فیکٹریاں شاپنگ مال، معمولی سالباس گھر حتیٰ کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ تک لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ترقی کی آڑ میں ہماری پیاری پیاری زمینیں ساگ زار اور فارم ہاؤس ہماری بے توجہی پر آنسو بہا رہے ہیں۔ اگر کسی جگہ کچھ زمینیں زیر کاشت رہ بھی گئی ہیں وہ ہم نے بہاری اور بنگالی مزدوروں کے ہاتھوں میں دے دیں ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُنہی مزدوروں کے پاس ہمارے سٹور اور دوکانوں کی چابیاں اور کہیں کہیں باغوں اور گھروں کے کنٹرول بھی ہیں۔ وہ کھیتوں میں بوائی، نلائی، کٹائی، چھٹائی وغیرہ خود کر کے اناج خود ہی سٹور کر لیتے ہیں۔

یہ اُن زمینوں کی بات تھی جو بچی رہیں۔ زیادہ تر ہماری سوچ یہی رہی کہ

بس یہی دوڑ ہے اس دور کے انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے

ہم نے ذرخیز زمینوں میں رہائشی مکانات، سکول، ٹرینگ کالج، نرسنگ ہوم اور کالونیاں بنائیں اور اپنی زنبیل پنجاب کے آگے پھیلا دی اور کافی عرصہ سے یہ عمل جاری ہے۔ ڈوگرہ دورِ حکومت کے دوران شہر سرینگر کے لوگ مختلف محنتی کاموں اور ہینڈی کرافٹس کے ساتھ وابستہ ہو کر عسرت بھری زندگی جیتے تھے۔ چونکہ اُن کے پاس زمینیں اور اناج پانے کے ذرایع نہیں ہوتے تھے اس لیے حکومت نے اُن کو راشن فراہم کرنے کے لیے اُن کو ایک راشن کارڈ اجرا کیا ہوتا تھا جس پر وہ ہر مہینے شالی، آٹا اور بعد میں چاول، آٹا، چینی اور مٹی کا تیل لیا کرتے تھے۔ مگر آج ہر گاؤں میں ہر گھر کے پاس راشن کارڈ ہے۔ گویا کسان نے اپنا چولہا بدل ڈالا۔ وہ اب دوسروں کو کھلانے والا نہیں رہا بلکہ ایک شہری باشندے کی طرح ''نان گار'' ہو گیا اور راشن کارڈ پر راشن حاصل کرنے لگا۔

کہتے ہیں کشمیر کے معروف صوفی بزرگ حضرت نورالدین نورانیؒ نے فرمایا

ہے کہ ’اَن پوشہِ تیلہِ ییلہِ وَن پوشہِ‘‘ یعنی کھیتی اور اناج کا دارومدار جنگل پر ہے۔ چونکہ گھنے جنگل ہونے سے کافی ساری برف پڑتی ہے اور بارش ہوتی ہے جس سے سال بھر پانی مہیا رہتا ہے اور کھیتی اور کاشتکاری کے لیے پانی کے بنا تصور ہی محال ہے اس لیے جب جنگل ہے تو پانی ہے، جب پانی ہے تو کھیت ہے، کاشتکاری ہے، زراعت ہے اور اناج کی فروانی ہے۔ یہ سب کہنے کی حاجت نہیں ہے۔ یہ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں مگر پھر بھی ہم چند سکوں، چند دنیاوی مفادات اور سہولیات کے لیے قوم کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ جنگلوں کا تو صفایا ہو ہی چکا، اب جو بچے کھچے پیڑوں کی رکھوالی کے لیے حکومت نے فارسٹ پروٹیکشن فورس قائم کیا تھا اُن پر بھی قوم کے یہ بے شرم لٹیرے جان لیوا حملہ کرتے ہیں۔ میں اُن سے پوچھنا چاہوں گا کیا پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ کیا ملک وقوم کی بقا اور انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، کیا انہوں نے بھوک کی تڑپ اور پیاس کی شدت کو کبھی محسوس کیا ہے۔

مصر میں اور مصر کے آس پاس یہود چونکہ سمندر کے نزدیک آباد تھے۔ شرح کے مطابق اُن کے لیے ہفتے کا دن سبت قرار دے کر اُن پر مچھلی کے شکار کی پابندی عائد تھی مگر اُلنگن اور نافرمانی چونکہ یہود کے رگ رگ میں رچی بسی ہے اس لیے سبت کے دن وہ دریا کے کناروں پر بھٹ اور بل بنایا کرتے تھے تا کہ جو مچھلی خود سے ہی اُن بلوں میں داخل ہو جائے اُس کو پکڑ کر کھاتے تھے اور بہانہ یہ کرتے تھے کہ انہوں نے اُس کا شکار نہیں کیا۔ چونکہ اس بات کے تواریخی ثبوت وشواہد وادی کے چپے چپے پر ثبت ہیں کہ یہود یہاں آئے ہیں، رہے ہیں اور اُن کی نسل بھی یہاں پروان چڑھی ہے۔ اُن کی زبان کے الفاظ ہماری زبان میں آج بھی مستعمل ہیں، اُن کے رسم ورواج آج بھی یہاں اصلی صورت میں مروج ہیں،

اس لیے اُن کے کچھ خصائل آج بھی یہاں کے خون کے کچھ حصے میں شامل ہونا ناگزیر ہے۔

رب العالمین نے بنی آدم پر فضل وکرم اور انعامات وعنایات کی بارش کی ہے۔ سب سے بڑی نعمت تو یہی ہے کہ اُس نے ہمیں زندگی دے کر اشرف المخلوقات بنایا ہے، کھانے پینے کی کئی چیزوں کی نعمتوں میں ایک نعمت ''لحم تریاً'' یعنی تازہ گوشت بھی عنایت فرمایا ہے۔قرآن کریم نے مچھلی کو تازہ گوشت کہا ہے اور سال میں ہم تین سو پچاس لاکھ کلو گوشت کے ساتھ مچھلی کے بھی کئی لاکھ کلو ڈکار جاتے ہیں۔مگر ہم کو اس میں آسودگی کہاں ملتی ہے۔جس طرح ہم راتوں رات امیر بننے کے خواب دیکھتے ہیں اسی طرح ہم کو کل کی کبھی فکر نہیں رہتی۔جھیلیں ہماری، دریا ہمارے، آبشار، نالے اور ندیاں ہماری مگر ہمیں کلو کے حساب سے نہیں بلکہ ٹنوں کے حساب سے مچھلیاں چاہیں کیونکہ ہمارا پیٹ بھان متی کا پٹارا ہو گیا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ ہے کہ ہم ندی، نالوں اور دیگر فِش ری سورسز میں زہریلی ادویات چھڑک ک ایک آن میں لاکھوں مچھلیوں کو مار ڈالتے ہیں۔مچھلی پکڑنے کے لیے اجازت نامہ (لائسنس) ہم حاصل کرتے نہیں۔اب اگر حرام کی ہی کھانی ہے، تو اُس کا کوئی قاعدہ طریقہ نہیں۔آخر ہم اتنے وحشی کیوں ہو گئے ہیں کہ ہم نے جنگل کے درندوں کو بھی مات دے دی۔

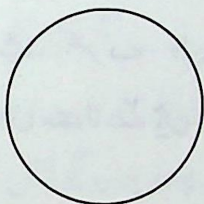
پچھلے دنوں ایک لڑکی بٹہ مالو کی ایک گلی میں رو رہی تھی، چیخ رہی تھی اور اپنا مُنہ پیٹ رہی تھی۔معلوم کرنے پر اُس نے بتایا کہ اُسے موبائل پر یہ پیغام ملا کہ اُسے ایک فون کمپنی کی طرف سے پچیس لاکھ روپے کی لاٹری ملی ہے۔اس لیے اُس پیٹے کو ٹرانسفر کرنے کے لیے فوراً پچیس ہزار روپیہ فلاں اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرے۔ قرض فرض کر کے اُس نے روپیہ اکٹھا کیا اور بینک میں جمع کر دیا۔حالانکہ بینک

کلرک نے اُسے خبردار کیا تھا کہ اگر لاٹری وغیرہ کا کوئی چکر ہے تو پھر سمجھو کہ پیسے گئے ،مگرلڑکی بڑی ڈھیٹ ثابت ہوئی ــــــــ بولی یہ پیسہ اُس کے ایک رشتہ دار کو الہ آباد میں چاہیے۔صرف ایک گھنٹے کے بعد جب لڑکی کو شاید کسی نے نیک مشورہ دے کر حقیقت حال سے آگاہ کیا ہوگا کہ اس طرح سے راتوں رات امیر نہیں بنا جا سکتا اور ایسے ہتھکنڈوں سے اب تک کشمیریوں سے کروڑوں روپیہ اینٹھا جا چکا ہے تو وہ پیسہ واپس لینے کے لیے بینک میں آئی ۔ پیسہ واپس مل بھی سکتا تھا مگر جب کمپیوٹر چیک کیا گیا تو پانے والے نے اُسے صرف پندرہ منٹ کے وقفے سے سارے کا سارا وِڈرا کیا تھا اور لڑکی بقول بابا بُلّھے شاہ

گڈی ٹُر گئی نی شوں کر کے
اُن کیوں رُونیے بصرے ول مُنہ کر کے

پتہ نہیں یہ لوگ اتنا پیسہ کہاں سے لاتے ہیں اور لاٹری کے نام پر دنیا کو مفت میں کھلاتے ہیں۔

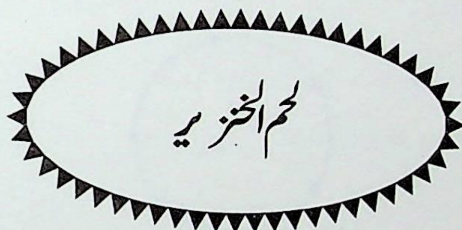




لحم الخنزیر

مگر مومنوں پر کُشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

(حالؔی)


لحم الخنزیر

قرآن کریم کے سورہ البقرہ آیت نمبر ۱۷۳ اور سورہ مائدہ آیت نمبر ۳ میں رب العالمین کی تنبیہ ہے کہ (لفظی ترجمہ)

''ہم نے تمہارے لیے خود مردہ، خون، سور کا گوشت اور وہ کچھ جو اللہ تعالیٰ کے نام کی بجائے کسی اور نام پر مشہور ہو جائے ہمیشہ کے لیے حرام ٹھہرایا ہے..........''

اِن آیات کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ سور کا نہ صرف گوشت بلکہ اُس کی کھال، کھُر اور بال کے ساتھ ساتھ کوئی بھی چھوٹی بڑی شے مطلقاً حرام ہے۔ محققین نے بتایا ہے کہ سور کی کوئی بھی چیز استعمال کرنے سے انسان میں بے شرمی و بے حیائی، جہالت و گستاخی کے علاوہ آزادانہ جنسی اختلاط کا رجحان بڑھ جاتا ہے اور کسی بھی سوچ و فکر کا سماج ہو یہ کیفیات اُس کی تباہی و بُربادی کا باعث بنتی ہیں۔

انگریز نے جب ہندوستان پر مکمل طور سے قبضہ جمایا تو اُس نے دیسی لوگوں کو بھی اپنی فوج میں بھرتی کرلیا۔ فوج کے استعمال میں بندوں کے کارتوس برطانیہ سے بن کر آتے تھے۔ چونکہ اُن کو سمندری راستے سے درآمد کیا جاتا تھا اور سفر میں خاصا وقت بھی صرف ہو جاتا تھا اُس وجہ سے سمندر کی نمی کی وجہ سے کارتوسوں کے اندر کا بارود متاثر ہو کر کارتوس قابل استعمال نہیں رہتے تھے۔ اس مسئلے کا سد باب کرنے کے لیے انگریز نے گولیوں پر سور کی چربی کا لیپ چڑھایا جس سے وہ خراب یا ناکارہ ہونے کی بجائے کافی وقت تک قابل استعمال رہتی تھیں کیونکہ سور کی چربی کافی دیر تک تر (Moisturised) رہتی ہے۔ کارتوس کو استعمال کرنے سے قبل اُس پر پڑی چربی کی پرت کو دانتوں سے توڑنا پڑتا تھا جو طریقہ فوج کو پہلے ہی سکھایا گیا تھا۔ مگر کسی طرح سے اس بات کا انکشاف ہوا کہ کارتوسوں پر سور کی

چربی چڑھائی جاتی ہے، بس پھر کیا تھا، یہ راز افشا ہوتے ہی سبزی خور ہندوؤں اور مجموعی طور پر مسلمان سپاہ نے اس بات پر احتجاج کیا اور ایسے کارتوس استعمال کرنے اور اُن کے ساتھ میدان میں لڑنے سے صاف انکار کر دیا جس کا آخر کار یہ نتیجہ نکلا کہ زور زبردستی کے باعث انگریز کے خلاف ملک گیر پیمانے پر بغاوت ہوئی جو بعد ازاں غدر ۱۸۵۷ء یا ہندوستان کی ناکام جنگِ آزادی کے نام سے تاریخ کے صفحات پر رقم ہوگئی۔ جس میں مجموعی طور پر مسلمان ہی تباہ و بُرباد ہو گئے۔ مسلمانوں کا راج تاج بھی گیا، بادشاہ نے بڑی بُری حالت میں دیارِ غیر میں سِسک سِسک کر دم توڑ دیا۔ شہزادوں کے سر کاٹ کر اور طشتریوں میں سجا کر بادشاہِ بے یار و مددگار کو تحفے میں پیش کیے گئے۔ مسلمان مارے کتنے گئے اُن کا کوئی حساب وشمار ہی نہیں ہے۔ خالی ستائیس ہزار نفوس کو پھانسی دی گئی اور شام کا رئیس صبح کو سڑک پر ننگ دھڑنگ پھرتا دیکھا گیا۔

سور کی چربی کے استعمال کا سلسلہ اُس کے بعد بھی برابر جاری رہا۔ چونکہ یہود مسلمان کا ایک ازلی اور بدترین دشمن ہے اس لیے اُس نے مسلمانوں میں ایمانی خلل ڈال کر بے حیائی و بے شرمی، جہالت و گستاخی کے ساتھ آزادانہ جنسی اختلاط و بے راہ روی پیدا کرنے کے لیے تمام یورپی کمپنیوں جن میں مختلف قسم کی اشیاء تیار ہوتی ہیں اور جن کے مالک خود یہود ہیں، میں حیوانی چربی کا استعمال جاری رکھا۔ چونکہ اُن کمپنیوں کا مال بشمولِ کاسمیٹکس، کریم، پوڈر، صابن، ٹوتھ پیسٹ بسکٹ، چاکلیٹ، مشروب، جوس، کارن فلیکس، ڈبہ بند جام، پنیر وغیرہ وغیرہ تقریباً نوے فی صد مسلم ممالک میں جاتا تھا اور وہ بھی لاعلمی میں ہر ایک چیز بڑی رغبت سے استعمال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اس بات کو محسوس کیا گیا (دراصل اللہ رب العزت ہی کرم پر آیا، وہ اپنے نام لیوا بندوں کو ناپاک نہیں کھلانا چاہتا تھا) کہ

اُن صنعت کاروں سے پوچھا جائے کہ وہ کس جانور کی چربی مذکورہ اشیاء میں استعمال کرتے ہیں۔ جواباً انہوں نے گائے اور بھیڑ بکری کی چربی استعمال کرنے کی بابت بتایا۔ مگر سنجیدہ لوگ اس تذبذب میں پڑ گئے کہ اگر جواب درست بھی مان لیا جائے تب بھی وہ جانور اسلامی طریقے سے ذبح نہیں ہوتے ہوں گے۔ اس بات کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ چربی مسلمان ممالک سے درآمد کی جاتی ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے تمام مال کو حرام جان کر اس کی درآمد روک دی گئی۔ مال بنانے والی کمپنیوں کے خریدار تو خاص طور پر مسلمان ممالک ہی تھے اور یہ مال مسلمانوں کو ہی ملوث کرنے کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ اس لیے ایسی تمام کمپنیوں کو لگ بھگ اسی فی صد سالانہ خسارے سے دوچار ہونا پڑا۔

خسارے سے محفوظ رہنے، اپنے مال کی سپلائی دوبارہ بحال کرنے اور مسلم سماج کو متواتر حرام کے گڈھوں کی طرف دھکیلنے کے لیے انہوں نے ایک نیا پینترا بدلا۔ سور کی چربی کا استعمال مختلف اشیاء میں بدستور برقرار رکھا مگر ڈبے یا ریپر پر حیوانی چربی (Animal fat) لکھنے کی بجائے انہوں نے خفیہ الفاظ یا خفیہ زبان (Codel Language) کا استعمال کرنا شروع کیا جو اُن کمپنیوں کے خاص کارکنوں کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں تھا، کہ مجوزہ یا استعمال شدہ نمبرات کا کیا مطلب ہے۔ مثال کے طور پر ہم کسی چیز کے ڈبے یا ریپر پر E-503 لکھا ہوا دیکھتے ہیں، بنانے والے لوگوں کو معلوم ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے جب کہ صارف اس کوڈ ورڈ یا نمبر کا کوئی خاص اثر نہیں لیتا ہے کیونکہ اُس کے لیے یہ چیز ایک بے معنی بات ہے۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں ہوتا کہ ڈبے پر دیا ہوا نمبر ایک فریب ہے۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ اللہ رب العزت کو دراصل اپنے مومن بندوں کا اس ناپاک سامگری سے دور رکھ کر ناپاکی اور گندگی سے بچانا تھا اس لیے بیروت

کے ایک پروفیسر امجد صغر نے مکمل تحقیق کر کے دنیائے اسلام کے سامنے اپنی رپورٹ رکھی۔ یہ رپورٹ حکومت متحدہ عرب امارات نے کچھ عرصہ ہوا شایع کی تھی۔ پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے محقق ڈاکٹر محسن رضا صاحب نے اُس رپورٹ کولاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''الحق' میں اگست ۱۹۹۲ء میں شایع کیا۔ پروفیسر صاحب کے کہنے کے مطابق پگ (Pig) ہاگ (Hog) سوائن (Swine) خنزیز کو ہی کہتے ہیں۔ پورک (Pork)، ہیم (Ham)، بیکن (Bacon) سور کے گوشت کو کہتے ہیں۔ سپورکل اور نمکین پورکر بھی خنزیر کے گوشت کے نام ہیں۔ لارڈ (Lard) سور کی چربی کو کہتے ہیں۔ جلاٹین، جلوٹین یا جیٹو ایک سیال مادہ ہے جس میں سور کی کھال، کھُر اور ہڈیوں کو شامل کیا جاتا ہے۔ اس لیے جن چیزوں کی ترکیب میں یا جن چیزوں کے اجزاء (Ingredeints) ایسے ہوں یا جن اشیاء کے بنانے میں ایسے الفاظ شامل ہوں، ماں لینا چاہیے کہ اُن میں سور کا گوشت، سور کی چربی یا سور کے جسم کا کوئی اور جُز شامل ہے۔

پیپسین ایک دوا ہے جس میں سور کا خون شامل ہوتا ہے۔ ایل شارٹنگ یا اینمل شارٹنگ ایک تیل ہے جس میں عام طور پر کھانا پکایا جاتا ہے۔ اُس تیل میں زیادہ تر سور کی چربی شامل ہوتی ہے۔ اشیائے خوردنی میں مندرجہ ذیل کو خریدتے وقت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان میں عام طور سے سور کے جسم کے مختلف اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ پرنس چاکلیٹ، کریفٹ چیز، رے مارک چیز وغیرہ عام طور پر یہ چیزین بنانے والی کمپنیاں ایسے پنیر سور کے دودھ پیتے بچے کے معدے سے بناتے ہیں۔ یا بہ الفاظ دیگر ایسے پنیروں میں وہ شامل ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بنے ہوئے زیادہ تر بسکٹ، کیک اور روٹیاں (Loas) سور کی چربی سے تیار کی جاتی ہیں۔ پیپسی کولا (Pepsi) مشروب میں پیپسین ملائی جاتی

ہے جس میں سور کا خون شامل ہوتا ہے۔

پروفیسر صاحب کا مزید فرمانا ہے کہ مندرجہ ذیل اشیاء میں لارڈ یعنی سور کی چربی شامل ہوتی ہے۔ لکس سوپ (Lux soap)، کیپری سوپ (Capri soap) برل کریم (Bryl cream)، ایوری سوپ (Avery soap)، کرافٹ چیز (Craft cheese)، رے مارک چیز (Ramark Cheese) پرنس چاکلیٹ (Prince Chocalete) مزید برآں بالوں کے کریم، کولگیٹ ٹوتھ پیسٹ، پامولیو ٹوتھ پیسٹ میں بھی سور کی چربی شامل ہوتی ہے۔ تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ انسانی جسم پر سوائے سور کی چربی کے ہر طرح کی اور جانور کی چربی پگل جاتی ہے، بہہ جاتی ہے یا خشک ہو جاتی ہے مگر صرف ایک سور کی چربی ہے جو انسانی جسم پر پگل جاتی ہے اور نہ خشک ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے عورتوں کے لپ اسٹک میں سور کی چربی ملائی جاتی ہے تاکہ ہونٹوں کا رنگ دیر تک نم اور تازہ رہے۔

کاسمٹکس کا سامان بنانے میں سور کی چربی کے علاوہ اسقاط حمل (Abortion) کے ذریعے ضایع کیے جانے والے بچوں کی ہڈیوں سے حاصل شدہ کیمیائی مرکب استعمال کیا جاتا ہے جس کا انکشاف فرانس کی ایک مشہور کمپنی کا سمٹکس کی گاڑی کے تلاشی کے دوران ہوا۔ گاڑی میں کئی مردہ بچوں کے اجسام پائے گئے اور بعد میں کمپنی کے ارباب اختیار سے تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد اس راز سے پردہ اُٹھا کہ ان اجسام کو مختلف قسم کے چہرے پر لگانے والی کریموں (Face Creams) میں استعمال کیا جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب کا کہنا ہے کہ ریسرچ کے دوران یہ بھی پتہ چلا ہے کہ مغربی معاشرہ میں لوگ سینکڑوں بیماریوں کے شکار فقط خنزیر سے متعلق مختلف اشیاء کے استعمال سے ہوئے یا ہوتے ہیں جن میں جلد کی بیماریاں، الرجی، سوزش، جلد کا

وقت سے پہلے لٹک جانا وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں اور جنسی حیوانگی سوا الگ۔ یہ یا اس طرح اور اس کے علاوہ مزید خطرناک بیماریاں اُن کاسمٹکس سے لگ جاتی ہیں جن میں سور کی چربی وغیرہ شامل ہوتی ہے۔ سور سے متعلق اشیاء کے استعمال والی چیزیں جیسا کہ آگے بتایا گیا زیادہ تر وہ کمپنیاں بناتی ہیں جن کے مالکان یہودی ہیں۔ یہ یہودی نہ صرف جان بوجھ کر دنیائے اسلام میں ایسی چیزیں پھیلاتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی کردا کشی ہو جائے بلکہ وہ اس طرح سے اسرائیل کی بھی کھلم کھلا مدد کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی آمدنی کا ایک مخصوص حصہ اسرائیل کے لیے الگ سے نکال کر رکھتے ہیں۔

(۲)

ابھی حال ہی کی ایک رپورٹ جو مسلمانانِ عالم کی آنکھوں پر پڑا غفلت کا پردہ ہٹانے کے لیے شاید کار آمد ثابت ہوسکتی ہے، میں اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ مسلمان روزانہ اسرائیل کو چھیانوے لاکھ ڈالر یعنی باون کروڑ اسی لاکھ روپے کی مدد کر رہے ہیں اور اس طرح اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے قتلِ ناحق میں ملوث ہو رہے ہیں۔

چالیس کروڑ مسلمان یہودی کمپنیوں کی بنائی ہوئی چیزیں خاص طور پر سگریٹ، کوکا کولا اور مختلف فوڈ آئیٹمز روزانہ استعمال کر کے اسرائیل کی مدد اس طرح سے کر رہے ہیں کہ یہ کمپنیاں اپنے منافع کا دس فیصد حصہ اسرائیل کی تخریب کار تیاریوں کے لیے دے دیتی ہیں۔ اس طرح سے مسلمانوں سے ہی دوسرے مسلمانوں کا خاص طور سے عرب ورلڈ میں قتل عام ہو رہا ہے۔ امریکی سی آئی اے کے انکشاف کے مطابق فلپس موریس اور کوکا کولا دو کمپنیاں سگریٹ اور مشروبات بناتی ہیں جو

مسلمان ممالک کے لگ بھگ چالیس کروڑ مسلمان استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح سے روزانہ آٹھ سو ملین ڈالر یعنی چوالیس ارب روپیہ فلپس مورس کمپنی کو جاتے ہیں۔ جس میں کمپنی کو اوسطاً دس فی صد منافع ہوتا ہے اور اُس میں سے یعنی کل منافع کے بارہ فیصد کے حساب سے ۹.۶ ملین ڈالر یعنی باون کروڑ اسی لاکھ روپیہ روزانہ مسلمان سگریٹ نوشی کر کے اسرائیل کو ادا کر رہے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق کولڈ ڈرنک تیار کرنے والی سب سے بڑی کمپنی کوکا کولا سن ۱۹۹۶ء سے اسرائیل کی ایک بہت بڑی معاون کمپنی ہے اور اسرائیل کو مدد پہنچا رہی ہے۔ دنیا کی دوسری بڑی ملٹی نیشنل کمپنی ''میک ڈونالڈ'' ہے جس کے دنیا میں ایک سو بیس سے زائد ملکوں میں لگ بھگ تیس ہزار ریسٹورنٹ قائم ہیں۔ یہ کمپنی اسرائیل کو مالی معاونت کرنے والا تیسرا بڑا ہاتھ ہے اور انہی کمپنیوں کی تیار کردہ اشیاء استعمال کر کے دانستہ یا نا دانستہ طور معصوم فلسطینیوں کے قتل عام میں دنیا بھر کے کروڑوں مسلمان شامل ہو جاتے ہیں۔ سارے ہندوستان میں میکڈونالڈ کے برگر ہر روز کتنے مسلمان نوشِ جاں کرتے ہیں، اس بارے میں کبھی آپ نے غور کیا ہے۔

گذشتہ سطور کے ساتھ سلسلہ جوڑتے ہوئے پھر پروفیسر صاحب کی رپورٹ کی طرف آتے ہیں۔ اُن کا مزید فرمانا ہے کہ مندرجہ ذیل اشیاء بھی یہودی ہی بناتے ہیں۔ اس لیے لازماً اُن اشیاء میں بھی سور کے جسم سے متعلق مختلف چیزیں شامل ہو سکتی ہیں۔ کوکا کولا، فنٹا، مرنڈا، سپرنٹ، سیون اپ، ببل اپ، ٹیم (Team)، لائف بوائے سوپ، ڈالڈا گھی، کلوزاپ ٹوتھ پیسٹ، باٹا شوز، کاسمٹکس کی کمپنی نیویا کے تیار کردہ کریم جیسے میڈورا، سوئیس مِس، میکس فیکٹر، ایولان، ایڈمرل، نیویا وغیرہ۔ ادویات تیار کرنے والی کمپنیاں مثلاً پارک ڈیوس (Park Davis) جی جی (Geigy) سیبا (ciba) روش (Roche) اور رینگلر للّی (wrangler lily) بھی

کچھ ادویات میں اِن چیزوں کا استعمال کرتی ہیں۔ کپڑے بنانے والی کمپنی ری میک (Remec) کی مصنوعات جیسے جرمن فوڈس، فوڈ سٹفس (Food Stuffs) برگرس (Burgers)، گانِنس بر (Ganens Burr) میکڈونالڈ (Mc-Donnels) وغیرہ وغیرہ خاصے مشہور ہیں۔ اس لیے مندرجہ بالا کمپنیوں کی چیزیں یا مذکورا شیاء خریدنا بذات خود اُس ملک کی مدد کرنے کے مترادف ہے جس کا نصب العین اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا ہے۔

لپ اسٹک کے بارے میں مکرر اس بات کی یاد دہانی کرتے چلیں کہ لپ اسٹک یورپ کے کسی ملک میں، ایشیاء کے کسی شہر میں یا کسی قصبے کی کسی گمنام گلی میں بنے اُس میں سور کی چربی ہونا لازمی ہے۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ سور کی چربی انسانی جسم پر جلدی نہیں پگھلتی جب کہ اُس کی نمی (Moisture) دیر تک ہونٹوں پر رہتی ہے۔ باقی تمام قسم کی چربی جسم پر جلدی ہی پگھل جاتی ہے یا سوکھ جاتی ہے۔

کچھ عرصہ قبل لکھنؤ کی ماحولیاتی، تحقیقاتی لیبارٹری سے وابستہ سائنس دان ڈاکٹر مکیش چند سکسینہ کے مطابق ہندوستان میں چاکلیٹ بنانے والی کمپنیاں چاکلیٹ میں میکلے (Mckle) جو ایک مُضر صحت پدارتھ ہے، کی اتنی مقدار استعمال کرتی ہیں کہ اُن کے کھانے سے بچوں کی صحت متاثر ہو جاتی ہے۔ اُس سے اُن کی نشو ونما رُک جاتی ہے اور اُن کی قوت مدافعت بھی بگڑ جاتی ہے۔ اس طرح سے اُن میں اور بیماریوں کا خطرہ تو رہتا ہی رہتا ہے مگر کینسر کا خطرہ زیادہ رہتا ہے۔ انڈین کنفکشنری مینوفیکچرس ایسوسی ایشن میں چاکلیٹ بنانے والی کمپنیوں کے تمام قسم کے چاکلیٹ بچوں کے لیے بے حد مُضر قرار دیے گئے ہیں۔ مگر پھر بھی ہم یہ زہر اپنے بچوں کو اپنی نیک کمائی سے خریدار کر کھلاتے رہتے ہیں

اور جب ہماری مائیں، بہنیں، بیویاں، بہوئیں اور بیٹیاں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے یا پڑھانے جاتی ہیں، دفتروں میں کام پر جاتی ہیں، یا فیلڈ میں ہسپتالوں میں اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے جاتی ہیں تو اُن میں سے بیشتر کے ہونٹوں پر لپ اسٹک کا ایک لیپ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اِسے ہم بھی دیکھتے ہیں بلکہ اکثر حالات میں ایسا ہماری نظروں کے سامنے ہی ہوتا ہے۔ مگر ہم ماشاء اللہ مومنین ہیں۔ ہمارے دین میں، ایمان میں اس سے تو کوئی خلل نہیں پڑتا ہے۔ پڑے گا بھی کیسے ہم پر خرمستی کرنے کے لیے بڑی کشادہ راہیں ہیں بقول مولانا حالی۔

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
ہمیشہ اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

اپنے شاندار ماضی اور اور اپنی رنگین روایات کو چھوڑ کر، اصل کو چھوڑ کر اور نقل کو گلے لگا کر، مادی ترقی کے سراب میں ہم نے امپورٹیٹ کلچر کو گلے لگا کر سب کچھ گنوا دیا۔

آخر پر ہم اُن کوڈ نمبرات کی فہرست دے دیتے ہیں جن کو روزمرہ کی مختلف اشیاء استعمال کرنے سے قبل جانچنا ضروری ہے۔ گر چہ اس کی کم ہی اُمید ہے کہ اب یہ کوڈ نمبر دیے جاتے ہوں گے یا نہیں تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہود نے کوئی دوسرا پینترا ضرور بدلا ہوگا۔

E-100,E-110,E-120,E-140,E-141,E-153-E-210,E-213

E-214, E-216,E-234,E-252,E-270,E-280,

E-322,E-325,E-326,E-327,E-334,E-335,E-336,E-337

E-422,E-430,E-431,E-432,E-433,E-334,E-435,E-436

E-440,E-470,E-471,E-472,E-473,E-474,E-475,E-476,E-477

E-478,E-481,E-482,E-483,E-491,E-492,E-493,E-494,E-495

E-503,E-542,E-570,E-572,E-631,E-635& E-904

چلتے چلتے اِس بات کو بھی گوش گذار کرتا چلوں کہ ای کوڈ نمبرات صرف ٹوتھ پیسٹ، شیونگ کریم، چیونگ گم، چاکلیٹ، مٹھائیاں بسکٹ، کارن فلیکس، ڈبہ بند غذائی میٹریل اور جیسیم وغیرہ تک ہی محدود نہیں بلکہ متعدد بین الاقوامی کمپنیاں خاص طور پر وہ جن کے چلانے والے یہود ہیں مذکورہ ناپاک چیزیں اور بھی اپنی بیشتر مصنوعات میں استعمال کرتی ہیں اور عوام الناس ہمیشہ لاعلم ہی رہتے ہیں۔ ہم ٹوسٹ پر جیم لگا رہے ہوتے ہیں یا ایک چاکلیٹ کا پیس چبا رہے ہوتے ہیں اب یہ کیسے تصور میں آئے گا کہ اس میں سور کی چربی ملی ہوئی ہے۔ عموماً لوگ لاعلمی میں بہت کچھ ڈکار جاتے ہیں۔ یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسی کیا مجبوری ہے جو قومِ یہود عالم انسانیت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں، اول یہ کہ یہود مسلمان کے ساتھ بے انتہا نفرت اور دشمنی رکھتے ہیں اور اُن کو ہر طریقے سے بدنام کرتے ہیں، بے عزت کرتے ہیں، اُن کی عزتِ نفس کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں اور اُن کی نسل کشی کے سامان کرتے ہیں اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہود دنیا میں صرف یہود کا دوست ہے۔ باقی دنیا کو مٹتے دیکھ کر وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اُسے بہتا ہوا خون دیکھنے پر بے حد خوشی ملتی ہے۔ جنگِ عظیم اول اور دوم میں کون سے مسلمان آگے نبرد آزما تھے۔ مورچہ سنبھالے تھے، پھر بھی اُس نے دونوں عظیم تباہیوں کی بنیاد ڈالی، وہ ہی جنگوں کے باعث بنے۔ جرمنی

کون سا مسلمان ملک تھا مگر وہاں بھی اُس نے ہٹلر کے ساتھ چھل کیا۔ یہود ہمیشہ آبادی کے تخفیف کے راستے سوچتا ہے۔ اِسی لیے مختلف تنظیمیں وجود میں آتی ہیں جو اپنی پوشیدہ سازشوں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر قوموں کی بھی بیخ کُنی کے سامان پیدا کرتی رہتی ہے۔ فلسطین کے مسلمانوں کی نسل کشی، مصر میں سابقہ ایام میں اخوان کا قتل عام، دو عالم گیر جنگوں کی بنیاد، مختلف ممالک افغانستان، عراق، کردستان، تیونس، مصر، لیبیا، شام، یمن، کمبوڈیا، فلپائن، سری لنکا، برما، کشمیر وغیرہ میں ہوئے یا ہو رہے جنگ و فسادات میں مسلمانو کے بے دریغ مالی و جانی نقصان کے پیچھے صرف اور صرف یہود کا ہاتھ ہوتا ہے۔ قرآن شریف کو نئے سرے سے صرف آٹھ پاروں میں لکھنے کی سازش کس نے کی یا کس نے اُس کو شایع کر کے بازار میں لایا۔ چار ہزر سے زائد اسلام مخالف کتابیں کس نے لکھیں۔ یہود دنیا کی وہ ذلیل ترین اور دھتکاری ہوئی قوم ہے جنہوں نے اللہ کے نبیوں علیہم السلام کو قتل، جلائے وطن کیا اور بدنامی تو معمولی بات، حضرت لوط علیہ السلام پر زنا (العیاذ باللہ) تک کے بھی الزام عائد کیے۔ میری بات کا اعتبار نہ آئے تو براہ کرم توراۃ ـــــ پیدائش ـــــ باب ۱۹ ـــــ آیات ۲۹ تا ۳۸ دیکھیے۔

پال فنڈلے کی کتاب They dare to speak out کے ناشر نے کتاب کے شروع میں اپنے اشاعتی نوٹ میں لکھا ہے:

> ''اِس کتاب کا مصنف پال فنڈلے امریکی سیاسی حلقے میں ایک معروف نام ہے۔ فنڈلے امریکی سیاست کا رازدان رہا ہے۔ اُس نے بہت قریب سے امریکہ کے ذریعہ موجودہ عالمی نظام پر یہودی تسلط کا مطالعہ کیا ہے۔ کتاب شایع تو ضرور ہوئی لیکن بہت کم لوگوں تک پہنچ سکی۔ خُفیہ یہودی تنظیموں نے راتوں رات اِسے بازار سے

غائب کردیا۔شاید ہی کسی قابلِ ذکر لائبریری میں اس کا نسخہ موجود ہو۔ گوکہ اس کتاب میں صرف امریکہ میں یہودی لابی کی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے البتہ یورپ کے دوسرے ممالک میں یہودی سرگرمیوں کا اندازہ بھی اس کتاب کی روشنی میں کسی قدر لگایا جاسکتا ہے۔صیہونیت کی سرگرمیوں پر (اُردو تو کیا) انگریزی زبان میں بہت زیادہ نہیں لکھا گیا۔بات یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے؟ کہ جو شخص بھی بیبا کی کا مظاہرہ کرتا ہے یہودیوں کی خفیہ تنظیمیں اُسے بڑی خاموشی اور حکمت کے ساتھ راستے سے ہٹادیتی ہیں‘‘۔

نوٹ ۱: مضمون میں مذکور اشیاء میں سے اب کافی ساری چزیں ٹوتھ پیسٹ، صابن، شیمپو وغیرہ انہی رجسٹرڈ ناموں کے ساتھ اربین گلف اور بھارت میں بھی بنتی ہیں۔(عرب میں تو سوال ہی نہیں) یقین ہے کہ اُن چیزوں میں حدث کی ملاوٹ نہیں ہوتی ہوگی۔تاہم احتیاط لازمی ہے۔مگر ملاوٹ نہ ہونے کی کوئی گارنٹی بھی نہیں ہے۔

نوٹ ۲:۔میں نے ذاتی طور پر اسی سال (۲۰۱۹ء) دو چیزوں میں اوپر دیے گئے نمبروں میں سے نمبر پائے۔ایک سکاٹ لینڈ کی تیار شدہ ایک فوڈ آئیٹم دوسرا ہندوستان میں بنے چاکلیٹ میں۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

☆☆☆

☆☆

☆

شہزادہ بسملؔ ریاست کے معتبر اور معروف کالم نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ادبی، سماجی اور سیاسی منظرنامے پر اپنے گہرے مشاہدے اور منفرد اسلوبِ بیان کے بل بوتے پر وہ زندگی آمیز تخلیقات پیش کرنے والوں میں اپنی [illegible] رکھتے ہیں۔ وہ اپنے کالموں میں زندگی کے تلخ حقائق، اقدار کی شکست و ر[illegible] [illegible] سے انسانیت کا رشتہ، سیاسی، سماجی اور مذہبی کشمکش کو بھرپور انداز میں پیش [illegible] نیز اپنے کالموں کے عنوان عام زندگی سے چُنتے ہیں اور آئے دن کے [illegible] تخلیقی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس وقت تک بسملؔ صاحب کی پانچ کتابیں [illegible] ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں. زیرِ نظر کتاب اُن کے منتخب کالموں کا مجموعہ ہے۔

شہزادہ بسملؔ نے سماج کا مطالعہ ایک نبض شناس کی نظر سے کیا ہے۔ انہوں نے اپنے کالموں کو نئی طرح دے کر ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے، جس کی روایت بہت کم رہی ہے۔ یہ متنوع موضوعات انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ چونکہ اُن کے پاس زندگی کے عملی تجربات اور مشاہدات کی کوئی کمی نہیں ہے، اس لیے اُن کی کالم نویسی میں بھی ایک خاص توانائی نظر آتی ہے۔ .... آپ انسانوں میں گھل مل کر اُن کے دکھ درد کا ادراک کرتے ہیں اور اُس کو طنز و مزاح کی چاشنی میں ڈبو کر اخبار کے صفحے پر پھیلا دیتے ہیں۔ ..... اُن کے کالموں میں شدتِ احساس پوری طرح جلوہ گر ہے۔ اپنے موضوعات اور اسالیب کی رنگا رنگی سے دبستانِ جموں و کشمیر میں شہزادہ بسملؔ اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔

سُہیل سالم